گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
فروری 2020

is not a breast milk substitute

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 15

سلسلے وار ناول

میرے لیے سارا رنگ اتار دو — افشاں آفریدی 24

میں عشق ہوں — نایاب جیلانی 120

مکمل ناول

بساط — ناہید سلطانہ اختر 222

ناولٹ

مراد — نسرین اختر نینا 160

صنم — صائمہ قریشی 185

منی ناول

انمول — سعدیہ رئیس 74

عورت کہانی

عورت عطر ہے — فرحین اظفر 206

افسانے

مکینِ دل آنگن — دانیہ آفرین 55

لاحاصل — رفعت شبانہ 65

معافی — ناہید فاطمہ حسنین 105

بہاریں چمکیں گی دنیا کی — شمع تفسیر 113

کیسی لاگی یاری — سیما بنتِ عاصم 145

اولاد، زینت اور امتحان — وردہ بخاری 153

کڑوا بادام — عائشہ خان 155

کیسی ذلت — قرۃ العین سکندر 181

خصوصی مضامین

بیادِ معراجِ رسول — ادارہ 18

شمعِ ہدایت — اختر شجاعت 254

پاکیزہ کے مہمان — شائستہ زریں 261

is not a breast milk substitute

مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ	16	منتخب غزلیں	ادارہ	294
گوشہ ظرافت	ادارہ	272	خوش ذائقہ	شگفتہ یاسمین	295
بہنوں کی محفل	مدیرہ	274	بزم پاکیزہ	پاکیزہ بہنیں	297
پاکیزہ ڈائری	عظمیٰ آفاق سعید	288	روحانی مشورے	ادارہ	299
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی	292	حسن نکھار آئیے	مہ جبیں	301

ہومیو کلینک 302

زندگی کبھی، کبھی انسان کو ایسے کربناک حادثے سے دوچار کر دیتی ہے کہ اس کا اپنی ذات اور اردگرد کے لوگوں پر سے اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جا سکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جا سکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی دے دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دارالعمل ہے جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا... مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے — زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے
خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرائی ہے — عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

سلسلے وار ناول

میرا سارا زنگ اتار دو

افشاں آفریدی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آکر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ عکرمہ آئی کیپ میں لیکچرر شپ اور icmap میں اوننگ کلاسز لینے لگتا ہے۔ درمکنون، سائرہ بچی کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھالی تھی۔ عکرمہ دادی سے کہتا ہے کہ چچا جان کو درمکنون کی تعلیم شروع کرادینی چاہیے۔ مظفر، عکرمہ سے درمکنون کو پڑھانے کا کہتے ہیں۔ ایک رات درمکنون کی طبیعت خراب ہونے پر دادی اسے سکون آور دوا دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ عکرمہ، زوہا، ردا اور درمکنون کو شاپنگ پر لے کر جاتا ہے تو زوہا بتاتی ہے کہ زارا (مظفر صاحب کی دوسرے نمبر کی بیٹی) کے ساتھ اس کی نند خولہ آرہی ہے اور شاید وہ دادی کو پسند ہے۔ درمکنون سوچتی ہے کہ کیا واقعی وہ اپنے آنسوؤں سے اپنے محسنوں کی خوشی کو دھندلا رہی ہے۔ اسٹڈی میں درمکنون کو دیکھ کر آنسو بہاتے مظفر شیرازی، عکرمہ کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی ول بنوائی تھی وہ لے کر عکرمہ نکلتا ہے تو زاویار کا شیری کے ساتھ رویہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ خولہ، عکرمہ کا لیپ ٹاپ لینے جاتی ہے تو درمکنون کو اس کی باتوں سے اپنے بدصورت رویے کا احساس ہوتا ہے۔ خولہ، درمکنون سے عکرمہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اگر آپ اس گھر میں بہو بن کر آئیں تو بہت خوش رہیں گی، اس جملے کو سن کر عکرمہ ایک انجانے سے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کو بھی شام کو گھر پر رہنے کا کہتی ہیں۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آجاتا ہے کہ اس نے صفدر صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آجاتا ہے (درمکنون کی تباہی کا ذمے دار) زاویار کو دیکھ کر درمکنون بے ہوش ہوجاتی ہے۔ مظفر صاحب، سائرہ بیگم سے کہتے ہیں کہ وہ اسے کمرے میں لے جائیں۔ درمکنون کے بے ہوش ہونے پر مظفر صاحب چراغ پا ہوجاتے ہیں اور سائرہ بیگم بھی یہ عہد کرتی ہیں کہ کم از کم ردا کی شادی تک وہ اس معاملے کو نہیں چھیڑیں گی۔ درمکنون سوچ رہی تھی کہ زاویار بنا کسی احساسِ جرم کے کس اطمینان سے نئی زندگی شروع کرنے جارہا ہے۔ شہرین، میمونہ بیگم کو زاویار کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہوجائے گا۔ جلال انصاری، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کرلیں۔ عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔ وہ شہرین کو اپنے دوسرے شوہر عثمان کے انتقال اور میمونہ کی شادی کا بتاتی ہیں اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔ شہریار انصاری، زاویار کو فون کرتے ہیں اور زاویار کے بدتمیزی سے جواب دینے پر فون بند کردیتے ہیں۔ میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہوجائے۔ زاویار تین سال پہلے کے اس منظر سے کسی طرح نکل نہیں پارہا تھا۔ زاویار، نازیہ سے کہتا ہے کہ وہ درمکنون سے ملنا چاہتا ہے تو نازیہ ہامی بھرلیتی ہیں۔ شیری، عاصمہ لاج پہنچتی ہے تو اسے زاویار کے ایکسیڈنٹ کا پتا چلتا ہے۔ وہ مولا بخش کے ساتھ ہی اسپتال جاتی ہے پھر زاویار کی حالت دیکھ کر خولہ کو فون کرکے بلاتی ہے تو زارا بھابی، اظہار بھائی اور خولہ کے ساتھ عکرمہ بھی اسپتال آتا ہے۔ عاصمہ، زاویار کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہوجاتی ہیں، رات تک میمونہ اور مہران بھی کراچی آگئے تھے۔ تین سال بعد آغا جان، زاویار کے سامنے تھے اور ان کے انداز بھی خاصے بدل گئے تھے، ان کے ساتھ شہریار اور عینی بھی تھے۔ آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گزرے دنوں کو بھول جاؤ اور اپنا دل صاف کرلو..... لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں اور خود سسٹر کو بلا کر باہر چلا جاتا ہے۔ شیری کھانا لے کر آتی ہے تو اس کو بتاتی ہے درمکنون، زارا بھابی کی کزن ہے اور وہ اس کے لیے ہاں کب کررہا ہے وہ اور عینی جا کر اسے زاویار کے نام سے چھیڑیں گی۔ جس پر زاویار غصہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس کے معاملات سے دور رہے اور کسی سے کچھ نہ کہے۔

اب آگے پڑھیے.....

قسط نمبر 14

صبح، صبح آسٹریلیا سے آنے والے فون نے دادی اور عکرمہ کے ساتھ، ساتھ بقیہ لوگوں کو بھی خاصا مایوس کیا۔ عبید اور ان کی فیملی ردا کی شادی پر نہیں آرہی تھی۔

"کم آن دادی؟ آپ کو پتا ہے ناں کہ عبید بھائی workaholic اپنے کام کے دھنی ہیں۔ اب دنیا اِدھر کی اُدھر ہوجائے وہ اپنا نیا ملنے والا پراجیکٹ کبھی ڈراپ نہیں کریں گے۔" عکرمہ نے دلگرفتہ بیٹھی دادی کو نرمی سے سمجھایا۔

"ارے یہ اس گھر کی دوسری شادی ہے جس میں وہ شرکت نہیں کررہا۔ غضب خدا کا..... کام کیا خاندان سے بڑھ کر ہوگیا ہے۔" دادی کا رنج کسی طرح کم نہیں ہورہا تھا۔

"ویسے دادی ایک بات بتائیں۔ آپ کو عبید بھائی کے نہ آنے کا دکھ زیادہ ہے یا ان کے لیے جو کپڑے بنوائے تھے ان کے بیکار جانے کا افسوس ہو رہا ہے آپ کو۔" سیف پاس بیٹھا PSP کھیل رہا تھا۔ مسکرا کر شرارت سے بولا تو دادی کے چہرے پر رنج پھیل گیا۔

"ارے بیٹا چراغ سحر ہیں ہم۔ اب بجھے کے تب۔ خواہش تھی کہ عبید اور اس کے بچوں کو دیکھ لیتی ایک بار اور....."

"پلیز دادی، آپ ایسی باتیں مت کیا کریں۔" یک دم آگے بڑھ کر اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ "یہ کتنا بڑا فاؤل ہے کہ سب کی شادیوں میں تو آپ نے شرکت کر لی اور اب جبکہ عکرمہ بھائی کا نمبر آنے والا ہے آپ جانے کی باتیں کر رہی ہیں۔" شوخی سے کہتا سیف انہیں بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر گیا۔ عکرمہ نے اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"ارے میری جان میں کون سا خوشی سے جانے کی بات کر رہی ہوں۔ ابھی تو اس گھر میں عکرمہ کے بچے کھیلتے دیکھنے کا ارمان ہے دل میں میرے..... اور پھر تمہارے سر پر بھی سہرا سجانا ہے۔" سیف کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی دادی بہ مشکل اپنی اداسی چھپا سکیں۔

"ہوں، ارادہ کچھ برا نہیں دادی۔" وہ ہنس پڑا تھا پھر قریب کھسک کر رازداری سے بولا۔

"آپ ردا باجی کی شادی میں خود ہی کوئی لڑکی پسند کر ڈالیے۔ عکرمہ بھائی تو کسی کام کے نہیں۔ ان کے چکر میں رہیں ناں تو اگلے چند سالوں میں کسی خاتون کا ہی رشتہ مل سکے گا انہیں۔"

"ہوں..... تو گویا اپنی فائل اوپر لانے کیا اتنی جلدی ہے۔" عکرمہ نے اچانک اس کا کان پکڑ کر کھینچا تو وہ بلبلا تا رہ گیا۔

"اُف..... عکرمہ بھائی، میں تو آپ کے مطلب کی ہی بات کر رہا تھا۔ واللہ یقین کریں۔"

"پتا ہے مجھے۔ چلو بھاگو یہاں سے۔" اس نے چٹکی بجا کر کہا تو وہ کان چھڑا کر ڈھٹائی سے ہنستا دروازے کی طرف چل دیا۔ تاہم باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر یہ ضرور کہا۔

"یاد رکھیے گا دادی۔ جو میں نے کہا ہے آپ سے۔ اور اگر میری مدد کی ضرورت پڑے تو ضرور بتائیے گا۔ ایک دو اچھی خواتین ہیں میری نظر میں بھی۔"

"تم جاتے ہو یا میں کچھ تواضع کروں تمہاری۔" عکرمہ نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا تو وہ چہرے پر مسکینیت طاری کرتا چھپاک سے کمرے سے نکل گیا۔

عکرمہ نے دیکھا ان دونوں کی نوک جھوک سے محظوظ ہونے کے باوجود دادی کی افسردگی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"کم آن دادی، اتنا اسٹریس کیوں لے رہی ہیں آپ۔ بھائی نے کہا تو ہے کہ وہ اگلے ماہ آجائیں گے، ان شاء اللہ۔ سب ٹھیک رہے گا۔ آپ ہی تو کہتی ہیں کہ ہر کام میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ تو پھر اب اتنی اداسی کیوں.....؟" ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح محبت اور نرمی سے کہا تو وہ اس کا چہرہ دیکھ کر خود کو سنبھالنے لگیں۔ اس کی باتیں دل کو لگی تھیں۔ تاہم ہلکا سا ملال پھر بھی تھا۔

"ہوں، ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔ چلو اللہ کی مرضی۔ اللہ جب لائے خیریت سے لائے میرے بچے کو۔" دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔

"دیٹس لائیک مائی دادی۔ چلیں اب خوش ہو جائیں اور نیچے چلیں۔ چچی جان نے بلایا ہے آپ کو غالباً ردا کے ان لازمیں سے کوئی آرہا ہے آج۔" انہیں مسکراتا دیکھ کر اس نے سائرہ بیگم کا پیغام دیا اور ہاتھ پکڑ کر احترام سے اٹھایا۔

"ارے ہاں، آج تو آصف میاں کی پھوپی آرہی ہیں۔ اصل میں وہ لوگ نکاح تین دن پہلے کرنا چاہ رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں بات کرنی ہے انہیں۔" اٹھتے ہوئے انہوں نے بتایا تو وہ سر ہلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

شیرازی ولا میں کسی کو بھی اس بات پر اعتراض نہیں تھا۔ تاہم سائرہ بیگم شادی والے دن سے تین روز پہلے کیے جانے والے نکاح کے اس نئے "شاخسانے" پر کوئی خاص راضی نہیں تھیں۔

مظفر صاحب اور دادی کے سمجھانے پر کہ خواہ مخواہ کی بدمزگی کرنے سے کیا فائدہ..... نکاح تو اول و آخر ہونا ہی ہے ناں۔ وہ بے دلی سے راضی ہوگئی تھیں۔

اِدھر دُرِ مکنون نے جب سے خولہ کے لیے دادی کا انکار سنا تھا بڑی خاموش، خاموش تھی۔

اس وقت بھی جب دادی سیڑھیاں اتر گئی تھیں۔ اوپر آتے ہوئے اس نے لاؤنج میں موبائل پر بات کرتے عکرمہ کو دیکھا تو لمحے بھر کے لیے رک سی گئی۔

"کتنی اچھی جوڑی بنتی خولہ آپی کی ان کے ساتھ۔ پتا نہیں کیوں انکار کر دیا انہوں نے۔ شاید کوئی بہت ہی خاص قسم کی لڑکی چاہیے ہے انہیں۔ خود بھی تو کتنے شاندار اور نفیس ہیں۔ اللہ کرے انہیں ان کے مطلب کی شریکِ حیات مل جائے۔"

دل ہی دل میں سوچتی وہ دادی کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ عکرمہ کی نظر اس پر پڑی۔ تو ہمیشہ کی طرح معمول کی دوستانہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی۔

"کتنی شفاف مسکراہٹ ہے ان کی۔ ٹھیک کہتے ہیں بزرگ کہ جن لوگوں کے دل صاف ہوتے ہیں ان کی باطنی پاکیزگی اُن کے ظاہر میں بھی جھلکنے لگتی ہے۔"

سوچوں پر کسی کا پہرہ نہیں تھا۔ یہ بے لگام تھیں۔ وہ یونہی سوچتے سوچتے آگے بڑھ گئی تھی۔

.....☆.....☆.....

"اُف، بس بھی کرو عاصمہ۔ آخر کتنا سوچو گی تم۔ کیوں اس قدر سر پر سوار کر رکھا ہے تم نے انصاری انکل کے "فرمانِ شاہی" کو..... حد ہے بھئی۔" نازیہ گرم گرم کافی بنا کر لائیں تو عاصمہ بیگم کو بنوز سوچوں میں غلطاں پایا۔

ان کی ناگواری کا تاثر دیتی آواز عاصمہ بیگم کو حال میں کھینچ لائی۔

بہن کو دیکھ کر سوگواری مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھو گئی۔

"ارے نہیں، میں تو بس یونہی کچھ اور۔"

"اچھا بس، بس۔ پلیز اب مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔" یک دم بہن کو ٹوکا اور کوفت بھرے انداز میں ان کے ساتھ ہی کاؤچ پر بیٹھتی نازیہ بیگم کی آنکھوں میں ان کے لیے تردد تھا۔ عاصمہ بیگم جھینپ کر رہ گئیں۔

"مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔ کس بات کی فکر ستا رہی ہے تمہیں! یہی ناں کہ اب تم زاویار کو کس طرح راضی کرو گی شہرین کے لیے۔ انکل نے خوب چال چلی ہے۔ جب حکم سے کان نہ چلا تو اب وہ منت سماجت پر اتر آئے ہیں۔ مگر تم فکر مت کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔" نازیہ آج سخت کبیدہ خاطر ہو رہی تھیں۔

زاویار کے ایکسیڈنٹ نے تو یوں بھی عاصمہ بیگم کو نڈھال کر رکھا تھا۔ مستزاد یہ نیا شاخسانہ۔

"دیکھنا کیسے راضی کرتی ہوں زوی کو دُرِ مکنون کے لیے۔" عاصمہ کے سوالیہ انداز پر انہوں نے مصمم ارادہ ظاہر کیا۔

"کیا فائدہ ناز، میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ زوی نے کیا کہا تھا شہرین سے۔ وہ دُرِ مکنون کے لیے راضی نہیں اور اس کی وجہ بھی بتا چکا ہے وہ۔"

"راضی تو وہ شہرین کے لیے بھی نہیں ہے عاصمہ۔ تو پھر جب اسے کنونس کرنا ہی ٹھہرا تو دُرِ مکنون کے لیے کیوں نہیں۔"

"دُرِ مکنون کی بات اور ہے۔ زوی ٹھیک کہتا ہے وہ کم عمر ہے اور اتنی میچور نہیں جتنا کہ زوی اپنی وائف کو دیکھنا چاہتا ہے۔ جبکہ شہرین اس کی ہم عمر ہے، پھر بچپن کا ساتھ ہے ان کا۔ وہ زوی کے مزاج کو سمجھتی ہے۔ اور جمیل بھی سمجھتی ہے۔" گہری سانس خارج کرتے ہوئے انہوں نے گویا بیٹے کے فیصلے کو ٹھونک بجا کر ان کے سامنے رکھا تو نازیہ بیگم

اختلاف نہ کر سکیں۔

''تم دیکھنا کل پھر سے آئے گی وہ اس کو وزٹ کرنے۔ حالانکہ زوی نے بہت روڈلی ہیو کیا تھا اس کے ساتھ۔'' وہ سچائی سے کہہ رہی تھیں۔

یوں بھی جب سے زاویار کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ بہت حساس ہو رہی تھیں اس کے معاملے میں۔ پچھلے دنوں دُرِ مکنون کو بہو بنانے کی بڑی چاہ تھی انہیں مگر آج زوی نے دھیمی آواز میں اپنا سچ نظر ان کے گوش گزار کیا تو وہ خاموش ہو رہیں۔ ان کا بیٹا موت کے منہ سے واپس آیا تھا۔ اس کی ہر خواہش سر آنکھوں پر تھی۔

''ہوں، یہ تو خیر سچ ہے۔ شہرین کی برداشت غضب کی ہے۔'' نازیہ مسکرا کر بولی تھیں۔ پھر کچھ خیال آنے پر عاصمہ بیگم کو کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''کیا ہوا، تم کیا سوچنے لگی ہو؟''

''یہی کہ دُرِ مکنون تمہیں کتنی اچھی لگی تھی۔ مومنہ اور میری بھی پسند ہے وہ تو.....''

''تو کیا، کھل کے بات کرو ناز۔'' عاصمہ بیگم کچھ نہیں سمجھی تھیں۔

''میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اسے ضرور بہو بناتی عاصمہ۔ مگر تمہیں تو اللہ نے دو، دو بیٹے دیے ہیں۔ اپنے مہران کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا۔'' نازیہ جوش سے بولیں تو لمحے بھر کے لیے عاصمہ بیگم کی آنکھوں میں پسند کی چمک لہرائی جو گہرائی میں سوچنے پر معدوم بھی ہو گئی۔

''بات تو تمہاری بہت اچھی ہے ناز۔ مگر ایک بیٹے کے لیے انکار کر کے کیسے اسی جگہ دوسرے بیٹے کی بات چلاؤں۔ سوچو ناں زوی نے اس سے باقاعدہ ملنے کے بعد انکار کیا ہے۔ وہ بھی لڑکی ہے کوئی کھلونا تو نہیں کہ ایک بچے نے اٹھا کر پھینک دیا تو میں اسے دوسرے بچے کے ہاتھ میں تھما دوں۔'' وہ ایک ماں کا دل رکھتی تھیں تردد سے بولیں۔

''مسز شیرازی تو خیر خالہ ہیں۔ وہ اس ذمے داری سے بری الذمہ ہونے کے لیے شاید زیادہ bother بھی نہ کریں۔ مگر دُرِ مکنون..... اس سے کیسے نظریں ملا سکیں گے ہم۔'' ان کی سوچ انسانیت اور دردمندی سے بھرپور تھی۔ نازیہ پُرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے متفق ہونے کا عندیہ دے گئیں۔

اور یوں دُرِ مکنون کو بہو بنانے کی خواہش گہری سانس سمیت ان کے سینے سے خارج ہو گئی۔

.....☆.....☆.....

''خبردار جو تم زاویار سے ملنے اسپتال گئیں۔ حد ہو گئی ہے۔ کچھ عزتِ نفس نام کی چیز بھی ہے تمہارے اندر کہ نہیں۔'' خولہ نے درشتی سے خوب صورت سا ایوننگ ڈریس شہرین کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے غصے سے آنکھیں نکالی تھیں۔

''چچ..... کیا کر رہی ہو خولہ؟'' شہرین نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔

''تمہیں عقل کا راستہ دکھا رہی ہوں۔ وہ صاحب بہادر تمہاری شاندار بے عزتی کر کے کس سکون سے بیٹھے ہیں۔ اور تم اس سے ملنے جا رہی ہو۔'' اس نے غیرت دلانے والے لہجے میں کہا تو شہرین مسکرا دی۔

''کم آن یار، وہ بیمار ہے اس کی عیادت فرض ہے ہم پر۔''

''بہت خوب۔ تو گویا ساری اخلاقیات تمہارے ذمے ہیں۔ اور اس کا کوئی فرض نہیں۔'' خولہ نے چمک کر سوال کیا تھا۔ بات ٹھیک تھی۔ شہرین لاجواب سی ہو گئی۔

''مگر اس کی طبیعت خراب ہے خولہ۔''

''اس کی طبیعت نہیں دماغ خراب ہے۔ اور اسے خراب کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تمہارا ہے۔ دو کوڑی کا مزاج کر کے رکھ دیا ہے تم نے اس کا۔'' خولہ بہت بھنا رہی تھی۔

''تم بلاوجہ اتنا لیل کر رہی ہو خولہ۔ حالانکہ تم بھی جانتی ہو اس کا مزاج شروع سے ہی ایسا ہے۔'' اس کا انداز مدافعانہ تھا۔

''اسے مزاج نہیں بدمزاجی کہتے ہیں۔ موصوف کی بدمزاجی روزِ اول سے ایسی ہے۔'' خولہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''وہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ زوی ایسا ہی ہے تو پھر اس کے رویے کو دل پہ کیا لینا۔ یوں بھی آج کل اسے ہم سب کی بہت ضرورت ہے۔ کزوری کی وجہ سے وہ تھوڑا شارٹ ٹیمپرڈ ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا کچھ دنوں میں۔'' خولہ کے ہاتھ سے اپنا ڈریس نرمی سے لیتے ہوئے وہ بڑے سکون سے کہہ رہی تھی۔

خولہ نے لب بھینچ کر اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا۔ جس کا دل اور ظرف کس قدر بڑا تھا۔ پھر طنز سے بولی۔

''ہوں، ہو گیا وہ ٹھیک۔ کریلا بھی کبھی کیلے کی طرح میٹھا ہوا ہے۔ بڑی غلط فہمیاں ہیں تمہیں۔'' اس نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔

شہرین نے شرارت بھری مسکراہٹ سمیت اسے دیکھا تو وہ چڑ سی گئی۔

''اچھا اب یہ بتیسی اندر کرو۔ سخت زہر لگ رہی ہے اس وقت مجھے۔'' سامنے پڑا دوپٹا گولہ بنا کر اس کی طرف اچھالتے ہوئے خولہ ناراضی سے بولی تو شہرین ہنسی دبا کر ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ کپڑے چینج کر کے باہر نکلی تو خولہ موبائل بند کر کے بیگ میں رکھ رہی تھی۔

''کس کا فون تھا.....؟''

''بھابی تھیں۔''

''بلا رہی ہیں.....؟''

''ہوں۔''

''تو چلو میں ڈراپ کر دیتی ہوں تمہیں۔''

''نہیں، عکرمہ کو بھیجا ہے انہوں نے مجھے پک کرنے کے لیے۔''

ڈراپ کرنے کی آفر کے جواب میں اس نے کہا تو شہرین نے قدرے غور سے اسے دیکھا۔

''ان فیکٹ وہ یہاں کسی کام سے آ رہے تھے تو بھابی نے کہہ دیا ان سے۔ خاص میرے لیے نہیں آ رہے۔'' شانے جھٹکتے ہوئے اس نے بے ساختہ وضاحت دی تو شہرین کے تاثرات یک دم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

''خولہ! میں، تم اور زوی۔ ہم ہمیشہ سے اچھے دوست رہے ہیں ناں.....؟ ہر طرح کی بات، راز، دکھ، درد خوشیاں سب شیئر کرتے آئے ہیں ہمیشہ سے۔ ہیں ناں.....؟'' متردد لہجہ سوالیہ تھا۔

خولہ نے بے چینی سی محسوس کی تھی مگر ظاہر نہیں کیا۔

''آف کورس شیری، اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے.....؟'' اعتماد سے سر اٹھا کر جواب دیا تو شہرین کی کھوجتی نظریں خود پر گڑی محسوس کیں۔

''تو پھر اب ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم اور زوی اپنی فیلنگز مجھ سے چھپانے لگے ہو۔'' اس نے ''مجھ'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کک.....کیا مطلب.....؟'' وہ اٹک سی گئی۔

''مطلب یہ کہ تم نے عکرمہ شیرازی کو ڈراپ کر کے طارق بھیا کے لیے کیسے حامی بھر لی۔ جبکہ میں نے تمہیں اس ایشو پر بہت کلیئر دیکھا تھا۔ تم نہ بھی کہتیں۔ میں تمہاری پسندیدگی محسوس کر چکی تھی خولہ پھر اچانک تم نے بھیا کے لیے حامی بھر لی۔ دیٹس اسٹرینج۔''

"کوئی اسٹرینج بات نہیں ہے یہ۔ وہم ہے تمہارا۔ پھر طارق میں کیا برائی تھی کہ میں انہیں ریجیکٹ کرتی۔" نظر چرا کر کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بالوں کی پونی کھول کر دوبارہ بناتے ہوئے اس نے خود کو مگن ظاہر کیا تھا۔

شہرین نے گہری نظر سے اسے ٹٹولا۔

"برائی تو خیر عکرمہ شیرازی میں بھی کوئی نہیں تھی بلکہ اگر دونوں کی personalities کو ایک دوسرے سے کمپیئر کیا جائے تو میں ایمانداری سے کہوں گی کہ عکرمہ، طارق بھیا سے............ 100% بہتر ہیں۔ پھر بھی خولہ......؟" وہ جیسے اس گتھی کو ابھی تک سلجھا نہیں سکی تھی۔

"ساری باتیں اپنی جگہ شیری۔ مگر تم بھول رہی ہو ایک پوائنٹ ایسا ہے جو طارق کے حق میں جاتا ہے۔ اور وہ ہے مزاج سے آگہی۔ طارق اور میں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس لیے مجھے لگتا ہے کہ ہم دونوں کے بیچ انڈر اسٹینڈنگ اور compatibility زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔ جبکہ عکرمہ کو میں ابھی تک سمجھ ہی نہیں سکی۔ بہر حال اب اس موضوع کو ختم کرو اور میری جان بخشو۔ میں ذرا جلدی سے چینج کر لوں۔ کہیں عکرمہ پہنچنے والے ہی نہ ہوں۔"

بے یقینی اور فکر مندی سے اپنی جانب متوجہ شہرین کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے وہ کپڑے اٹھا کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھنے لگی تھی کہ شہرین نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"تو پھر عکرمہ کے ذکر پر تمہاری آنکھوں میں اداسی اتر تی کیوں محسوس ہوتی ہے۔" آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑا واضح سوال کر ڈالا تھا اس نے۔

خولہ نے ایک لمحے کے لیے خود کو بے بس محسوس کیا۔ مگر اگلے ہی پل اس نے جیسے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔

"میں نے کہا ناں کہ وہم ہے تمہارا۔ اور وہم کا علاج کم از کم اس دنیا میں تو ممکن نہیں۔ سو پلیز لیٹ اِٹ گو۔" نرمی

سے ہاتھ چھڑاتی وہ مسکرا کر کہتی آگے بڑھ گئی تھی۔
شہرین اس بار اسے روک نہ سکی۔
اور ادھر خولہ نے واش روم کا دروازہ بند کرتے ہی گہری سانس بھری تھی۔ آج شہرین نے اسے حیران کر دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنی اچھی طرح سمجھتی ہے اسے کہ نہ بتانے کے باوجود اس نے کس قدر صحیح قیافہ لگایا تھا۔
عکرمہ سے دستبردار ہونا واقعی اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ مگر وہ کیسے بتاتی اسے کہ اس امر پر وہ مجبور کر دی گئی تھی۔
عکرمہ کے خیالات سے آگہی نے اسے اس فیصلے کی طرف دھکیلا تھا۔ بالکل اتفاقیہ اس نے اس روز زوہا اور عکرمہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔
دادی کے کمرے میں اپنا ہینڈ بیگ بھولنے کے باعث اسے اوپر آنا پڑا تھا۔ ابھی ان کے کمرے سے نکل ہی رہی تھی کہ ٹیرس پر کھڑے زوہا اور عکرمہ کی گفتگو کے درمیان لیے جانے والے اپنے نام نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔
عام حالات میں وہ اس ''غیر اخلاقی'' حرکت کے لیے کبھی تیار نہ ہوتی۔ مگر اس وقت معاملہ زندگی بھر کا تھا۔ اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ اور سماعتیں الرٹ ہو گئی تھیں۔
''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا عکرمہ۔ بتاؤ ناں کہ تم نے خولہ کے بارے میں کیا سوچا؟'' زوہا نے اصرار بھرا سوال دُہرایا تھا۔
''میں کیا سوچوں زوہا۔ اس میں سوچنے والی کیا بات ہے۔ دادی کو..... تم سب کو اگر پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ میں نے منع تو نہیں کیا۔'' عکرمہ کا رسان بھرا انداز کسی بھی جذبے سے عاری تھا۔
''تم نے ہاں بھی تو نہیں کی۔'' زوہا کا سوال واضح اور برجستہ تھا۔ عکرمہ کی خاموشی خاصی معنی خیز تھی۔
خولہ نے اپنی ہتھیلیاں بھیگتی محسوس کی تھیں۔
''پتا نہیں زوہا... بس اس معاملے میں مجھے خود سے کوئی جواب نہیں مل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے سب کچھ دادی پر چھوڑ رکھا ہے۔ جو وہ کریں ٹھیک ہوگا۔''
''حیرت ہے عکرمہ۔ کیا واقعی تمہیں آج تک کوئی اچھا نہیں لگا۔'' اس بار زوہا کے لہجے میں حیرت اور اشتیاق تھا۔
عکرمہ ہولے سے ہنس پڑا۔
''خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میں ایک نارمل انسان ہوں۔ اچھے چہرے، خوب صورت لوگ مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ ہاں مگر تم یہ کہہ سکتی ہو کہ اب تک ایسا کسی کے لیے محسوس نہیں کیا کہ اسے لائف پارٹنر بنانے کو دل چاہے۔''
''خولہ کے لیے بھی نہیں۔''
اس کے کہنے پر ایک بار پھر ڈائریکٹ سوال ہوا تو ٹیرس کے دروازے کے قریب کھڑی خولہ کو عجیب طرح کی توہین کا احساس ہوا۔
''شاید نہیں۔'' اس نے جھجک کر جواباً کہا تھا۔
خولہ کے لیے اتنا سننا ہی کافی تھا۔ وہ وہاں سے چلی آئی تھی۔ گو کہ زوہا نے کچھ اور بھی پوچھا تھا مگر اسے گویا مزید کچھ جاننے کی خواہش نہیں رہی تھی۔
شروع میں تو اسے بہت برا محسوس ہوا۔ پھر ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر اس نے خود کو سمجھایا کہ یہ معاملہ دل کا ہے۔ جیسے اسے عکرمہ اچھا لگا ضروری نہیں کہ اسی طرح وہ بھی اسے اچھی لگے۔ جب اسے اپنی پسندیدگی پر اختیار نہیں ہے تو پھر عکرمہ کو بھی کوئی کس طرح خولہ انصاری کو پسند کرنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔
سو اس نے اپنا ذہن اور دھیان عکرمہ کی طرف سے ہٹانا شروع کر دیا تھا۔ وہ خود ایسے شخص کی زندگی کا حصہ بننا نہیں

چاہتی تھی جس کے دل میں اس کے لیے کوئی خاص مقام ہی نہ ہو۔ چنانچہ ان ہی دنوں جب آغا جان نے طارق کے لیے اس کا رشتہ مانگا تو اس نے سوچ سمجھ کر اقرار کر لیا۔ اس فیصلے کا ایک مقصد اپنی نسوانی انا کو تسکین پہنچانا بھی تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عکرمہ یا اس کی دادی اس کے لیے انکار کریں۔ لہٰذا اس سے پہلے ہی اس نے بھابی تک اپنا فیصلہ پہنچا دیا تھا۔

گو کہ سب کچھ بظاہر ٹھیک ہو گیا تھا مگر کچھ تھا جو اندر ٹوٹا تھا اور اس تک شہرین کی نگاہ پہنچ گئی تھی۔ خولہ کو بھرم کی دیواریں گرتی محسوس ہوئیں تو اپنے گرد بنا یا خول کچھ اور مضبوط کرنے کے عزم کے ساتھ اس نے خود کو نئے سرے سے جوڑنا شروع کیا۔

لاکھ شہرین سے بچپن کی دوستی سہی..... رازداری سہی۔ مگر مستقبل قریب میں بننے والی رشتے داری نے اس کی زبان کو قفل لگا دیے تھے۔ دل کی بات زبان پر لانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اپنی عزتِ نفس اسے دل سے زیادہ عزیز تھی۔

وہ باہر آئی تو شہرین کو گود میں ہاتھ رکھے کچھ سوچتا پایا۔ چہرے پر سنجیدگی اور کسی گہری سوچ کا عکس تھا۔ عموماً وہ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی مگر آج غایت درجے کی سنجیدگی نے اسے گھیر رکھا تھا۔

خولہ کو اس کی سنجیدگی سے وحشت سی ہوئی۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے جلدی، جلدی بالوں میں برش چلایا اور شولڈر بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے بلا ارادہ شہرین کی طرف نظر اٹھائی۔

وہ کچھ جانچتی ہوئی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''کم آن، اب تم اتنی خوفناک شکل بنا کر بھی مت دیکھو مجھے اور پلیز اس بے یقینی سے باہر آؤ۔ میں نے کہا ناں کہ مجھے کوئی regret نہیں ہے۔ ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی۔'' وہ اس کے پاس چلی آئی تھی۔ کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''جب زندگی ہمارے سامنے ایک راستہ بچھاتی ہے اور وہ ہمیں اپنی منزل کی جانب لے جاتا محسوس بھی ہوتا ہے۔ ہم اس پر قدم رکھنے ہی لگتے ہیں کہ اچانک قسمت ہمیں دوسرا راستہ دکھاتی ہے۔ جو پہلے سے زیادہ آسان اور منزل سے قریب ہوتا ہے تو ہم اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ اس لیے پلیز سارے اوہام ذہن سے جھٹک کر مجھ پر ٹرسٹ کرو۔ جو تم نے محسوس کیا تھا وہ بھی سچ تھا اور جو میں اب تم سے کہہ رہی ہوں اس میں بھی جھوٹ نہیں ہے۔ کچھ آیا سمجھ شریف میں۔!''

اس کے گھٹنوں پر زور ڈال کر اٹھتے ہوئے وہ اپنی بات کے اختتام پر خود اعتمادی سے مسکرائی تو شہرین بھی مسکرا دی۔

''ہوں، آ گیا سمجھ میں۔'' سر ہلاتے ہوئے وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں مزید کچھ کہتیں۔ ڈور بیل کی آواز نے عکرمہ کے آنے کی اطلاع دی تو وہ دونوں ہی خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

.....☆.....☆.....

وہ کوئی پندرہ منٹ کے بعد زاویار کے پاس آئیں تو اسے کمرے میں تنہا پایا۔

''مولا بخش چلا گیا.....؟'' اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

''جی۔''

''تم نے روپے دے دیے تھے اسے.....؟''

''جی، بڑی مشکل سے لیے اس نے۔''

''میں جانتی تھی اسی لیے تمہارے ہاتھ سے دلوائے۔''

"مگر محسن ہے ہمارا۔ اس کے لیے اتنا تو کر ہی سکتی ہیں۔"
عاصمہ کا بس چلتا تو اس شخص کے سامنے دنیا کی ہر اس نعمت کا ڈھیر لگا دیتیں جو اُن کے اختیار میں تھی۔ زاویار کی جان بچا کر جو احسان اس نے ان پر کیا تھا وہ چکانے والا تو قطعی نہ تھا۔ مگر کم از کم اس کی مدد کر کے کچھ تو تسلی مل سکتی تھی انہیں۔
"ہوں۔" زاویار نے گہری سانس بھری تھی۔
"ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ احسان کرنے والے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مولا بخش کے لیے اتنا سوچا۔" اس کے سنجیدہ چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ ابھری تھی۔
"یہ رقم صرف میری طرف سے ہی نہیں۔ انصاری انکل کی طرف سے بھی تھی۔" انہوں نے اس کی بات کے جواب میں کہا تو وہ اچنبھے سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔
"تمہیں پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ تم حجت کرتے۔" انہوں نے رسانیت سے کہا تو وہ بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی چپ کر گیا۔
عاصمہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کا مافی الضمیر پا گئی تھیں۔
"تمہیں برا لگا کیا.....؟"
"شاید۔" وہ جھلس کر بولا تھا۔ "ان فیکٹ، میں اپنی زندگی میں آغا جان کی مداخلت اب قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی ان سے کسی قسم کا کوئی تعلق رکھنا چاہتا ہوں۔"
دو ٹوک لہجے میں تنفر اور آنکھوں میں غیظ و غضب کی چنگاریاں لیے وہ بولا تو چند ثانیے کے لیے عاصمہ اس کا چہرہ تکتی رہ گئیں۔
"مجھے اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں کسی کا پابند ہوں۔"
"مگر یہ کیسے ممکن ہے بیٹا، وہ تمہارے دادا ہیں۔ تمہیں پالا ہے انہوں نے۔"
"تو اس پالنے کی کتنی قیمت وصول کریں گے وہ۔"
"میں نے یہ تو نہیں کہا۔ مگر یہ سچ ہے کہ وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ جب تم تین سال کے تھے تو راوی میں ڈوبنے لگے تھے۔ انصاری انکل نے اپنی جان پر کھیل کر تمہیں بچایا تھا۔ صرف پالنے کا ہی نہیں تمہاری جان بچانے کا۔ تمہاری خاطر جان جوکھم میں ڈالنے کا بھی احسان ہے ان کا۔ ابھی تم نے ہی تو کہا تھا ناں کہ محسن کے احسان کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ انصاری انکل تمہارے دادا ہی نہیں محسن بھی ہیں تمہارے۔" عاصمہ نے نصیحت آمیز لہجے میں کہتے، کہتے اس کے بچپن کا واقعہ دُہرایا تو وہ نظر چرا گیا۔ گو کہ یہ بات اس نے بچپن میں بھی سن رکھی تھی مگر جیسے حافظے کے کسی کونے میں جا چھپی تھی۔
ابھی عاصمہ نے یاد دلایا تو وہ لاجواب سا ہو گیا۔
"مجھے نہیں پتا زوی کہ ان سے تمہارا کس بات پر اختلاف ہے۔ اور تم انہیں چھوڑ کر میرے پاس کیوں چلے آئے۔ میں نے آج تک تم سے سوال نہیں کیا نہ ہی آج کروں گی۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی میرے بچے کہ تم اپنے دل کی کدورت نکال پھینکو۔ میں نے انہیں تمہارے لیے بچوں کی طرح روتا دیکھا ہے زوی۔"
دو دن پہلے ہونے والی ملاقات عاصمہ کے دماغ سے نکل نہیں سکی تھی۔ جب انہوں نے انصاری صاحب کو زاویار کے لیے روتے دیکھا تھا۔
"اوہ، اب ان کے آنسو میرا دل نہیں پگھلا سکتے ماما۔ وہ وقت ان کی مٹھی سے ریت کی طرح پھسل چکا ہے۔ جو کچھ انہوں نے میرے ساتھ کیا۔ وہی میں انہیں لوٹا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے میری خوشی چھینی تھی۔ اب میں انہیں ہر اس خوشی سے محروم رکھوں گا جو میرے توسط سے انہیں مل سکتی ہے۔ انہوں نے زاویار انصاری کو کھو دیا ہے۔ سوئی، ریت

میں کھو جائے تو شاید مل سکتی ہو۔ مگر زاویار انصاری کو کھو کر وہ دوبارہ کبھی نہیں پائیں گے۔ کبھی نہیں۔" زہر میں بجھی سوچیں اسے نفرت سے نیلا کیے دے رہی تھیں۔

"تم اپنے دل کا میل دھو ڈالو زوی۔" عاصمہ اس کی سوچوں سے بے خبر محبت سے اصرار کر رہی تھیں۔

"دل کا ہر میل دھویا نہیں جا سکتا ماما۔ مگر کبھی، کبھی کسی کا وجود کسی کی وجہ سے کچھ ایسی غلاظت کی لپیٹ میں آجاتا ہے کہ اسے سات سمندروں کا پانی مل کر بھی نہیں دھو سکتا۔ میں بھی یہ میل صاف نہیں کر سکتا ماما۔ جس نے جسم کے بجائے روح کو متعفن کر دیا ہے۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے مستحکم اور مضبوط لہجے میں کہہ کر بات ختم کی۔ اور عاصمہ کے حیرت سے دیکھنے کے باوجود اسٹک کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کیا کہہ گیا تھا وہ سمجھ نہیں سکی تھیں۔ بس الجھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اس کا کمرے سے نکلنے کا ارادہ تھا کہ اندر آتی شہرین کو دیکھ کر رک گیا۔

وہ اندر داخل ہو گئی تھی۔

"hello every body"

کمرے کا ماحول خاصا بوجھل تھا۔ شہرین کی فریش مسکراہٹ اور تر و تازہ وجود کی آمد سے اس میں ایک خوشگوار یت سی در آئی۔

عاصمہ زیر بحث موضوع کو فی الحال موقوف کرتے ہوئے اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جو اُن کے ایک بلاوے پر چلی آئی تھی۔

"ہیلو بیٹا، کیا حال ہے تمہارا؟" آگے بڑھ کر اپنے سے لگاتے ہوئے انہوں نے لگاوٹ سے پوچھا تھا۔

شہرین نے کن انکھیوں سے زاویار کی طرف دیکھا جو اس کی جانب ہی متوجہ تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ لگتا ہے دشمنوں کا فیوز اڑا ہوا ہے۔" بکے ہاتھ میں لیے وہ اس تک چلی آئی تھی۔

زاویار کی آنکھوں میں درج شرمندگی اس سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ عاصمہ مسکرا کر زاویار کی طرف دیکھنے لگیں۔

"ارے نہیں، آج تو زوی خاصا بہتر محسوس کر رہا ہے۔ کیوں زوی.....؟"

"ہوں، اچھا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتا دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"وجہ بتاؤں مامی.....؟" شہرین نے چہک کر عاصمہ سے پوچھا اور بولی۔

"بقول شاعر

میرے دیکھے سے جو آتی ہے منہ پر رونق
لوگ سمجھتے ہیں بیمار کا حال اچھا ہے

یہ دراصل میری آمد کا اثر ہے مامی۔ ورنہ یہ حضرت ابھی تک بستر پر پڑے ہوتے۔"

اپنے مطلب پر شعر کو ڈھالتے ہوئے بکے اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ عاصمہ مامی سے ہی مخاطب تھی۔

"بلاشبہ۔" عاصمہ ہنس دیں۔

"تھینکس۔"

زاویار نے بکے سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ تو شہرین کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے گھورنے لگی۔

"ہاؤ مین یو زوی... ! ایک تو اس دن مجھے ناراض کیا اور پھر سوری بھی کرنا یاد نہیں رہا تمہیں۔ سچ میں نے تو سوچ لیا

تھا کہ آؤں گی ہی نہیں۔ اگر مامی نے اور مما نے نہ کہا ہوتا ناں تو میں تو شکل بھی نہ دکھاتی تمہیں۔" اپنائیت بھرا غصہ عود کر آیا تھا۔ وہ لڑنے مرنے پر تل گئی۔

"اچھا ہی ہوتا کم از کم مجھے سکون تو رہتا۔" بظاہر بیزاری کا مظاہرہ کرتا وہ سامنے دیوار پر لگے ٹی وی کی اسکرین پر نظر جما کر بیٹھ گیا تھا۔

"کمینے ہو تم پورے۔ انتہائی گھٹیا انسان ہو۔" اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور کرارا ہاتھ رسید کیا اسے۔

"ارے ارے۔ ریلیکس شیری۔ کیا کر رہی ہو۔"

عاصمہ نے دوسری دھپ لگانے سے پہلے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مذاق کر رہا ہے یہ تو۔ صبح سے تین بار پوچھ چکا ہے تمہارا۔! اب بھی تم نہ آتیں تو فون کرنے ہی لگا تھا تمہیں۔" انہوں نے کہا تو شہرین نے مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا۔ جس کا چہرہ اثبات کا تاثر دے رہا تھا مگر آنکھوں میں نفی تھی۔

"زوی، مامی سچ کہہ رہی ہیں.....؟"

"مجھے کیا پتا.....؟ تم سے کہہ رہی ہیں تم جانو۔" بائیں ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول لیے اس نے اب اپنی ساری توجہ ٹی وی کی جانب مرکوز کر لی تھی۔

انداز ایسا تھا کہ وہ اسے ایک اور دھپ رسید کرتی دھم سے اس کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"اِدھر دو ریموٹ ---- میرا فیورٹ ڈراما آ رہا ہے۔ آج لاسٹ اپی سوڈ ہے۔ سوری آئی کانٹ مس اٹ۔"

اس نے مزے سے ریموٹ اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ اسے اپنی جون میں واپس آتا دیکھ کر زاویار نے دل کو ہلکا محسوس کیا۔ تاہم چڑ کر بولا۔

"تمہیں ڈرامے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو خود ڈراما کوئین ہو.....!"

"میری فکر چھوڑ دو خود کو دیکھو۔ پورے چھتیس گھنٹے کی فلم ہو تم۔" دوبدو جواب آیا تھا۔

عاصمہ انہیں لڑتا دیکھ کر مسکراتی باہر نکل گئیں۔

"آخر ان فضول ڈراموں میں ہے کیا سوائے رونے دھونے کے یا پھر خاندانی سازشوں کے..... اور ساس بہوؤں کے جھگڑوں کے۔"

"ارے یہی تو کام کی چیز ہے ڈیئر۔ اتنا تو ہماری امیاں ہمیں سسرال میں رہنے اور شوہر کو قابو کرنے کے گُر نہیں سکھا پاتیں۔ جس قدر یہ ڈرامے ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ تم بھی دیکھ لو کام آئیں گے۔" پیر پسار کر بیٹھتے ہوئے وہ نرمی سے بولی تھی۔

"یو آر امپاسبل۔" زاویار نے کوفت سے سر نفی میں ہلایا۔

"آئی نو آئی ایم۔"

اُدھر بھی جواب تیار تھا۔

.....☆.....☆.....

چڑیوں کی چہکار پر آنکھ کھلی تھی اس کی۔

رات دیر سے سونے کے باوجود وہ خاصی علی الصباح جاگ گئی تھی۔ کمرے کی نامانوس فضا نے کچھ دیر کے لیے حیران کر دیا۔

"اوہ، میں رات یہیں سو گئی۔" اس نے اٹھتے ہوئے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔

دادی کے کمرے کی دائیں جانب بنا یہ گیسٹ روم اس کے نام پر ڈیکوریٹ کرا دینے کے باوجود وہ ابھی تک ان

کے ساتھ ہی سوتی تھی۔ شیرازی صاحب نے بذات خود اس کے لیے فرنیچر خریدا تھا۔ جب سے دُرِ مکنون اوپر کی منزل پر شفٹ ہوئی تھی اس کے تمام معاملات وہ اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے۔

وگرنہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی ۔۔ گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ تین سال پہلے جب وہ سائرہ بیگم کی ناراضی کے باوجود اسے اس گھر میں لائے تھے۔ تب بھی وہ اس کے لیے کسی اچھے کمرے کو مختص کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

اس وقت تو اتنا ہی بہت تھا کہ سائرہ بیگم نے اسے گھر میں رہنے کی جگہ دے دی تھی۔ مگر تب میں اور آج میں بڑا فرق پڑ چکا تھا۔

وہ دُرِ مکنون کی "جگہ" اس گھر میں مستقل طور پر بنا چکے تھے۔ گھر میں شادی کے باعث مہمانوں کی آمد و رفت اور کچھ دُرِ مکنون کے مزاج کے پیش نظر دادی نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔

ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹتی وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

نیند کا خمار رخصت ہوا تو کل رات عینی سے ہونے والی ملاقات ذہن میں دوبارہ تازہ ہو گئی۔ جسے خولہ اور شہرین اس سے ملانے بنا اطلاع دیے چلی آئی تھیں۔

زاویار کے ایکسیڈنٹ کے بعد اسے یقین تھا کہ عینی کراچی آئے گی تو اس سے ملنے ضرور آئے گی۔ خولہ کے ذریعے اس کی یہاں موجودگی کی اطلاع اسے یقیناً مل چکی ہو گی۔

تاہم پھر بھی اسے سامنے پا کر کتنے ہی لمحے وہ شاکڈ سی رہی۔ گو کہ گزرے چند دنوں میں اس نے خود کو اس ملاقات کے لیے لاشعوری طور پر تیار کرنے کی ازحد کوشش کی تھی۔ اور کسی قدر خود کو سمجھا بھی چکی تھی۔

لیکن اسے یوں اچانک دیکھ کر وہ خود کو کمپوز نہیں کر سکی تھی۔ اپنے مجرم کی بہن سے وہ کس طرح پیش آئے جو کہ اس کی دوست بھی ہے۔

"کیسی ہو دُرِ مکنون۔ کہاں ہو تم یار؟" عینی محبت سے اس کے گلے لگ گئی تھی۔

"اچھی ہوں۔" وہ بہ مشکل کہہ سکی تھی۔

"ہوں۔ وہ تو نظر آ رہا ہے۔" اس سے الگ ہوتے ہوئے عینی نے اسے ستائشی نظروں سے سرتاپیر دیکھا۔

"میں تو پہلے بھی کہتی تھی تمہیں۔ ذرا ویٹ لوز کر لو تو بالکل ماڈل گرل لگو گی۔ مگر تم نے مجال ہے جو کبھی توجہ دی ہو۔ اُف قسم سے زبردست ہو گئی ہو تم۔ کتنی گریس فل لگنے لگی ہو۔ سچ بہت بدل گئی ہو تم دُرِ مکنون۔" خوشی اور جوش کے باعث عینی بے ربط ہوتی جا رہی تھی۔

دُرِ مکنون نے سہمے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا مبادا زاویار کے پروپوزل سے متعلق وہ کوئی بات کہے مگر عینی کے چہرے پر اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ تاہم شہرین کی آنکھوں میں ایسا کچھ ضرور تھا جس نے اسے نروس سا کر دیا تھا۔ زاویار کی خولہ اور شہرین کے ساتھ کس قدر انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ وہ اس سے کما حقہ واقف تھی۔ ایسے میں اس پروپوزل کے بارے میں ان دونوں کا لاعلم رہنا اس کے نزدیک ناممکن تھا۔

"ہوں، وقت بھی تو کتنا گزر گیا ناں۔ تم بھی چینج لگ رہی ہو۔"

روا..... خولہ اور شہرین کو ساتھ لے گئی تو اس نے گہری سانس بھر کر کہا تھا۔ ان تینوں کے چلے جانے سے اس نے خود ریلیکس محسوس کیا تھا۔

"بالکل نہیں۔ میں تو ویسے کی ویسی ہوں۔ تمہاری طرح بے مروت نہیں کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی تم نے۔" عینی نے شاکی لہجے میں کہا تو وہ ہونٹ بھینچ گئی۔

''سچ۔ کہاں، کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں۔ تمہارا موبائل نمبر بھی نہیں ملتا تھا ہمیشہ۔ جتنے کانٹیکٹ نمبر تھے تمہارے سب پر سو بار تو کم از کم کالز کی ہوں گی میں نے۔ مگر تم نہ ملیں۔ اور اب جبکہ میں بالکل مایوس ہو چکی تھی کہ زندگی میں کبھی تم سے ملاقات ہو گی۔ تو اتنا اچانک ملنا ہوا ہے کہ خوشی سے شاکڈ سی ہوں میں۔''

عینی کی گلہ آمیز نظریں اسے نادم دیکھ کر نرم ہو گئی تھیں۔

''کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ہمیں اجی بھائی کے ان لاز کے یہاں ملو گی۔ اس کو کہتے ہیں دنیا گول ہے۔ جب زوی بھائی کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تو میں جیسے ٹوٹ ہی گئی تھی۔ مگر سچ کہا ہے کسی نے کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ وہ جو کرتا ہے ہمارے بھلے کے لیے کرتا ہے۔''

''ہاں مگر جو کچھ میرے ساتھ ہوا۔ اس میں بھلا کس کی بھلائی تھی۔ کیا میری......؟ یا زاویار انصاری کی......؟ یا میرے ماما بابا کی......؟'' درد کے احساس میں ڈوبی سوچیں اسے دکھی کر گئی تھیں۔

کچھ تھا اس کے چہرے پر عینی نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اسے شانے سے لگا لیا تھا۔

''میں جانتی ہوں، تم کیا سوچ رہی ہو ڈری مگر ہمارے ہر دکھ سے بڑھ کر اللہ کی رحمت ہے۔ صوفی آنٹی اور انکل زاہد کی جدائی کتنی ہی شاق سہی۔ تم پھر بھی لکی ہو کہ تمہیں اپنوں کی چھت میسر ہے۔ میں ملی ہوں دادی سے۔ بہت نائس ہیں وہ۔ انکل شیرازی اور سائرہ آنٹی سب کتنے اچھے اور پُر خلوص ہیں۔ خولہ باجی نے بتایا ہے مجھے کہ تمہاری کتنی پروا کرتے ہیں سب۔'' وہ دلاسا دے رہی تھی۔ مگر لہجے میں یقین تھا۔

دُرِ مکنون پلکوں کی منڈیروں پر ڈیرا جماتی نمی کو جذب کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئی۔

یہ سچ ہی تھا۔ زندگی نے جو کچھ چھینا تھا اس سے اس کے بعد زخموں کا مداوا بھی کیا تھا۔ دکھ اپنی جگہ سہی مگر چرکوں کی چارہ گری ضرور کی تھی۔

''تم بالکل سچ کہہ رہی ہو عینی۔ واقعی میں خوش نصیب ہوں کہ اللہ نے مجھے relatives سے ملا دیا۔ ورنہ ماما بابا کے بعد کتنی تنہا رہ گئی تھی میں۔''

''تنہا تو میں رہ گئی تھی تمہارے پیچھے۔ سچ ڈری تمہارے بعد کسی سے اس طرح دوستی نہیں ہو سکی جیسی تم سے تھی۔ اب بھی علیک سلیک سب سے ہے۔ مگر ٹرو فرینڈشپ کسی سے نہیں ہے۔ تم جس ویک عمرے کے لیے گئی تھی ناں۔ ٹھیک اس سے ایک دن پہلے زوی بھائی کی کار کسی کار لفٹر نے پستول دکھا کر چھین لی۔ اس پر آغا جان اور زوی بھائی کے درمیان زبردست جھگڑا ہوا۔ زوی بھائی مصر تھے کہ آغا جان اپنا رسوخ استعمال کر کے ان لڑکوں کو پکڑوائیں۔ جنہیں زوی بھائی نے پہچان لیا تھا۔ مگر آغا جان کسی سے دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ بس اسی بات پر جھگڑا اتنا بڑھا کہ زوی بھائی ہمیں چھوڑ کر یہاں اپنی ممی عاصمہ آنٹی کے پاس چلے آئے۔ اس کے کچھ مہینوں بعد شیری آپی؛ پھوپا جان کے ٹرانسفر کے نتیجے میں کراچی چلی گئیں۔ خولہ آپی تو تمہارے سامنے ہی جا چکی تھیں۔ طاری بھیا بھی فورس جوائن کر کے چلے گئے تو سمجھو اتنے بڑے انصاری ہاؤس میں، میں اکیلی ہی رہ گئی۔ تمہیں تو پتا ہے کہ ثنا اور موناسے میری کبھی نہیں بنی سو آج تک ٹھنی ہوئی ہے۔'' عینی دھیرے، دھیرے بتاتی چلی گئی۔

مگر اس کا ذہن زاویار والی بات پر اٹک گیا تھا۔

تو گویا زاویار اس وجہ سے انصاری ہاؤس چھوڑ کر اپنی حقیقی والدہ کے پاس چلا آیا تھا۔

عمرے پر جانے سے ایک دن پہلے کا واقعہ وہ مر کر بھی نہیں بھول سکتی تھی۔ اسی دن تو زاویار اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ وہ منحوس سیاہ دن ہی تو اس کی زندگی پر اماوس رات کی سیاہی بن کر چھایا ہوا تھا۔

''بھلا وہ دن کیسے رسوائی کا دن تھا پھر اس کے بعد کبھی صبح ہی نہیں ہوئی۔'' وہ خود میں گم بول گئی تھی۔

عینی نے کسی قدر اچنبھے سے اسے دیکھا۔
"کیا مطلب.....؟" تحیر اس کے چہرے پر ہی نہیں لہجے میں بھی در آیا تھا۔
نرمی سے دُرِ مکنون کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر خود میں واپس آئی۔
"آئی ایم سوری۔" یک دم خود کو سمیٹا اور پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر بہ مشکل سجائی۔
"دیکھو تو باتوں، باتوں میں تم سے میں نے کچھ کھانے پینے کا تو پوچھا ہی نہیں۔ چلو آؤ تمہارے لیے اچھی سی چائے بناتی ہوں۔"
اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے وہ خود کو بدقت سنبھال رہی تھی۔ عینی نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے تیور دیکھ کر خاموش ہو رہی۔ جس پرسکون کی سانس لیتے ہوئے وہ اسے اپنے ساتھ کچن میں لے گئی۔ پھر کتنی ہی دیر لبوں سے بے ارادہ پھسل پڑنے والے اس جملے کو عینی کے دھیان سے مٹانے کے لیے اس نے کئی سوال کیے اور ان کے جواب دیتے ہوئے عینی واقعی بھول بھی گئی۔ گزرے سالوں میں عینی نے بی کام کر لیا تھا اور آج کل ایم کام پریویس کا فرسٹ سمسٹر دے کر فارغ تھی۔
ان دونوں کے ساتھ کی کتنی ہی کلاس فیلوز تھیں جو دُرِ مکنون کے مقابلے میں پڑھائی میں کافی کمزور تھیں سبھی کچھ نہ کچھ کر رہی تھیں آج کل۔ اور وہ سب سے بہت پیچھے رہ گئی تھی۔
عینی سے یہ سب سن کر اسے خود پر بڑا ترس آیا۔
وہ دُرِ مکنون جس کے روشن مستقبل کا ہر کسی کو یقین تھا۔ کوئی حسد اور کوئی رشک سے اسے دیکھتا تھا۔ ہر کسی کو یقینِ واثق تھا کہ یہ ذہین لڑکی بہت آگے جائے گی۔ آج زندگی اور کامیابی کی دوڑ میں سب سے پیچھے تھی۔ تاہم عینی سے مل کر اس نے خود کو قدرے بہتر محسوس کیا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ اپنے ماضی سے متعلق کسی بھی شخص سے ملنا اسے اندر تک ادھیڑ ڈالے گا۔
لوگ اس کے چہرے سے اس کا ماضی پڑھ لیں گے۔ گزرا ہوا وہ سانحہ جیسے اس کی آنکھوں میں تحریر ہے مگر ایسا ہوا نہیں تھا۔
عینی اس کے وجود پر چھائے اضمحلال کو اس کے والدین کی جدائی کا اثر سمجھ رہی تھی۔
عکرمہ نے ٹھیک کہا تھا درحقیقت اس کے ماضی نے اس کا دامن نہیں تھاما ہوا بلکہ یہ تو خود وہ ہے جو اپنے ماضی کو مٹھی میں جکڑ کر بیٹھی ہے۔
عینی کو سنتے ہوئے کئی بار اس کا دھیان بھٹکا اور ہر بار عینی اسے "آج" میں کھینچ لائی۔
آج کئی سالوں بعد وہ اتنا بولی تھی مگر عینی کے لیے یہ بھی کم تھا۔
وہ تو بس حیران ہی ہوتی رہی۔
یہ دُرِ مکنون اس دری سے بہت الگ تھی جسے وہ جانتی تھی جو اس کی دوست تھی۔
یہ تو دُرِ مکنون کے قالب میں کوئی اور ہی لڑکی تھی جو ذرا سا مسکراتی تو اس کا درد اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگتا تھا۔
گو کہ خولہ کے ذریعے عینی کو دُرِ مکنون کے بارے میں کافی کچھ پتا لگ گیا تھا تاہم پھر بھی وہ متعجب سی رہ گئی تھی اس سے مل کر۔
"کیا کوئی اتنا بھی بدل سکتا ہے.....؟" دُرِ مکنون کو سلیقے سے ٹرالی میں چائے کے کپ رکھتے ہوئے ریفرشمنٹ سجاتے ہوئے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔
نظر جھکائے ہوئی دُرِ مکنون پر خاموشی کا تسلط تھا۔ اسے لگا اگر وہ اس وقت چپ چاپ اٹھ کر یہاں سے چلی بھی جائے تو شاید اس کے وجود پر چھایا یہ سناٹا تب بھی نہ ٹوٹے اور شاید وہ ایسا کر بھی گزرتی اگر شہرین اور خولہ وہاں نہ چلی آتیں۔

شہرین کے پے درپے کیے گئے سوالات نے دُرِ مکنون کو پھر کچھ دیر تک قطعاً کچھ سوچنے نہ دیا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ اجازت لے کر واپس لوٹ گئیں۔

"مجھے کال کرنا، یہ میرا کانٹیکٹ نمبر ہے۔ میں ابھی کچھ دنوں کے لیے یہیں کراچی میں ہوں۔ ان فیکٹ آغا جان اور پاپا بھی آئے ہوئے ہیں۔ زوبی بھائی کی وجہ سے یوں بھی بڑوں میں کچھ کھچڑی پک رہی ہے۔ تمہیں پتا ہے خولہ آپی کو طاری بھیا سے اور شیری آپی کو زوبی بھائی سے منسوب کرنے کا فیصلہ کیا ہے آغا جان نے۔ خولہ آپی نے تو غالباً ہاں کہہ دی ہے۔ اب دیکھو زوبی بھائی اور شیری آپی کا کیا ہوتا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے زوبی بھائی کم ہی کسی کے رعب میں آتے ہیں۔ آسانی سے مان جانے والے وہ بندے ہیں نہیں۔"

جاتے، جاتے عینی اسے اپنا نمبر دے کر کان میں بہت سی خبریں انڈیل گئی تھی۔ جس پر کتنی ہی دیر وہ گود میں ہاتھ رکھے اپنی جگہ بیٹھی گہری سوچ میں گم رہی۔ کتنا آسان ہے مرد کے لیے زندگی کا نیا راستہ چن لینا۔ کسی کو زندہ قبر میں اتار کر اپنی راہ چل دینا۔ زاویار کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے عینی کی بتائی ہوئی کئی باتیں یاد آئیں۔

"کیا زاویار انصاری کی بہن سے مجھے اسی طرح پیش آنا چاہیے تھا......؟" ذہن میں کئی بار یہ سوال اودھم مچا چکا تھا۔

"وہ صرف زاویار انصاری کی بہن ہی نہیں تمہاری دوست بھی ہے دُرِ مکنون...! وہ دوست جس نے ہمیشہ تمہیں اپنے دل سے قریب رکھا جس کے خلوص پر کسی کو شبہ نہیں اور سب سے بڑھ کر بھلا اس کا کیا قصور......؟ وہ تو اس سانحے سے بے خبر صرف خلوص اور محبت کا رشتہ نبھانے چلی آئی تھی۔" دل اسے ایک اور پہلو سے سوچنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس نے بے اختیار آنکھیں موند لی تھیں۔ اور پھر نہ جانے کیسے وہ اسی کمرے میں سو گئی تھی۔

کئی دنوں بعد کسی سے مل کر دل پر پڑا بوجھ کم محسوس ہوا تھا۔ اسے ماننا ہی پڑا کہ عینی سے ہونے والی ملاقات اسے اندر سے کچھ مربوط کر گئی ہے۔ اب بھی یہ سب یاد کر کے وہ خود پر چھا جانے والے سناٹے کو ٹوٹتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ خوابیدہ احساسات جیسے گہری نیند سے بیدار ہو چکے تھے۔

کچھ سوچ کر وہ بیڈ سے اتر آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر خود کو فریش محسوس کرتی وہ کچن میں چلی آئی۔ نیچے کی منزل کی خاموشی بتا رہی تھی کہ ابھی سب سوئے ہوئے ہیں۔ سو اپنے لیے چائے بنانے کے ارادے سے اس نے برتن آن کیا۔ ابھی چائے بنا کر پلٹی ہی تھی کہ دروازے میں کھڑے اظہار صاحب کو دیکھ کر کچھ ٹھٹک سی گئی۔ ہاتھ میں پکڑا کپ بھی لرز گیا۔

"او ہو......تو چوری چھپے ناشتا کیا جا رہا ہے۔" اس کی بوکھلاہٹ کا حظ اٹھاتے وہ دو قدم اندر آتے ہوئے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھے۔

وہ بری طرح خفت کا شکار ہوئی تھی اس لمحے۔

"میں تو۔ میں تو......"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ میں کسی سے کہوں گا تھوڑی ہی۔" قریب آ کر رازدارانہ انداز میں کہا تو وہ سٹپٹا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

اظہار صاحب نے سانس کھینچ کر بظاہر چائے کی خوشبو اندر اتاری تھی۔ اس نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔

"مجھے چائے نہیں پلائیں گی۔" بڑے مطمئن انداز میں اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے انہوں نے جس بے تکلفی کا اظہار کیا۔ لمحے بھر کے لیے وہ سُن سی رہ گئی۔

اظہار صاحب کا ہاتھ اس کی انگلیوں کو چھو گیا تو جیسے کوئی آگ سی اس کے اندر اتر گئی تھی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔" یک دم غصے سے ابل کر وہ کچھ اس نفرت اور طیش میں کہہ گئی کہ اظہار صاحب کے ساتھ، ساتھ خود اسے بھی بے حد حیرانی ہوئی۔

"اپنی حد میں رہیے مجھے آپ، راستہ دیں مجھے۔"

نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی تھی اس میں کہ سامنے ڈٹے کھڑے شخص کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے وہ سیلابی ریلے کے مانند دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

ذرا سی دیر میں دل دُگنی رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔

اظہار صاحب کی خباثت سے بھرپور ہنسی نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ اور وہ جو ذرا دیر پہلے غصے اور طیش میں باہر نکلی تھی۔ دادی کے کمرے کی طرف اقتاں وخیزاں جاتے ہوئے آنکھوں سے رخساروں تک پھسل آنے والی نمی کو بے دردی سے صاف کرتی شدید وحشت زدہ ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ دادی کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے اپنے کمرے کی دہلیز پر کھڑے عکرمہ کو بھی نہیں دیکھا جو اسے سرخ چہرے سے آنسو صاف کرتا دیکھ کر متعجب رہ گیا تھا۔

اور پھر جس طرح وہ تقریباً دوڑتی ہوئی کچن سے نکلی اور لاؤنج کراس کر کے دادی کے کمرے تک آ گئی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ شدید خوفزدہ ہو کر گویا دادی کے پاس پناہ لینے گئی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ اس کے اس طرح بے اوسان ہونے کی توجیہہ کے بارے میں سوچتا۔ دائیں جانب سے کچن سے نکل کر نیچے سیڑھیوں کی طرف جاتے اظہار بھائی کی موجودگی نے جیسے اس پر ابلتا ہوا پانی انڈیل دیا تھا۔

یک دم اسے احساس ہوا کہ اس کا خون گویا کنپٹیوں میں ٹھوکر مار رہا ہے۔

"اظہار بھائی؟"

اگر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو وہ یقین بھی نہیں کر پاتا کہ دُرِ مکنون کے چہرے پر جھلکتا یہ خوف اور وحشت اظہار بھائی کی عطا کردہ ہے۔

اسے اپنے اعصاب اس لمحے چٹختے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ نپے تلے قدم اٹھاتا وہ کچن میں آیا۔ وہاں سب چیزیں جگہ پر تھیں۔ گہری سوچ لیے الٹے قدموں باہر نکلا اور لاؤنج میں رکھے صوفے پر جا بیٹھا۔

اس لمحے اس کا ذہن بیک وقت بہت سی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس نے تمام سوچوں کو سر جھٹک کر ذہن سے نکالنا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ٹی وی آن کر کے نیوز چینل ٹیون کر لینے کے باوجود وہ خود کو مکمل طور پر اس طرف متوجہ نہیں کر سکا تھا۔

گزرے مہینوں میں ہونے والے واقعات نے یقیناً اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ یوں بھی اس کا شمار ان لوگوں میں تھا جنہیں اپنی فیملی سے بے حد لگاؤ ہوتا ہے۔ اور ان کی ہر پریشانی گویا ان کا ذاتی مسئلہ ہوتی ہے۔ سو وہ بھی ایسا ہی تھا۔

چچا جان کی محبت، شفقت اور خلوص سے بڑھ کر ان کی پرورش کا حق وہ کبھی جھٹلا نہیں سکا تھا۔

بابا اور مما جان کے انتقال کے بعد دادی اور مظفر صاحب نے اسے حتی المقدور والدین کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ یا کم از کم ایسی کوشش ضرور کی۔ یہی وجہ تھی کہ آج جب وہ دُرِ مکنون کے لیے متفکر اور متردد تھے۔ یہ مسئلہ بھی از خود اس کے لیے توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس معصوم لڑکی کے ساتھ ہونے والے المیہ نے اسے اندر سے جھنجوڑ دیا تھا۔ اپنی صنف کی سفاکی کے قصے تو اس نے بہت سنے تھے مگر اس کا شکار جب آنکھوں کے سامنے آیا تو وجود احساس پر بڑی کاری ضرب پڑی تھی۔ فی الواقع وہ جب بھی اسے دیکھتا لاشعوری طور پر احساسِ جرم اسے جکڑ لیتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے لیے اس قدر حساس ہو گیا تھا۔

اس نے اس مظلوم لڑکی کو پہلے سے قدرے بہتر بنا دیا تھا۔ کبھی سختی اور کبھی نرمی سے کام لے کر اس نے اپنے تئیں اسے اس خول سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جو اس کی آمد سے پہلے دُرِ مکنون نے خود پر چڑھا رکھا تھا۔ مگر گزرے پندرہ دنوں میں وہ اسے پھر سے کسی ہرنی کی طرح وحشت زدہ دکھائی دینے لگی تھی اور آج اس کے شک کو تقویت مل گئی تھی۔

دُرِ مکنون کو دو قدم پیچھے دھکیلنے والا کوئی اور نہیں اس فیملی کا ایک ایسا ممبر تھا جس پر سب کو بڑا اعتماد تھا۔
"محض بے تکلفی پر دُرِ مکنون اس طرح رو نہیں سکتی یقیناً بات کچھ اور ہے۔" گھوم پھر کر یہی سوچ مقناطیس بن کر گویا اس کے ذہن کے لوہے سے آ چپکی تھی۔
رات کو نشر ہونے والا کوئی ٹاک شو دوبارہ ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ وہ بہ مشکل اس طرف دھیان لگا سکا۔
اس دوران گھر میں تقریباً سب ہی جاگ گئے تھے۔
نیچے کے پورشن سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ دادی بھی نیچے جا چکی تھیں۔
اُدھر اس کی حسیات دادی کے کمرے میں موجود دُرِ مکنون کی طرف متوجہ تھیں جو اب بھی ناشتے کے لیے باہر نہیں نکلی تھی۔
زارا کی بیٹی اسے بلانے آئی تو وہ انگلیوں کی مدد سے بال سنوارتا اٹھ کھڑا ہوا۔
دادی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر دُرِ مکنون گھٹنوں کو بازوؤں کے حلقے میں لیے ان پر ٹھوڑی ٹکائے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ اس نے ہلکے سے دستک دی۔
"دُرِ مکنون، آپ کو ناشتے کے لیے کیا انویٹیشن دیا جائے گا۔" سنجیدہ لہجہ نپا تلا انداز اور گہری نظریں۔
اس نے چونک کر نظر اٹھائی۔
وہ دروازے میں جما کھڑا تھا۔
دراز قد اور چوڑے شانوں کے باعث دروازے کے اس طرف کا منظر جیسے چھپ گیا تھا۔
وہ بہ سرعت اٹھ کھڑی ہوئی۔
"نہیں..... میں نے ناشتا کر لیا ہے۔"
تراشیدہ ہونٹ بے دردی سے کاٹتے ہوئے اس نے نظر چرائی تھی۔
عکرم کے چہرے سے یک دم جلال چھٹنے لگا۔
"ایک بات آپ اپنے ذہن میں بٹھا لیں دُرِ مکنون، مجھے جھوٹ بولنا اور سننا دونوں سخت ناپسند ہیں۔ سو پلیز آپ ایسی کوشش نہ کیا کریں۔ پانچ منٹ میں فریش ہو کر نیچے آئیں۔"
کرتے کی آستینیں اونچی کرتے ہوئے اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈال کر کچھ ایسے حکمیہ انداز میں کہا کہ دُرِ مکنون کی شاکی نگاہیں بلا ارادہ اس کا حصار کر گئیں۔
"سب کا بس مجھ پر ہی چلتا ہے۔ ہر ایک کا حکم میرے ہی لیے ہے، میں کیا چاہتی ہوں آخر کوئی کیوں نہیں سمجھتا۔"
کچھ تھا اس کی نگاہ میں۔ مڑی ہوئی پلکوں کی باڑ کے اس طرف نمکین پانی کے ذخیرے موجود تھے۔
مگر اس لمحے انہیں نظر انداز کرنا ہی اسے درست لگا۔
"کم آن ہری اپ۔ فوراً نیچے آئیں۔" تحکم سے کہتا وہ پلٹ گیا تھا۔
ٹیبل پر زارا، سیف اور اظہار بھائی سمیت دادی، چچا جان اور چچی جان تھیں۔
اس نے سنجیدہ نظروں سے ایک لمحے کے لیے اظہار صاحب کی طرف دیکھا جو اندر آتی دُرِ مکنون کو دیکھ کر زیرِ لب مسکرا دیے تھے۔ پھر بقیہ وقت اس کی نظریں پلکیں عارض پر بچھائے ناشتا زہر مار کرتی دُرِ مکنون اور فاتحانہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے اظہار صاحب کو چھو، چھو کر پلٹتی رہیں۔
دادی نے دو بار ٹوکا بھی کہ وہ ناشتا ٹھیک سے نہیں کر رہا مگر وہ آج خود کو کمپوز نہیں کر پا رہا تھا۔
ناشتے کے بعد جب زارا نے اظہار صاحب کی طرف چائے کا کپ بڑھایا تو انہوں نے ٹوک دیا۔

ذرِ مکنون کے سُتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے محظوظ ہونے والے انداز سے کہا تو اس کی کاٹ دار نظر بے اختیار ان کی طرف اٹھی تھی۔

نفرت، بے بسی اور غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ فرطِ اشتعال سے وہ گویا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔

''مگر کب پی... یہ تو ابھی، ابھی اصغری لائی ہے۔'' زارا نے تحیر سے شوہر کی طرف دیکھا۔

''تم سب کے اٹھنے سے پہلے ہی پی لی تھی میں نے۔''

وہ مسکرا کر بولے تو ذرِ مکنون نے گویا پانی کے ساتھ غصہ بھی اندر اتارا۔ اور یک دم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دادی میں ابھی آئی۔''

جھک کر ان سے کہتے ہوئے اس کی نظریں غیر ارادی طور پر عکرمہ کی طرف اٹھی تھی جس کے چہرے پر تناؤ صاف بڑھا جا رہا تھا مگر وہ رکی نہیں اور پلٹ کر تیز قدموں سے چلتی کمرا چھوڑ گئی تھی۔

اظہار صاحب کی بھوکی، نفس پرست اور شکست کا احساس دلاتی نگاہوں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ چائے کا کپ لبوں سے لگائے عکرمہ شیرازی کی پُرسوچ نظریں ان کے ہی وجود کا حصار کیے ہوئے ہیں۔

☆......☆......

''کیا حال ہیں بھئی......؟'' کر پر زوردار دھپ کے نتیجے میں عکرمہ نے مڑ کر دیکھا۔

ولی حسبِ روایت اچانک بنا اطلاع دیے فریش موڈ میں حاضر تھا۔

''السلام علیکم!'' سنجیدگی سے سلام کر کے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ ''یہ کیا طریقہ ہے......؟''

''یہ طریقہ نمبر دس ہے۔'' ولی چڑ کر بولا گھوم کر سامنے چلا آیا۔ ''یہ تم گناہ گاروں کی طرح منہ چھپا کر کیوں غائب ہو۔ خیریت تو ہے۔'' فکرمندی جتاتا وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا سامنے آ بیٹھا۔

''کم آن ولی تمہیں پتا تو ہے اگلے ہفتے ردا کی شادی ہے۔'' مصافحہ کرتے ہوئے اس نے رسان سے کہا۔

''تو......؟'' شادی ردا کی ہے ناں ناں کہ تمہاری یا تم نے as an event planner کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو تمہیں کم از کم مجھے ضرور بتانا چاہیے تھا۔'' صوفے کی پشت پر بازو پھیلاتے ہوئے ولی کی باتیں ہمیشہ کی طرح بے سروپا تھیں۔

شوخ مسکراہٹ سمیت وہ اس کی طرف متوجہ تھا۔

''کیوں بے تکی ہانکتے ہو۔'' عکرمہ نے سنجیدہ لہجے میں ٹوکا۔ ''شارجہ سے اظہار بھائی آئے ہوئے ہیں انہیں کمپنی دینی ہوتی ہے۔ پھر دوسرے مہمان بھی ہیں۔ مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ دادی کا حکم ہے کہ میں کچھ ٹائم گھر پر بھی دوں۔''

اس نے حقیقتِ حال سے واقف کیا۔ یہ سچ ہی تھا۔ دادی نے واقعی اسے حکم دے ڈالا تھا عبید بھائی کی غیر موجودگی میں کسی نہ کسی کو تو سعد بھائی اور اظہار بھائی کو کمپنی دینی ہی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے شام کی کلاسز سے فی الحال آف لے رکھا تھا۔

پچھلے دنوں ولی اسے زبردستی کلب لے گیا تھا اپنے ساتھ اس دن کے بعد سے وہ اس سے ملنے نہیں جا سکا تھا۔ آج تو یوں بھی دادی گھر پر نہیں تھیں اس لیے وہ گھر پر رکا ہوا تھا۔

''اوہ، آئی سی... تو یوں کہو شارجہ ریٹرنز کو کمپنی دی جا رہی ہے۔'' ولی نے شوخی سے آنکھیں گھمائیں پھر یک دم نزدیک ہوتے ہوئے رازداری سے سوال کیا۔ ''ویسے سچ، سچ بتا میرے یار۔ دادی کا حکم محض ٹائم دینے تک ہی ہے یا رضامندی بھی مانگ لی ہے تم سے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے بھویں اچکاتے کہا۔

''مطلب یہ کہ کہیں ردا کے ساتھ تمہارے ہاتھ بھی نیلے آئی مین..... پیلے تو نہیں کیے جا رہے۔''

''بکومت!'' بات سمجھ آنے پر کرارا ہاتھ ولی کی خیریت دریافت کر گیا۔

''عبید بھائی کا آنا ملتوی ہو گیا ہے۔ اس لیے چچا جان کے ساتھ کسی نہ کسی کا ہونا ضروری ہے۔'' اس نے مطلع کیا۔

''آئی سی..... خیریت وہ کیوں نہیں آ رہے؟''

اس اطلاع پر اس نے سنجیدگی سے استفسار کیا تو عکرمہ نے مختصراً ان کی مجبوری بتا دی اور ان کو ملنے والے پراجیکٹ کا ذکر کیا۔

''ہوں، صحیح بات ہے۔ ایسی پرکشش آفر بندہ ٹھکرا بھی نہیں سکتا۔ پھر کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔'' ولی نے تائید اً سر ہلایا تھا۔ پھر اچانک کچھ یاد آنے پر اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''ویسے جہاں تک میں تمہیں جانتا ہوں۔ عبید بھائی کے نہ آنے کی خبر سے تو تم اس قدر ''متاثر'' ہو نہیں سکتے۔ بات کچھ اور ہے۔'' مزاج آشنائی کے زعم کے ساتھ تیقن سے استفسار ہوا تھا۔

''مطلب.....؟'' اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''مطلب یہ میرے دوست کہ بقول شاعر

''ہے کچھ تو بات مومن کیوں یہ چھا گئی خموشی
کس بت کو دے دیا دل کیوں بت سے بن گئے ہو''

ولی کا شعر پڑھنے کا انداز غضب تھا۔

عکرمہ نے کھسیا کر اسے مزید ایک کرارا ہاتھ رسید کیا۔

''سدھر جاؤ تم۔''

''ہوں، ایک بس میں ہی سدھروں۔ تم ساری زندگی یوں ہی بگڑے رہنا۔'' ولی نے بازو سہلاتے ہوئے اسے گھورا تو ایک جاندار سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

ولی نے اسے گویا جھنجوڑ دیا تھا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے سوچا کہ کیا واقعی وہ متفکر اور پریشان ہے۔ اگر ہاں تو آخر کیوں.....؟ اور اس کیوں کا جواب خاصا پیچیدہ تھا۔

اسے احساس ہوا کہ وہ پچھلے تین، چار دن سے نہ صرف جلدی گھر آ جاتا ہے بلکہ بقیہ ٹائم گھر پر ہی گزارنے لگا ہے۔ جہاں اس کی اس روٹین سے دادی اور چچا جان خوش تھے۔ وہیں ولی پریشان ہو کر یہاں چلا آیا تھا۔

کیونکہ ہر دوسرے دن ایک دوسرے سے ملنے کی روٹین اس کے یو ایس ..... سے واپس آنے کے بعد ایک بار پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ جس میں اچانک ہی کوئی رخنہ پڑا تھا۔ وہ اندر ہی اندر چونک اٹھا۔

''کیا میں نے اظہار بھائی پر نظر رکھنے کے لیے اپنے معمول میں تبدیلی کی ہے؟'' خود سے سوال کیا۔

''کہیں گھر پر ٹائم دینے کا محرک، آنسہ خولہ تو نہیں۔''

اسے گہری سوچ میں مبتلا دیکھ کر ولی اٹھ کر ساتھ والے صوفے پر آ بیٹھا تھا۔ انتہائی رازداری سے دھیمے لہجے میں دریافت کیا۔

''پھر وہی بات، تم اس سے ہٹ کر کچھ اور نہیں سوچ سکتے۔ محض ایک ہی نقطے کے گرد گھومتی ہے تمہاری سوچ۔''

وہ جھلا سا گیا تھا۔ ولی کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ اتر آئی۔ مگر اس سے پہلے وہ کچھ کہتا عکرمہ نے اسے ٹوک دیا تھا۔

''پلیز چینج دا ٹاپک۔''

لہجے میں قدرے بیزاری تھی۔ ولی نے چونک کر اس کے چہرے پر کچھ کھوجا۔ اور اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ''خولہ'' کے لیے اس کا جواب نفی میں تھا۔

''او کے بابا بدل دیتا ہوں ٹاپک۔ تم بھی ذرا موڈ بدلو اور چلو میرے ساتھ۔'' پیار پسارتے ہوئے ولی نے کہا تو وہ ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کہاں جانا ہے؟''

''بتا دوں گا پہلے تم اٹھو تو سہی۔''

''میرا موڈ نہیں ہے۔''

لاشعوری طور پر وہ اظہار بھائی کی واپسی کا منتظر تھا جو کہ بقول دادی صبح ناشتے کے بعد سے ہی زارا اور بچوں سمیت کہیں گئے ہوئے تھے۔

''موڈ بنانے سے بنتا ہے ڈیئر۔ تم اٹھتے ہو یا میں ترکیب نمبر تین آزماؤں۔'' ولی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ دادی کے کمرے سے باہر آتی دُرِ مکنون کو دیکھ کر بات ہونٹوں میں ہی دبا گیا۔

ولی کی نظر اس کی نگاہ کے تعاقب میں سفر کرتی دُرِ مکنون تک آ رکی۔

وہ بھی اسے سامنے دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔

ولی اس کے رکنے کا فائدہ اٹھا کر پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''السلام علیکم!'' ہاتھ میں کتاب لیے وہ عکرمہ سے کچھ پوچھنے آئی تھی۔ ولی کو متوجہ دیکھ کر بلا ارادہ سلام کر ڈالا۔

''وعلیکم السلام! خوش آمدید.....!''

پہلی بار اس نے خود سے سلام کرنے میں پہل کی تھی۔
ولی اور عکرمہ کو اچنبھا ہوا تھا۔ ولی کی خوش مزاجی اس سلام سے عود آئی تھی۔
عکرمہ نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا جو دُرِ مکنون کے ساتھ جا کھڑا ہوا تھا۔
وہ اس کے اس طرح دعا دینے پر جھینپ سی گئی۔
"کہیے کیسی ہیں آپ.....؟" وہ سر پر کھڑا سوال پوچھ رہا تھا۔ "ٹھیک تو ہیں.....؟"
"جی۔"
"شاباش۔ ٹھیک ہی رہیے گا۔ ٹھیک رہنے کے بھی خاصے فوائد ہوتے ہیں۔"
وہ کہہ رہا تھا۔ دُرِ مکنون نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اور واپس پلٹنے کو تھی کہ ولی نے اسے پکار کر روک لیا۔
"ارے محترمہ جا کہاں رہی ہیں۔ دیکھیے تو میں کیا لایا ہوں.....؟" دُرِ مکنون نے مڑ کر استفہامیہ تحیر سے اسے دیکھا۔
بھلا عکرمہ کا دوست اس کے لیے کیا لا سکتا تھا۔
ابھی وہ حیرت سے سوچ ہی رہی تھی کہ ولی مڑ کر سینٹرل ٹیبل پر رکھا ایک شاپر اٹھا لایا۔ جس پر عکرمہ کی بھی نظر نہیں پڑی تھی۔
اس کے پاس آ کر شاپر اس کی طرف بڑھایا۔
"یہ لیجیے۔"
"جی..... میں؟" اسے اچنبھا ہوا تھا۔
"جی..... آپ۔" وہ اسی کے انداز میں بولا۔
دُرِ مکنون نے استفہامیہ نظریں عکرمہ کی طرف اٹھائیں۔ گویا وہ اجازت طلب کر رہی تھی۔
عکرمہ نے سر کے اشارے سے جواب دیا تو ولی نے معنی خیز مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔ جواباً وہ اسے گرم نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔
"کھول کر دیکھ لیں۔ بخدا اس میں بم نہیں ہے۔"
"جی۔"
اسے کہنا ہی پڑا۔ شاپر میں کیک کا ڈبا تھا۔
"ان فیکٹ کل مابدولت کی باقاعدہ بات طے کر دی گئی ہے۔ اس گھامڑ سے اپنی خوشی شیئر کرنے آیا تھا۔ دادی تو ہیں نہیں سوچا ان کی جگہ آپ کو یہ شاپر پکڑا دوں۔ یوں بھی خواتین کو ہی ان چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔"
کیک کا ڈبا نکال کر اس نے سوالیہ نظر اٹھائی تو ولی شروع ہو گیا تھا۔
خبر خوشی کی تھی۔ عکرمہ اٹھ کر ان دونوں کے پاس چلا آیا اور اس کے شانے کو تھپک کر مبارک باد دی۔ اب دونوں کی نظریں دُرِ مکنون پر آ رکیں۔
"مبارک ہو آپ کو۔" بالآخر دُرِ مکنون کو بھی بولنا ہی پڑا۔
"تھینکس۔" وہ کھل کر مسکرایا تھا۔
دُرِ مکنون نے نوٹ کیا اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح شوخی کا راج تھا۔ چمکتی آنکھوں میں شریر سی معنی خیزی تھی۔
"مبارک باد کا تو واقعی میں مستحق ہوں کیونکہ اسی بہانے آج آپ کی آواز تو سننے کو ملی۔ ورنہ میں تو ساری زندگی dumb ہی سمجھتا رہتا آپ کو۔"
وہ کہہ رہا تھا۔ حالانکہ پہلی بار فون پر سنی تھی اس کی آواز۔

دُرِ مکنون کی کشادہ آنکھیں اس درجے بے تکلفی پر پھیل ہی گئیں۔
"جی.....؟" بے اختیار منہ سے نکلا تھا اس کے۔
"ولی۔" عکرمہ نے تنبیہی انداز میں اسے پکارا مگر اسے پروا کہاں تھی۔ ہنس کر اس سے بولا۔
"جی ہاں، کچھ غلط نہیں کہا میں نے۔"
وہ آج دُرِ مکنون سمیت عکرمہ کو بھی حیران کیے دے رہا تھا۔ عکرمہ نے اس بار باقاعدہ گھورا۔
"ویسے بولا کریں۔ بقول شاعر

بات کیجیے کہ یہ فطرت انساں ہے شکیب
جالے لگ جاتے ہیں جب بند مکاں ہوتا ہے

بات کرنا بھی خاصا دلچسپ عمل ہوتا ہے کبھی کر کے دیکھیے گا۔"
فقرہ مکمل کر کے وہ مسکرایا تو وہ دل گرفتگی سے سر جھکا گئی۔
"بولنے کے لیے، بات کرنے کے لیے کچھ ہو بھی تو۔"
"ولی، ہم چلیں اب۔ غالباً ابھی تھوڑی دیر پہلے تم میرے ساتھ کہیں جانا چاہ رہے تھے۔" دانت پیستے ہوئے عکرمہ نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گویا وارننگ دی۔
"نہیں، اب میرا قطعاً موڈ نہیں۔ آج میں خوش ہوں اور اتنی دور تم سے "ان" سے۔" دُرِ مکنون کی طرف اشارہ کیا۔ "اپنی خوشی شیئر کرنے آیا ہوں۔ لہٰذا اصولاً میری خاطر تواضع کرنی چاہیے تم دونوں کو۔"
اس نے ملامت کرتی نظروں سے اسے دیکھا تو عکرمہ کا دل چاہا مزید ایک ہاتھ جڑ دے اسے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دُرِ مکنون گھبرا جائے۔ مگر ولی جیسے نظروں کی زبان سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔
"آپ بیٹھیے میں کچھ لاتی ہوں۔" بالآخر وہ بولی تو دونوں نے ہی چونک کر قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔
اظہار بھائی کی موجودگی میں جو لڑکی وحشت زدہ ہرنی کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ اس لمحے ولی کے سامنے رسان سے بولتی عکرمہ کو بھلائے حیرت کر رہی تھی۔
"زہے نصیب۔" ذرا سا جھک کر وہ کارنش بجالایا تھا۔
دُرِ مکنون کے لبوں کی تراش میں سادہ سی مسکراہٹ اتر آئی۔
"کوئی مفرح اور مقوی قلب قسم کا مشروب لائیے گا سسٹر۔ کیونکہ آپ کے جاتے ہی یہاں کا ٹیمپریچر خاصا ہائی ہونے کا اندیشہ ہے۔"
گرم نظروں سے اپنی جانب دیکھتے عکرمہ کو دیکھ کر خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کرتا وہ بولا تو دُرِ مکنون نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔
اسے ولی کا "سسٹر" کہنا بہت اچھا لگا تھا۔ اور یہ سادہ سی مسرت اس کی آنکھوں سے جھلک گئی تھی۔
عکرمہ نے نوٹ کیا کہ وہ ولی سے خوفزدہ ہے۔ اور نہ ہی متنفر ہے۔ گزرے دنوں میں اس کی مسلسل اور متواتر آمد نے گویا دُرِ مکنون کی گھبراہٹ اور اس کی سراسیمگی جیسے جذب کر لی تھی۔
غالباً اس میں ولی کی شوخ اور شفاف نیچر کا ہاتھ تھا۔
دُرِ مکنون نے عکرمہ کو سوالیہ نظر سے دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"نہیں، میرے لیے کچھ مت لائیے گا۔ میں نے کچھ دیر پہلے ہی چائے پی ہے۔"
جواباً وہ سر ہلا کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جواب مل گیا تھا اسے۔

''ماشاءاللہ کیا سائنٹفک کمیونی کیشن ہے۔'' ولی کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تھی۔
''انتہائی فضول شخص ہو تم۔'' اس بار عکرمہ نے شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
''لو اس میں فضول گوئی کی کیا بات ہے۔ میں نے تو صرف تعریف کی ہے۔'' وہ ولی ہی کیا جو شرمندہ ہو جائے۔ کندھے جھٹکتا وہ عکرمہ کی تیز نگاہوں کو اگنور کرتا صوفے پر آ بیٹھا تھا۔ انداز تو جملی تھا۔
''ویسے کیا واقعی یہ موصوفہ منہ میں زبان رکھتی ہیں۔ مجال ہے جو میں نے کچھ بولتے سنا ہو انہیں۔''
''تمہاری زبان بند ہو گی تو اگلا کچھ بول سکے گا ناں۔ تم تو نان اسٹاپ شروع ہو جاتے ہو۔''
اس نے طنزیہ انداز میں جھاڑ پلائی تو ولی شان سے ہنس پڑا۔
''مگر دیکھ لو۔ بالآخر آج میں نے اس چھوٹی سی لڑکی کو بولنے پر مجبور کر ہی لیا۔'' وہ اپنی کارگزاری پر بڑا خوش تھا۔
عکرمہ کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی تھی۔ ساتھ ساتھ تاڑا بھی۔
''لڑکیوں کو دیکھ کر پھسلنے کی عادت پرانی ہے تمہاری۔ کم از کم اب تو سدھر جاؤ۔ شادی کرنے جا رہے ہو چند ماہ میں۔''
''واہ، واہ۔ کیا مزاج آشنائی ہے۔ ارے میں تمہارا بچپن کا دوست ہوں اور تم مجھے بس اتنا ہی سمجھ سکے ہو۔ دُرِ مکنون کو چھوٹی سسٹر سمجھتا ہوں میں..... اور تم یہ خرافات بک رہے ہو۔''
ولی یک دم برا مانا گیا تھا۔ خشک لہجے میں کہا تو وہ درحقیقت شرمندہ سا ہو گیا۔
''اچھا، اچھا۔ اب زیادہ dramatic ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اپنی ندامت کو اس نے بے نیازی میں چھپا لیا تھا۔
ولی نے زوردار دھپ رسید کرنی چاہی مگر کچن سے برآمد ہوتی دُرِ مکنون کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔
''بہت شکریہ سس، ایک دو ہفتے میں، میں انوٹیشن کارڈ لاؤں گا۔ آپ اور دادی بالخصوص انوائٹڈ ہیں۔ یہ نامعقول آئے نہ آئے آپ کو ضرور آنا ہے۔'' چاکلیٹ شیک کا گلاس تھامتے ہوئے وہ بہت خلوص سے بولا تھا۔
''یوں بھی میں چاہتا ہوں کہ رجا کو آپ سے ضرور ملواؤں۔ کچھ وہ آپ کو بولنا سکھا دے گی۔ اور کچھ آپ اسے خاموش رہنے کی ٹریننگ دے دیجیے گا۔'' گلاس لبوں تک لاتے، لاتے بھی وہ بولنے سے نہیں چوکا تھا۔
اس بار عکرمہ سمیت دُرِ مکنون بھی بے ساختہ امڈ آنے والے تبسم کو چھپا نہ سکی تھی۔
''گو کہ میں خواتین کی آزادیِ گفتار کا خاصا حامی ہوں مگر ہوں تو ابن آدم ہی۔''
شیک مزے دار تھا۔ کچھ اس وقت ولی کا موڈ بھی اچھا تھا۔ لہٰذا بولتا رہا۔
دُرِ مکنون اب وہاں سے جانا چاہ رہی تھی۔ اسے پر تولتا دیکھ کر عکرمہ نے اسے مخاطب کر لیا۔
''دُرِ مکنون۔''
''جی۔''
''آپ کچھ پڑھ رہی تھیں نا؟''
''جی۔''
''تو پھر جایئے اپنی پڑھائی continue کریں۔ ہم اب نیچے جائیں گے اینڈ تھینکس کہ آپ نے اس گھامڑ کے لیے زحمت کی۔'' رسان سے کہتے ہوئے اس نے گویا اس کی مشکل آسان کی۔
''جی اچھا۔'' سر ہلا کر وہ ایک بار پھر دادی کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔
عکرمہ سے کچھ پوچھنے کے لیے باہر آئی تھی۔ مگر ولی کی موجودگی کے باعث اس نے اس معاملے کو پھر کسی وقت

کے لیے اظہار کیا۔

''ماشاءاللہ، کیا سعادت مندی ہے۔'' خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے ولی کہنے سے باز نہیں آیا تھا۔

''چلیں نیچے۔''

اس نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بات نظر انداز کی تو یک دم ولی کے چہرے پر قدرے شوخی اور معنی خیزی در آئی ابھی وہ کچھ کہنے کا قصد ہی کر رہا تھا کہ عکرمہ بول اٹھا۔

''خبردار کوئی فضول بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ مزید کچھ اول فول بکا تم نے تو سر اتار کر رکھ دوں گا تمہارا۔''

اسے اندازہ تھا کہ ولی کے شیطانی ذہن میں پھر کوئی بات آ گئی ہے۔ لہٰذا آنکھیں دکھاتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں متنبہ کیا۔ جس پر ولی کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

''مرضی ہے یار، میں تو تمہارے بھلے کو ہی کچھ کہنے لگا تھا۔'' شانے اچکاتے ہوئے وہ بے نیازی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''قطعاً ضرورت نہیں میرے ''بھلے'' کی فکر کرنے کی۔'' انگلی اٹھا کر خبردار کیا تو ولی بہ مشکل اپنی معنی خیز مسکراہٹ ضبط کرتا۔ اس کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

چچا جان بھی واپس آ چکے تھے۔

کچھ ٹائم ان سے احوال پرسی کر کے جس وقت وہ ''شیرازی ولا'' سے باہر نکلا عکرمہ اسے سی آف کرنے باہر تک آیا۔

''ویسے تم نے بتایا نہیں کہ آنسہ خولہ کے لیے انکار کیوں کیا تم نے؟'' کافی دیر کا رکا سوال ولی کے لبوں پر بالآخر آ ہی گیا۔

عکرمہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ اس طرف بھی شوخی ندارد تھی۔ اس نے گہری سانس کھینچی۔

''ایسی کوئی خاص وجہ نہیں۔ زندگی میں ہر کوئی ہمارے لیے نہیں ہوتا۔ بس کہیں، کہیں کبھی کبھار ہی یہ کڑیاں جڑتی ہیں اور یہی سچ ہے۔'' اس کے گہرے لہجے میں کچھ تھا۔

ولی نے عمیق نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔

''کہیں اس کی وجہ ''کوئی'' اور تو نہیں۔'' خلافِ معمول ولی اس وقت نہایت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

عکرمہ نے استعجابیہ انداز سے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھ نہ سکا ہو۔

''معنی.....؟''

''معنی یہ میرے بھائی کہ کہیں تمہارے دل کو ''کوئی'' اور تو اچھا نہیں لگنے لگا۔'' گھوم پھر کر ولی پھر سے وہیں آ گیا تھا۔

عکرمہ کے چہرے پر بیزاری در آئی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ اگر ہوا تو سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گا۔'' فی الواقع وہ چڑ گیا تھا۔

جواباً ولی کے چہرے پر پھر سے معنی خیز شوخی اتر آئی تھی۔

''مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو جان ہی گیا ہوں۔ بقول شاعر

کون کہتا ہے محبت کی زباں ہوتی ہے
یہ حقیقت تو نگاہوں سے بیاں ہوتی ہے''

ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ خاصے شاعرانہ موڈ میں شعر پڑھ کر بولا۔ ''خود سے سوال کرو، سمجھے۔''

ولی کی زبان کے آگے خندق تھی۔

اس بار تحمل کا مظاہرہ کرنا ذرا مشکل رہا اور عکرمہ کا بھاری ہاتھ اس کا مزاج ایک بار اور دریافت کر گیا تو وہ اس کے جارحانہ موڈ کا اندازہ کر کے بھاگ نکلا۔

(جاری ہے)

مکینِ دل

دانیہ آفرین

ٹائٹ جینز پہنے ڈھیلے ڈھالے بلیک کرتے پر سیاہ اسکارف گلے میں ڈالے، لمبے بھورے سلکی بالوں کو کیچر میں جکڑے وہ کاریڈور سے گزرتی اردگرد کے لوگوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی..... یہاں آئے اسے ابھی تین ہی دن ہوئے تھے۔ یہاں کے ماحول، یہاں کے لوگوں سے وہ یکسر انجان تھی۔ لوگوں کو تکتے ہوئے سوچوں میں گم اپنی ہائی ہیل کی ٹک ٹک کے ساتھ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اچانک ایک پرائیویٹ روم کے

not a breast milk substitute

آگے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم رکے تھے۔ادھ کھلے دروازے کے اندر سے آتی مرد کی زار و قطار رونے کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا..... اس نے اندر جھانکا تو خاکی وردی میں ایک شخص بیڈ کے پاس کھڑا روتا ہوا نظر آیا..... تجسس کے مارے وہ خود کو اندر جاتے سے نہ روک پائی۔

''ایکسکیوزمی!'' حنین نے کمرے میں ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر اسے مخاطب کیا..... مگر مخاطب اردگرد سے بے نیاز بیڈ پر لیٹے ساکت وجود کو دیکھ کے رونے میں مصروف تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' اب کی بار اس نے اپنے بائیں جانب کھڑی نرس کو مخاطب کیا۔

''ان کی مدر ایکسپائر ہو گئی ہیں.....'' افسردگی سے بتاتے ہوئے نرس سامان سمیٹنے لگی۔

''اوہ.....'' حنین دکھ سے ساکت وجود کو دیکھنے لگی..... وہ جانے کے لیے مڑنے ہی لگی تھی کہ اس شخص کے رونے میں اور شدت آ گئی..... اسپتال کا عملہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا..... کچھ دیر رو چکنے کے بعد وہ ایسے سسکیاں لے رہا تھا۔ حنین حیرت سے تکتے ہوئے اس کی طرف چلی آئی۔

''مسٹر آپ کے یونیفارم پر لگے بیجز دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ! آرمی کیپٹن ہیں، مجھے حیرت ہو رہی ہے آپ کو اس طرح دیکھ کر، آپ لوگوں کی ٹریننگ تو اتنے سخت طریقے سے ہوتی ہے کہ آپ لوگوں کو ایموشن لیس بنا دیا جاتا ہے.....'' حنین اس کے عین سامنے آ کے کھڑی ہو گئی۔

مقابل نے سر اٹھا کے حیرت سے اس انجان لڑکی کو دیکھا۔

لمحے کو وہ شخص خاموش ہوا تھا..... مگر پھر کچھ ہی دیر بعد کمرے میں اس کی سسکیاں گونجنے لگیں۔

''مسٹر آپ اتنے کم ہمت ہو کے آرمی میں کیا کر رہے ہیں؟'' حنین نے اب کی بار اس کی آنکھوں میں

''ماں کو کھونے کے درد کا تعلق، ہمت یا آرمی ٹریننگ سے نہیں ہے۔ یہ وہ نقصان ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے..... یہ احساس کتنا جان لیوا ہے کہ اب میرے لیے کوئی پر خلوص دعائیں کرنے والا نہیں رہا..... میڈم آپ کیا جانیں یہ وقت کیسا قیامت خیز ہوتا ہے۔ جس پر پڑتی ہے وہی جانتا ہے۔'' تلخ لہجے میں کہتے ہوئے وہ اپنی ماں کے جسد خاکی کے ساتھ لیے کمرے سے نکل گیا تھا۔

پیچھے کھڑی حنین کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا ہو..... خود کو بہ مشکل گھسیٹتے ہوئے تلخ یادیں ساتھ لیے وہ سی ایم ایچ اسپتال سے باہر آ گئی۔

☆☆☆

سیاہ بادلوں کی چادر نے آسمان کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ دریا کے کنارے بیٹھے لوگ موسم کو انجوائے کرتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے..... خوشگوار موسم کی وجہ سے دریا پر اس وقت لوگوں کا خاصا رش تھا۔

قدرے پُرسکون جگہ پر کونے میں تنہا بیٹھی وہ دریا کے شفاف پانی میں اپنا عکس تلاش کر رہی تھی..... خود کو دریافت کر لینے کی تگ و دو نے اسے بری طرح تھکا ڈالا تھا..... زخموں سے چور روح لیے وہ کسی مسیحا کی تلاش میں تھی..... کوئی ایسا مسیحا جو اس کی ذات میں چبھی تمام کرچیوں کو چن کے ان زخموں پر مرہم رکھ دے، زخموں سے رستا خون اسے روز بروز کمزور کر رہا تھا..... ماضی میں کھوئے، سوچوں سے لڑتے نہ جانے اسے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ ننھے سے پانی کے قطرے نے اسے سوچوں کے سمندر سے کنارے پر لا کھڑا کیا تھا..... موتی اس کے گلابی لبوں کو اور دلکش بنا رہا تھا۔

رحمت کے موتی اب تواتر سے اس کے نرم و نازک چہرے اور دودھیا ہاتھوں پر گر رہے تھے..... برستی بوندوں میں یکا یک تیزی آ گئی تھی جیسے وہ تمام دکھوں کو دھو ڈالنا چاہتی ہوں..... تمام تلخ یادوں کو بہا دینا چاہتی ہوں۔

آسمان پر نگاہ ڈال کے اس نے ایک طویل سانس

تنہا سفر کتنا کٹھن ہوتا ہے یہ کوئی اس سے پوچھتا..... چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی وہ اپنی کار کی طرف بڑھنے لگی..... اچانک اس کا سر کسی فولادی شے سے ٹکرایا اور..... وہ اپنا سر تھام کے رہ گئی..... دکھتے سر کو اپنے بائیں ہاتھ سے دباتے اس نے نظریں اٹھائیں تو چونک گئی۔ مقابل کی بھی اس پر نظریں پڑتے ہی آنکھوں میں شناسائی کی رمق ابھری تھی۔

"شاہ ویز یار، تم یہاں کھڑے ہو میں تمہیں....."

عقب سے آنے والی آواز پر دونوں چونکے تھے۔

"ارے تم۔"

آنے والے کی آواز سے حیرت اور خوشی بیک وقت دونوں جھلک رہی تھی۔

حنین نے مڑ کے دیکھا تو اس کے بھی لب حیرت سے وا ہو گئے۔

"علی بھائی آپ.....!" حنین کی آواز خوشی سے لریز تھی۔

"ہنی میں بتا نہیں سکتا تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے کس در خوشی ہو رہی ہے....." علی اسے فرط مسرت سے دیکھ رہا تھا۔

"علی بھائی آئی ایم سو ہیپی....." (میں بہت زیادہ خوش ہوں) حنین بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی اس کے لالی رخسار خوشی سے تمتما رہے تھے۔

"اوہ سوری شاہ ویز ہنی پاپا کے بیسٹ فرینڈ حامد ل کی بیٹی اور میری بہت اچھی دوست ہے....."

خاموش کھڑے شاہ ویز کو دیکھ کے اس نے تعارف روایا۔

"ہنی، شاہ ویز میرا بہت اچھا دوست ہے ہم دونوں پوسٹنگ آج کل یہاں ہی ہے....." حنین سے طب ہو کے اس نے شاہ ویز کا بھی تعارف کروایا۔

حنین نے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا، وہ بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ لمحے کے لیے دونوں کی نظروں کا ادم ہوا تھا، حنین نے خفت سے پلکیں جھکا لیں۔

کرتے ہیں....." علی نے دونوں سے مخاطب ہو کے کہا۔

"اس موسم میں؟" حنین نے آسمان سے برستی بوندوں کو دیکھ کے کہا۔

"یار اسی موسم میں تو مزہ آتا ہے۔" علی خاصا پُرجوش نظر آ رہا تھا۔

"نہیں علی....." کافی دیر سے خاموش کھڑے شاہ ویز نے مداخلت کی۔

"بور لوگو! اچھا چلو گرما گرم مچھلی تو کھا لو کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو سر دریا بھی آئے اور یہاں کی مچھلی کھائے بغیر واپس چلا جائے....." علی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کنجوسو! فکر مت کرو میں اپنے خرچے پر تم دونوں کو مچھلی کی دعوت دے رہا ہوں....."

علی نے دونوں کو اپنی، اپنی جگہ کھڑے تذبذب کا شکار دیکھا تو منہ بنا کے کہا۔

شاہ ویز کا ہلکا سا قہقہہ مدھر ہوا کے ساتھ شامل ہو گیا..... حنین کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی، یکا یک سر دریا خوب صورت مسکراہٹوں سے جھلملا اٹھا۔

شاہ ویز، علی کے ساتھ آگے بڑھ گیا حنین دونوں کے پیچھے آہستہ، آہستہ چلتی بارش کی بوندوں کو اپنی مٹھی میں قید کرتی ان کی تقلید میں آگے بڑھنے لگی۔

حسین موسم میں من پسند ساتھیوں کے ہمراہ دریا کے کنارے تازہ مچھلی کا سواد دُگنا ہو گیا تھا..... علی اپنے چٹکلوں اور کارناموں سے ان دونوں کو خوب محظوظ کر رہا تھا..... ہنس، ہنس کے حنین کا برا حال تھا..... وہ بار، بار اپنی آنکھوں کے گوشوں میں آئی نمی صاف کر رہی تھی..... بارش تھم چکی تھی..... بارش کے بعد موسم اور دلکش ہو گیا تھا..... علی کی کسی بات پر حنین تادیر ہنستی رہی تھی اس بات سے بے خبر کہ دو سنہری آنکھیں اس کے گلنار چہرے کا احاطہ کیے ہوئی ہیں..... ایک خوشگوار دن گزار کے تینوں واپس لوٹ گئے۔

☆☆☆

چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کی ٹیبل کے قریب ہی کھڑا تھا۔
"ارے شاہ ویز آپ۔" حنین نے حیرت سے کہا۔
"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" شاہ ویز نے اس کے سامنے والی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
"ضرور۔" حنین نے بھی مسکرا کر کہا۔
"آپ یہاں اکیلے؟" بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔
"جی، ہوٹل کے روم میں بور ہو گئی تھی اس لیے یہاں آ گئی....." حنین نے بات بنائی۔
"کس ہوٹل میں رکی ہیں آپ؟" شاہ ویز نے ویٹر کو اشارے سے مینیو لانے کا کہا۔
"ولٹن۔" حنین نے مختصر اجواب دیا۔
"ارے وہاں آپ بور ہو گئیں..... حیرت ہے.....!"
شاہ ویز نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔
حنین نے نظریں اٹھا کے دیکھا اس کے لبوں پر مسکراہٹ ایسے محسوس ہو رہی تھی جیسے افق پر چمکتا چاند۔
"کیا دیکھ رہی ہیں۔ مجھے پتا ہے میں بہت ہینڈسم ہوں....." شاہ ویز نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجا کے شرارت سے کہا۔
"سوری....." حنین اپنی حرکت پر خفیف ہو گئی۔
"کیا کھانا پسند کریں گی؟" شاہ ویز نے مینیو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
"میرا لنچ کا موڈ نہیں ہے....." حنین نے صاف گوئی سے کہا۔
"فکر مت کریں لنچ میری طرف سے ہے۔ آج ہم آپ کے میزبان ہیں۔"
اس کی بات پر حنین مسکرائی۔
"یہاں کا پزا بہت مزے کا ہوتا ہے، کیا خیال ہے پزا آرڈر کر لیں؟" مینیو پر نظر ڈالتے ہوئے شاہ ویز نے پوچھا۔
"جو آپ کو مناسب لگے، میزبان تو آپ ہیں....." حنین نے اسی کا جملہ دہرایا۔
"کریکی پزا آپ کو پسند آئے گا....." اس نے مسکرا کے کہا اور پھر ویٹر کو آرڈر نوٹ کرانے لگا۔
کھانے کے انتظار کے دوران دونوں ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد ویٹر گرما گرم کریکی پزا لیے ان کی ٹیبل کی طرف آ گیا۔
"چلیں جی شروع ہو جائیں۔" پزا کا پیس شاہ ویز نے اس کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔
"شاہ ویز مجھے آپ سے اپنے اس دن والے رویے پر ایکسکیوز کرنا ہے....."
کانٹے اور چھری کی مدد سے پزا کھاتے ہوئے حنین نے سنجیدگی سے کہا۔
"اٹس اوکے حنین، اس واقعے کو اپنے ذہن سے نکال دیجیے....." شاہ ویز نے بھی قدرے سنجیدہ ہو کے کہا۔
حنین نے ایک طویل سانس لی اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی..... لنچ کے دوران بھی دونوں گفتگو کرتے رہے ایک دوسرے کے مشاغل جانتے رہے..... بل دے کے دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ دوپہر کی نسبت موسم بہتر ہو گیا تھا..... آسمان پر چھائے سیاہ بادل بارش کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ دونوں موسم کو انجوائے کرتے ہوئے پارکنگ تک آئے اور پھر ایک دوسرے کو الوداع کر کے اپنی، اپنی کار میں بیٹھ کے وہاں سے روانہ ہو گئے واپسی تک دونوں کے درمیان دوستانہ تعلق قائم ہو چکا تھا..... شاہ ویز کے ساتھ وقت بتا کے حنین خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ دماغ کو سب سوچوں سے آزاد کر کے وہ رات بھر بس شاہ ویز کو سوچتی رہی کب نیند اس پر مہربان ہوئی پتا نہ چلا۔

☆☆☆

فون مسلسل بج رہا تھا بیڈ سے بہ مشکل اٹھ کے اس نے مندی آنکھوں سے سیل فون ڈھونڈا۔ اسکرین پر نام دیکھ کر yes کر کے کان سے لگا لیا۔
"کیا ہوا بھئی اتنی دیر سے کیوں کال اٹینڈ کی؟" ایرپیس سے علی کی چہکتی آواز ابھری۔
"میں سو رہی تھی....." نیند سے چور لہجے میں اس نے جواب دیا۔
"ابھی تک سو رہی تھیں، دوپہر کا ایک بج رہا ہے۔"

علی نے حیرت سے کہا۔

"جی رات میں دیر سے سوئی تھی....." بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے حسین نے جواب دیا۔

"ہفتے کو مام ڈیڈ کی ویڈنگ اینورسری ہے۔ میں نے تمہیں انوائٹ کرنے کے لیے کال کی ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "مام بھی تمہیں یاد کر رہی ہیں اس لیے شرافت سے ہفتے کو ٹھیک آٹھ بجے گھر آ جانا..... آنے میں مسئلہ تو نہیں ہوگا کار ہے ناں تمہارے پاس؟" علی نے بغیر سانس لیے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

"اف علی بھائی آپ کی گاڑی پھر اسٹارٹ ہو گئی۔" حسین نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"گاڑی نہیں تیز گام....." جاندار قہقہے کے ساتھ علی نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں ہفتے کو ٹائم پر آ جاؤں گی....."

اس سے پہلے کہ علی مزید اس کے کان کھاتا حسین نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

سیل فون سائڈ ٹیبل پر رکھ کے اس نے انگڑائی لی اور بستر سے نکل کر واش روم کی طرف بڑھ گئی..... آج بیدار ہونے میں اسے خاصی دیر ہو گئی اپنے مقصد کے سلسلے میں اسے آج ایک اہم شخص سے ملنا تھا۔

☆☆☆

بالآخر دو گھنٹے کی طویل مشقت کے بعد اسے پارٹی کے لیے کوئی ڈریس پسند آ گیا تھا۔

"ایکسکیوزمی" اسے پیک کر دیں۔" وہیں کھڑے سیلز مین کو اس نے مخاطب کیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ڈریس لے کر لڑکے نے تیزی سے بل بنایا اور سوٹ پیک کر کے شکریہ کے ساتھ شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔

شاپنگ کر کے وہ خاصی تھک گئی تھی۔ اس لیے اسنیکس اور کافی کے لیے فوڈ کورٹ آ گئی۔ آرڈر دے کر اس نے بیگ سے اپنا موبائل نکالا اور ایک دو ضروری کالز کر کے آرڈر کلیکٹ کرنے چلی گئی۔ گارلک مائیو فرائز اور بلیک کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ موبائل گیلری دیکھنے لگی..... تصویریں دیکھتے ہوئے اس کی نظر ایک تصویر پر آ کے تھم گئی۔

دلکش لبوں پر مسکراہٹ سجائے شاہ ویز سرد دریاب کے آگے کھڑا تھا..... علی نے کل رات ہی سرد دریاب والی تصویریں واٹس ایپ پر بھیجی تھیں جلدی میں اس نے بغیر دیکھے تھینکس کہہ دیا تھا..... مگر آج اپنے موبائل میں شاہ ویز .... کی تصویر دیکھ کر اسے خوشی ہو رہی تھی۔

ذہن کے خیالوں میں
روح کے اجالوں میں
زندگی کی جھیلوں میں
ذات کی فصیلوں میں
رت جگوں کے دامن میں
دل کے خشک صحرا میں
چشم تر کے دریا میں
درد کے جہاں میں بھی
اشک بے زباں میں بھی
اور کچھ نہیں رہتا
بس یاد تیری رہتی ہے

نہ جانے کیوں یہ شخص حسین کو اپنی طرف کسی مقناطیس کی طرح کھینچ رہا تھا۔ راتوں کو جاگ کے پہلے وہ ماضی کی تلخ یادوں کو سوچا کرتی تھی مگر اب اس کی سب سوچوں کا محور شاہ ویز بنتا جا رہا تھا..... ذہانت سے چمکتی سنہری آنکھیں، دلگداز مسکراہٹ سے سجے لبوں کے سحر میں وہ روز بروز جکڑتی جا رہی تھی..... خود کو وہ بے بس سا محسوس کرنے لگی تھی۔ شاہ ویز کی میٹھی یادیں اس کی جبس زدہ زندگی میں پھوار کا کام دے رہی تھیں۔ زخموں سے چور دل ایک نئی لے پر دھڑکنے لگا تھا..... سوچوں کو جھٹک کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ دل کا کسی نام پر دھڑکنا اکثر خسارے کا باعث بن جاتا ہے۔

ذہن سے سب سوچوں کو جھٹک کر اس نے بیگ اور موبائل اٹھایا اور لفٹ کی طرف بڑھ گئی..... ہر بڑھتے قدم پر دل سرگوشی کر رہا تھا۔

انسان ذہن میں آئی سوچوں کو جھٹک سکتا ہے مگر

مٹی کے پتلے میں جو دھڑکنے کی مشین ہے اس پر اس کا اختیار نہیں' یہ سیلف کنٹرولڈ ہے انسان اس کے آگے بالکل بے بس ہے۔

☆☆☆

خان ولا کا لان اس وقت رنگ و نور میں ڈوبا ہوا تھا۔ خوشیاں مسکراہٹیں ہر سو پھیلی ہوئی تھیں..... مسٹر خان اور مسز خان اپنی سلور جوبلی میں مہمانوں کے استقبال کے لیے خود گیٹ پر موجود تھے۔

"ہائے آنٹی، پپی اینورسری۔" مسز خان کو پنک روزز کا بکے دیتے ہوئے حنین نے مسکرا کے وش کیا۔

"تھینک یو بیٹا۔" اس کے ہاتھ سے بکے لے کر انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔

"بھئی ہم بھی ہیں یہاں۔"

حنین اور مسز خان کو آپس میں ملتے ہوئے دیکھ کر مسٹر خان نے شرارت سے ہانک لگائی۔

"اوہ سوری انکل، ہیپی اینورسری۔" حنین نے ان کی طرف آتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"تھینک یو بیٹا۔" مسٹر خان نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

میزبانوں کے ہمراہ وہ اندر آ گئی..... اس کی نظریں بے چینی سے کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

"ہائے سویٹی۔" اپنے عقب سے آتی علی کی آواز پر وہ یک دم چونکی۔

"ہائے علی بھائی۔" حنین نے بہ مشکل مسکرا کر کہا۔

اسے یہاں نہ پا کے حنین کا دل بجھ گیا تھا۔

"لگ رہا ہے آج تو پرستان کی کسی پری نے غلطی سے خان ولا کا رخ کر لیا ہے، آج تو حشر برپا کر رہی ہو۔" علی نے اس کا..... بغور جائزہ لیتے ہوئے آنکھیں سکیڑ کر کہا..... حنین اس کی اس بے تکلفی پر جھینپ گئی۔

"علی بھائی آپ کے دوست نظر نہیں آ رہے۔" دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کون..... شاہ ویز؟" علی چونکا۔

"جی۔" حنین نے آہستگی سے کہا۔

"آ جائے گا۔" علی نے بے پروائی سے کہا اور پھر ایکسکیوز کر کے دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھ گیا..... حنین نے علی کا بدلتا لہجہ محسوس کیا تھا۔ تھکے قدموں سے وہ کونے میں ایک میز پر آ گئی آج صبح سے وہ کتنی ایکسائٹڈ تھی۔ شاہ ویز سے ملاقات کا سوچ کے اس کا دل آج معمول سے ہٹ کے دھڑک رہا تھا۔

"السلام علیکم!" ڈنر سوٹ میں بالوں کو سلیقے سے جمائے آنکھوں میں چمک اور لبوں پر مدھر مسکراہٹ لیے وہ اسی سے مخاطب تھا۔

"آپ نے سلام کا جواب نہیں دیا۔"

شاہ ویز نے خود کو یک ٹک دیکھتی حنین سے مسکرا کر کہا اور اس کے برابر والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"اوہ..... وعلیکم السلام۔" حنین ہوش میں آئی تھی۔

"آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟" اس نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں پوچھا۔

اس لمحے حنین کو لگا جیسے چاند کے ہمراہ تاروں کی پوری بارات زمین پر اتر کے آ گئی ہو..... ہر سو نور پھیل گیا ہوا کوئی مدھر گیت گا رہا ہو، پھول اپنی مہک فضا میں بکھیر رہے ہوں۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔" حنین کو خاموش پا کے شاہ ویز نے کہا۔

"وہ مجھے شور پسند نہیں ہے۔" حنین کی آواز میں ہکلاہٹ واضح تھی۔

"حنین آپ دیسی لباس میں بہت گریس فل لگ رہی ہیں۔" شاہ ویز نے لمحے بھر کو اسے بغور دیکھا پھر نظریں پھیر لیں..... اس کی تعریف پر حنین کے رخسار شرم سے سرخ ہو گئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شاہ ویز کا علی سے موازنہ کرنے لگی..... دونوں کی نگاہوں اور لفظوں میں کتنا فرق تھا..... ایک کی نگاہیں بے باک تھیں اور ایک کی نظریں احتراماً جھکی ہوئی۔

"چلیں، انکل آنٹی کیک کاٹ رہے ہیں اس طرف چلتے ہیں۔" شاہ ویز نے اس کی توجہ ٹرالی پر سجے کیک اور اس کے آگے کھڑے خوش باش مسٹر اینڈ مسز

خان کی طرف مبذول کروائی۔

حنین اس کے ہمراہ چلتے ہوئے انکل اور آنٹی کے پاس آ گئی..... تالیوں کی گونج اور مبارک باد کے شور میں کیک کٹا..... کیک کے بعد پر تکلف کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا..... حنین نے شاہ ویز کے ساتھ ہی کھانا کھایا..... شاہ ویز کی ہمراہی میں وہ بہت خوش تھی..... خوشی اس کے انگ، انگ سے پھوٹ رہی تھی اردگرد سے بے نیاز وہ ان یادگار لمحات کو اپنی خوشیوں کی پوٹلی میں مقید کر رہی تھی..... اس بات سے بے خبر کہ دو سیاہ آنکھیں ناگواری سے مسلسل ان دونوں کو دیکھ رہی ہیں۔

☆☆☆

وہ ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ اچانک موبائل کی اسکرین روشن ہوئی۔ وائبریشن پر اس نے ٹیبل سے موبائل اٹھایا اسکرین پر چمکتے نام کو دیکھ کے اس نے لیس کر لیا۔

"بہتی جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں تمہیں ڈنر کے لیے پک کرنے آ رہا ہوں۔" علی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"علی بھائی کوئی خاص بات ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کوئی خاص وجہ ہو گی تب ہی تم میرے ساتھ ڈنر پر چلو گی؟" علی نے سرد لہجے میں کہا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" حنین گڑبڑا گئی۔

"تو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ میں پندرہ، بیس منٹ میں تمہاری طرف پہنچ رہا ہوں۔" علی واپس اپنی ٹون میں آ گیا تھا۔ آج وہ خاصا پُرجوش لگ رہا تھا۔

"علی بھائی اور کون ہو گا آئی مین شاہ ویز....." نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پوچھ بیٹھی۔

"نہیں وہ نہیں ہو گا۔" علی کچھ لمحے خاموش رہا پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔

"اوہ اچھا۔" حنین نے بجھے لہجے میں کہا۔

وہ شاہ ویز سے ملنے کا سوچ کے خواہ مخواہ خوش ہو رہی تھی۔

"علی بھائی ڈونٹ مائنڈ مجھے ایک بہت ضروری

غزل

دل مضطرب تو سنبھل بھی جا کوئی حشر اب یوں بپا نہ کر
وہ جو زخم گہرا تھا بھر گیا اب پھر سے اس کو ہرا نہ کر
ہوئی اجنبی وہ جو راہ تھی اس راہ کو اب کریں گے کیا
وہ ہے ہم سفر کسی اور کا اب راہ اس کی تکا نہ کر
میں ہوں بد دعا کے حصار میں تو بچا کے رکھ اپنی ہر خوشی
مجھے ٹوٹ کر تو بکھرنے دے میرے حق میں کوئی دعا نہ کر
مجھے چھوڑنا ہے تو چھوڑ دے یونہی مجھ سے ہو کے خفا نہ پھر
ہیں اگر ملنے سے یہ رنجشیں مجھے دوست میرے ملا نہ کر
کیوں نہیں ہوں تجھ کو عزیز اب ہوں بنی میں سایۂ درد جو
تو بچا کہ دکھ بھرا آشیاں یونہی بخت اپنے سیاہ نہ کر
تجھے چھوڑ کر میں ہوں جس کرب میں اِک تو ہی جانتا ہے یہ غم
تیرے دل کی بھی تھی تو یہی رضا اب یوں مجھ سے گلہ نہ کر

انتخاب: نائلہ راٹھور، لاہور

کام ہے پھر کبھی چلیں گے۔" اس نے معذرت کی۔

حنین کے منع کرنے پر علی نے بغیر اللہ حافظ کہے فون بند کر دیا تھا۔ حنین نے ایک طویل سانس لی۔ نہ جانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ دل بس ایک شخص کی طلب کرنے لگا تھا۔ دنیا ویران ہی لگنے لگی تھی..... مگر علی کا رویہ اس کے لیے کسی اچنبھے سے کم نہ تھا۔

نادان لڑکی رقابت کے دھویں کی بُو نہ سونگھ پائی۔

☆☆☆

آج وہ سارا دن گاڑی لیے پھرتی رہی تھی ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر ناکامی لے کر واپس لوٹ گئی۔

خود کو دریافت کرتے کرتے تھکنے لگی تھی اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ کمرے میں آ کے اس نے ہینڈ بیگ بیڈ پر پھینکا اور خود بھی ڈھے گئی۔ زندگی روز بروز اس کے لیے کٹھن ہو رہی تھی بے بسی سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دروازے پر ہونے والی دستک پر وہ چونکی تھی کھانے کا آتے ہوئے وہ ریسپشن پر منع کر آئی تھی پھر

اس وقت کون آیا تھا۔

"آپ.....!" حیرت سے اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"حنین میں شاہ ویز ہی ہوں کوئی بھوت نہیں، اندر نہیں آنے دیں گی آپ مجھے۔" اس کے حیران چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے شاہ ویز نے کہا۔

"اوہ سوری، پلیز آیئے۔" اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ سائڈ میں ہوگئی۔

"پلیز یہاں بیٹھ جائیں۔" شاہ ویز کو بیڈ کی طرف بڑھتا دیکھ کے اس نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے شرمندگی سے کہا۔ ہینڈ بیگ فائل گاڑی کی چابیاں، موبائل بیڈ پر بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھا جو کچھ دیر پہلے جھلاہٹ سے اس نے پھینکے تھے۔

"کیا لیں گے آپ.....؟" شاہ ویز کی توجہ بیڈ سے ہٹانے کے لیے اس نے فوراً پوچھا اسے فائل کی فکر تھی کہ کہیں شاہ ویز وہ فائل نہ دیکھ لے۔

"بلیک کافی۔"

"حنین پہلے تو معذرت کہ میں آپ کے روم تک آگیا ویسے آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔" شاہ ویز نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" حنین نے گھبرا کے کہا۔

"آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار واضح ہیں۔" شاہ ویز نے اسے بغور دیکھا۔

"بس کچھ تھکن ہوگئی ہے۔" اس نے نظریں جھکا کے کہا وہ اس شخص سے جھوٹ کیسے بول سکتی تھی۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔

"کیا کر رہی ہیں آج کل آپ؟" شاہ ویز نے خاموشی کو توڑا۔

"جی میں....." وہ ہکلا گئی۔

"جی آپ!" شاہ ویز اسے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اے سی کی ٹھنڈک میں بھی حنین کی ہتھیلیاں پسینے سے نم ہوگئیں۔

"بتائیں حنین آپ یہاں کس مقصد سے آئی ہیں؟" شاہ ویز کا لہجہ سخت ہوا تھا۔ حنین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ سامنے بیٹھا، چہرے پر سختی لیے وہ اسے کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا۔

"شاہ ویز میں کسی غلط مقصد کے لیے یہاں نہیں آئی ہوں۔" حنین نے نم لہجے میں کہا۔

"میں نے پوچھا آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟"

اس کی آواز کمرے میں گونجی تھی۔ حنین نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا جن آنکھوں میں ہمیشہ اس کے لیے نرمی ہوتی تھی آج وہ یکسر اجنبی تھیں اس کے لیے۔

"میں خود کو دریافت کرنے آئی ہوں شاہ ویز صاحب۔" روتے ہوئے اس نے کہا اور اٹھ کے بیڈ سے فائل لا کر اسے دے دی۔

شاہ ویز فائل کھول کے پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ صفحے پلٹتا رہا اس کا چہرہ زرد ہوتا گیا۔

"حنین آپ مجھے پہلے ہی اپنی آمد کا مقصد بتا دیتیں میں آپ کی مدد کر دیتا۔" کچھ دیر بعد شاہ ویز نے بھاری آواز میں کہا۔ حنین نے چونک کے دیکھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے بہت مشکل سے خود پر ضبط کیا ہوا ہو۔

"آپ کی تلاش ختم ہوئی۔" وہ بے ربط بول رہا تھا۔

"میری اور آپ کی امی ایک ہی تھیں۔" اس کا لہجہ بکھرا، بکھرا تھا۔

شاہ ویز کی بات پر حنین کو سو واٹ کا جھٹکا لگا تھا۔ بے یقینی سے وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کے ابو کا آپ کی پیدائش کے تین ماہ بعد ہی ایک ٹریفک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا۔" آپ کے امی ابو نے خاندان کے خلاف جا کر پسند کی شادی کی تھی دونوں کے گھر والوں نے ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ عاصمہ بیگم شوہر کی وفات کے بعد ٹوٹ گئی تھیں گھر میں فاقے تھے وہ سخت پریشان تھیں اپنی تین ماہ کی بیٹی کی زندگی کے لیے انہوں نے اپنے والد سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ وہاں سے انہیں صاف پیغام ملا۔ "اگر واپس آنا چاہتی ہو تو بچی کے بغیر واپس آنا ہوگا۔" عاصمہ بیگم اپنوں کی اس سفاکی پر مزید بکھر گئیں ان کی معصوم بچی کا

کیا قصور تھا۔ گھر والوں کے آگے وہ بہت گڑگڑائی تھیں مگر کسی کو بھی اس معصوم بچی پر ترس نہیں آیا تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس کا باپ ہاشم احمد تھا۔ بلکتے ہوئے وہ واپس اپنے چھوٹے سے گھر میں چلی گئیں جہاں وہ اپنے مرحوم شوہر کے ساتھ رہتی تھیں۔ عاصمہ بیگم کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ کوئی کام بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ بچی کا بھوک سے برا حال تھا اپنی بچی کی زندگی بچانے کے لیے وہ اپنی بچی کے ساتھ ایک فلاحی ادارے میں آ گئیں۔ جب عاصمہ بیگم کے بڑے بھائی کو پتا چلا کہ ان کی بہن فلاحی ادارے میں ہے تو وہ بے چین ہو کے ان سے ملنے آ گئے۔ بھائی نے ان سے گھر چلنے کا کہا مگر وہ اپنی بچی کی وجہ سے مجبور تھیں۔ بہن کی حالت دیکھ کے بھائی نے باپ کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ بھائی نے بالآخر بیچ کی ایک راہ نکالی۔ ان کے ایک دوست بے اولاد تھے۔ انہوں نے عاصمہ سے حتمین کو لے کر انہیں دے دیا اور عاصمہ کو لے کر گھر واپس آ گئے یوں خاندان کی عزت اور بزرگوں کی انا کے ہاتھوں ایک بچی کو ماں سے جدا کر دیا گیا۔ بھائی نے عاصمہ کو تسلی دی تھی کہ بچی صحیح ہاتھوں میں ہے۔ انہیں اپنے دوست پر پورا بھروسا ہے۔ اکثر وہ عاصمہ کو حتمین سے ملانے لے جاتے۔ عاصمہ کے دل کو قرار تو نہیں آیا مگر اپنی بچی کو صحیح ہاتھوں میں دیکھ کے وہ کچھ مطمئن ہو گئی تھیں۔ زندگی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی۔ ایک دن بھائی نے اچانک بتایا کہ ان کے دوست حتمین کو لے کر اچانک امریکا شفٹ ہو گئے ہیں۔ عاصمہ بہت روئیں، بھائی نے تسلی دی کہ وہ دوست سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے کچھ عرصے بعد احمد (بھائی) کے دوست کی شادی میں سب گھر والوں کو دوسرے شہر جانا پڑا۔ سب نے عاصمہ سے بھی چلنے کا بہت کہا مگر وہ شاہ ویز (بھتیجے) کو سنبھالنے کے بہانے رک گئیں دراصل انہیں فکر تھی کہ پیچھے حتمین کا کچھ پتا چلے اور وہ یہاں اگر نہ ہوئیں تو اس لیے سب کے بہت کہنے کے باوجود بھی وہ نہیں گئیں۔ شاید زندگی نے ابھی ان

کے والد، بھائی اور بھابی دنیا سے رخصت ہو گئے یوں عاصمہ سے باپ بھائی کی آخری چادر بھی چھن گئی۔ اس کے بعد اللہ پر توکل کر کے انہوں نے اپنی تمام تر توجہ بھتیجے کی پرورش میں لگا دی۔ باپ بھائی کا چھوڑا ہوا اتنا پیسہ تھا کہ ان کا اور بھتیجے کا بہ آسانی گزر بسر ہو جاتا مگر ان کے دل میں بیٹی کی خلش ہمیشہ ہی اکثر وہ تنہائی میں بیٹی کو یاد کر کے روتی رہتیں۔ شاہ ویز احمد کو کیپٹن بنا کے اپنی بیٹی کو تلاش کرنے کی ذمے داری اسے سونپ کے انہوں نے بالآخر اپنی آنکھیں موند لیں اور دنیا کے سب غموں سے آزاد ہو گئیں۔"

غمناک لہجے میں اس نے اپنی اور سامنے بیٹھی لڑکی حتمین کی داستان سنائی تھی۔ روتے ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پاکستان پہنچنے کے اگلے دن ہی اس نے اپنی ماں کو پا لیا تھا مگر کتنی بدقسمت تھی وہ، اس نے انہیں پا کے بھی کھو دیا تھا۔ وہ پہچان ہی نہ پائی سامنے لیٹا جامد وجود کوئی اور نہیں اس کی سگی ماں تھی۔

☆☆☆

بڑا دشوار ہوتا ہے
ذرا سا فیصلہ کرنا
کہ جیون کی کہانی کو
بیانِ بے زبانی کو
کہاں سے یاد رکھنا ہے
کہاں سے بھول جانا ہے
کسے کتنا بتانا ہے
کسی سے کتنا چھپانا ہے
کہاں رو رو کے ہنسنا ہے
کہاں ہنس ہنس کے رونا ہے
کہاں آواز دینی ہے
کہاں خاموش رہنا ہے
کہاں رستہ بدلنا ہے
کہاں سے لوٹ آنا ہے
بڑا دشوار ہوتا ہے

دن بہت تیزی سے گزر رہے تھے۔ اس نے سب کچھ پا کے بھی کھو دیا تھا..... شاہ ویز سے بچھڑنے کا خیال اسے مزید دکھی کر رہا تھا..... وہ یہاں خود کو تلاش کرنے آئی تھی مگر اپنا دل کسی کو سونپے جا رہی تھی..... اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اپنے لیے خسارہ سمیٹے وہ واپس امریکا جا رہی تھی۔ ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھے اس کی آنکھیں مسلسل بھیگی جا رہی تھیں..... کچھ پانے کی تلاش میں اپنا سب کچھ لٹا دینا کہاں کی عقلمندی ہے..... محبت سکھ، چین سب کچھ چھین لیتی ہے۔ غموں کا تحفہ تھمائے اہلِ دل کو تا حیات تڑپاتی ہے۔

"حنین!" آواز پر چونک کے اس نے سر اٹھایا۔ شاہ ویز سامنے کھڑا تھا۔

"حنین آپ مجھے بتائے بغیر جا رہی تھیں؟" شکست خوردہ لہجے میں اس نے کہا۔

"مجھ میں ہمت نہیں تھی۔" آنسوؤں کو انگلی کی پور سے صاف کر کے اس نے جواب دیا۔

"کس بات کی ہمت نہیں تھی؟"

شاہ ویز کا لہجہ بجھا، بجھا تھا جو آنکھیں ہمیشہ روشن ہوتی تھیں وہ آج تاریک تھیں۔

"بولیے کس بات کی ہمت نہیں تھی؟"

اسے ہنوز خاموش دیکھ کر اس نے تیز آواز میں پوچھا..... حنین خاموشی سے لب کاٹتی رہی۔ فلائٹ کی اناؤنسمنٹ پر اس نے بیگ اٹھایا اور اندر کی جانب بڑھنے لگی۔

"رک جائیے۔" شاہ ویز کی آواز پر اس کے بڑھتے قدم رکے تھے وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔

"میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔" شاہ ویز چند قدم چل کے اس کے پاس آ گیا کھو دینے کا خوف اس کے چہرے پر واضح تھا۔

"میری ہم سفر بنیں گی؟"

حنین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شاہ ویز نے تھی..... حنین دم سادھے اسے دیکھتی رہی۔ بھلا ایسا کب سوچا تھا اس نے۔ اس کا دل جس کے لیے بے قرار تھا وہ شخص بھی اسی کا طلبگار تھا۔

"بولیے حنین، زندگی کے اس سفر میں میرا ساتھ دیں گی؟" اس کی مسلسل خاموشی پر وہ بے چین ہو گیا تھا..... حنین کو دل کی دھڑکن کانوں میں سنائی دیتی محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ ایسا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں، میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا لیکن یہ جان لیجیے کہ شاہ ویز احمد کی زندگی میں آپ آنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہیں، میں نے آپ کے تصور سے محبت کی ہے بنا دیکھے آپ کو پوجا ہے..... اماں سے صرف آپ کا ذکر سن، سن کے آپ کو اپنے دل میں بسایا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑ گیا..... حنین کی گہری خاموشی سے انکار کا نتیجہ اخذ کر کے وہ مایوسی سے قدم واپسی کو بڑھانے لگا۔

حنین کو لگا اس کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔

"رکیے شاہ ویز..... پلیز.....! میں اپنی زندگی کے سفر میں آپ کا ساتھ چاہتی ہوں۔" بے قراری سے مڑ کر اس نے کہا۔

شاہ ویز نے رک کر مڑ کر اسے دیکھا حنین اس کی منتظر تھی۔

اس کے لب مسکرا اٹھے۔ قدم بڑھاتا ہوا وہ اس کے قریب آ گیا..... دونوں کی آنکھیں خوشی سے نم تھیں۔ شاہ ویز کی ہمراہی میں حنین ائرپورٹ سے باہر آ گئی۔ بہاران کی راہوں میں گل کھلانے کے لیے منتظر تھی۔ محبت کی کونپل جب دل کی زرخیز زمین پر کھلتی ہے تو کوئی بھی یخ موسم اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ علی یہ جان گیا تھا کہ شاہ ویز اور حنین کی محبت نے ازل تک رہنا ہے..... وہ پیچھے ہٹ گیا تھا کہ محبت کی اس ننھی کونپل نے گل و گلزار بننا ہے۔ محبت نے آج انا اور نفرت کو ہرا دیا تھا۔ محبت نے اپنی آمد کے نئے موسم، نئے گل و غنچے کھلا دیے تھے۔

لاحاصل

رفعت شبانہ

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو..... ہیپی برتھ ڈے ٹو یو"
صدائیں چاروں طرف سے آرہی تھیں۔ برقی قمقمے جگمگا
رہے تھے اور خوب رونق لگی ہوئی تھی اور کیوں نہ ہوتی
کیونکہ آج اس گھر یعنی "اشرف ولا" کے مکین کے سب
سے چھوٹے پوتے سلمان کی پانچویں سالگرہ تھی۔ پورا گھر
سجا ہوا تھا۔ کمروں کی لائٹس جگمگا رہی تھیں۔ رنگ برنگے
آنچل لہرا رہے تھے۔ قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔
ہلکے، ہلکے سُروں میں موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔ آج

ماشاء اللہ سلمان پانچ برس کا ہو گیا تھا۔ صالحہ اور اس گھر کے سب لوگ سلمان کی سالگرہ دھوم دھام سے مناتے تھے۔ آخر کو وہ صالحہ بیگم کا اکلوتا بیٹا تھا جو بڑی منتوں مرادوں سے دنیا میں آیا تھا۔

ویسے تو اس گھر میں سلمان سے بڑی دو بہنیں اور بھی تھیں بڑی شازیہ جو سلمان سے پانچ سال بڑی اور سعدیہ تین سال۔ اس گھر میں جب صالحہ بیاہ کر آئیں تو اُن سے پہلے دو بہویں موجود تھیں۔

صالحہ اس گھر میں سب سے چھوٹی بہو بن کر آئیں تو ان کے یہاں پہلی بیٹی شازیہ کی ولادت ہوئی تو کسی نے بھی شازیہ کو کھلے دل سے گلے نہیں لگایا۔ خاص کر ساس کا تو منہ ہی بن گیا اور وہ بچی کو گود میں لیتی ہی نہیں تھیں۔ جبکہ بڑی تائی رخسانہ، شازیہ سے بہت پیار کرتی تھیں۔

ساس کا فرمان تھا کہ ہمارے یہاں صدیوں سے روایت چلی آرہی ہے کہ پہلی اولاد لڑکا ہوتا ہے۔ صالحہ نے ان کی روایت کو توڑا ہے اس لیے شازیہ کی پیدائش پر کوئی خوشی نہیں منائی گئی پھر اس کے کچھ عرصے کے بعد سعدیہ بھی دادی کی روایت کو توڑنے چلی آئی۔ سعدیہ بچپن سے ہی چلبلی اور حاضر جواب تھی۔ ہر بات میں بولتی تھی، اس نے اپنی حرکتوں سے لوگوں کو متوجہ کرنا شروع کیا۔ وہ خود دادی کی گود میں گھس کر بیٹھ جاتی اور دادی کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی، اس طرح سعدیہ نے اپنی محبت خود زبردستی حاصل کرنا شروع کردی۔ ویسے وہ ابو کی بہت لاڈلی تھی۔

اِدھر صالحہ کو دن رات لڑکا نہ ہونے کے طعنے ملتے۔

''ہائے میرے رفاقت کی نسل کیسے آگے بڑھے گی۔'' دادی تڑپ کر کہتیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ صالحہ بیگم نے اللہ سے لو لگائے رکھی اور علاج بھی کراتی رہیں اور آخر کار سب کی امیدیں رنگ لائیں اور پھر صالحہ بیگم نے ساس کو اپنے امید سے ہونے کی خبر سنائی۔ دادی کو تو پوری امید تھی کہ اس مرتبہ

کی لی کر گیا اور سلمان نے اس دنیا میں قدم رکھ کر دادی کو خوش کر دیا اور باپ کا بھی سر بلند کر دیا۔

وقت کے ساتھ، ساتھ سلمان کی شرارتیں، لاڈ، پیار اکلوتا ہونے کی وجہ سے بڑھتی رہیں۔ سب اس کے ناز نخرے اٹھاتے، دادا، دادی، چچا اور تایا اس کی ہر فرمائش پوری کرتے اور صالحہ بیگم یہ سب دیکھ کر جیتیں۔

جب سلمان دس برس کا ہوا تو دادا کا انتقال ہو گیا اور اس کے دو سال بعد دادی بھی دادا کے پاس چلی گئیں۔ سب کے بچے بھی اب بڑے ہو گئے تھے۔ دونوں بڑے بھائیوں کی اولادوں کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی اب وہ جاب کی تلاش میں تھے۔ صرف شازیہ، سعدیہ اور سلمان اسکول، کالج، یونیورسٹی کے چکر میں تھے، ان کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اسی دوران تینوں بھائیوں نے اشرف ولا کو بیچنے کا فیصلہ کیا اور تینوں بھائیوں نے باپ کے گھر کو بیچ کر آپس میں بٹوارا کر لیا، اب انہوں نے اپنے علیحدہ، علیحدہ گھر بنا لیے تھے۔ تینوں بھائیوں کو دور رہنا پڑ گیا۔ وہ علیحدہ تو ہو گئے تھے لیکن تینوں بھائیوں اور ان کے بیوی بچوں میں آپس میں بڑی محبت اور سلوک تھا۔ کسی بھی خوشی اور غم کے موقع پر سب اکٹھے ہو جاتے اور ہر مسئلے پر تبادلۂ خیال کرتے۔

سلمان کو تو سارے کزنز چھوٹا ہونے کی وجہ سے بہت پیار کرتے تھے، بڑے تایا کے بیٹے حسن کا رجحان شازیہ کی طرف تھا اور شازیہ کو بھی اس بات سے کی واقفیت تھی۔ وہ بھی دل ہی دل میں حسن کو پسند کرتی تھی اور تائی رخسانہ وہ تو شروع دن سے ہی شازیہ کو بہت چاہتی تھیں۔ کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ حسن بہت لائق اور سمجھدار لڑکا تھا۔ بڑے بزرگ صرف شازیہ کی تعلیم ختم ہونے اور حسن کو جاب ملنے کا انتظار کر رہے تھے ویسے تو سارے معاملات کا سب کو علم تھا ہی۔

☆☆☆

''شازیہ ارے شازیہ، تم کہاں ہو ذرا بھائی کے

ٹیوشن بھی جائے گا۔" صالحہ بیگم بیٹی کو ڈھونڈتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں اور اسے سلمان کے کپڑے دیے۔

"امی میں ابھی کر دیتی ہوں۔"

"اور ہاں یہ سعدیہ کہاں ہے؟ بڑی کام چور ہے جہاں کچھ کام کا سنا فوراً اندر چھپ جائے گی کبھی دل نہیں لگائے گی کام میں۔"

"جی نہیں، میں تو اپنا کام کر رہی ہوں۔ میرے کام کون کرے گا بس ہر وقت سلمان کا کام کرتے رہو۔" اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

شازیہ خاموشی اور فرمانبرداری سے کام کرتی تھی جبکہ سعدیہ ہر بات پر جواب ضرور دیتی۔ اور بھائی کو بھی خوب ستاتی تھی اور ساتھ، ساتھ ماں سے ڈانٹ بھی کھاتی تھی۔

وہ ہمیشہ بیٹے ہی کی طرف داری کرتی تھیں اور اس کی محبت میں وہ اکثر ضرورت سے زیادہ سعدیہ کو باتیں سنا دیا کرتی تھیں لیکن سعدیہ بھی کہاں سننے والی تھی۔ بیچ، بیچ میں جواب دیتی اور ڈانٹ بھی کھاتی۔

سعدیہ اس ماحول کو دیکھتی اور سوچتی رہتی کہ بیٹی ہونا کوئی بڑی بات نہیں لیکن بیٹا ہونا ایک اعزاز کی بات ہے اور اس طرح ماں، باپ خود اپنی اولاد کے ساتھ بیٹا، بیٹی کا فرق کر کے ناانصافی کرتے ہیں۔

سعدیہ کو ابو سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ وہ تو اسے بہت پیار کرتے تھے اور اکثر سلمان کو ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے لیکن صالحہ بیگم کا پلڑا بیٹے کے لیے ہی جھکتا تھا۔

صالحہ بیگم، شازیہ کو آوازیں دیتی ہوئی بچیوں کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"بیٹا وہ کل رخسانہ بھابی اور عظمت بھائی آ رہے ہیں دوپہر کے کھانے پر۔ تم ذرا کھانے کی تیاری پہلے سے کر لینا۔"

"امی وہ کیوں آ رہے ہیں، کوئی خاص بات ہے کیا؟" سعدیہ نے بہن کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"کیوں بھئی ان کا گھر ہے جب مرضی چاہے وہ آ جائیں۔ کیا پکانا ہے بتا دو تو بس تمہارے ابو سے سامان منگوا دوں۔" صالحہ بیگم نے بیٹی کو جواب دیا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"ابو سے کیوں منگوا رہی ہیں، سلمان کو لسٹ بنا کر دے دیں۔ ماسی کے ساتھ جا کر لے آئے گا ابو تو ابھی تھکے ہوئے آئے ہیں۔" ان کی بات پر سعدیہ جھٹ سے بولی۔

"وہ بھی تو ابھی تھکا ہوا اسکول سے آیا ہے۔ اسے رہنے دو، میں ماسی سے منگوا لیتی ہوں۔"

"امی یہ کیا آپ نے سلمان کو ہاتھ کا پھولا بنا کر رکھا ہے اس سے بھی کام کروایا کریں۔ آخر کو بڑا ہو گیا ہے۔ اس طرح تو وہ ساری زندگی آرام ہی کرتا رہے گا، اس میں احساسِ ذمے داری تو پیدا کریں۔" سعدیہ نے غصے سے اپنی امی سے کہا تو انہوں نے الٹا اسے ہی ڈانٹ دیا۔

"جاؤ اپنا کام کرو، ہر وقت بھائی کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ ارے بھئی وہ اسکول سے آیا ہے اس کے سونے کا ٹائم ہے، شام میں دوسرے کام کر دے گا۔"

"ہاں بڑا کام کر دے گا جب بڑا ہو جائے گا تب بھی نہیں کرے گا۔" سعدیہ نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

انہی باتوں میں دوسرا دن اتوار کا آ گیا۔ آج تو تایا، تائی نے آنا تھا۔ سعدیہ مسکرا کر بہن کو کچھ ہدایتیں بھی دے رہی تھی۔

"آپی یہ کپڑے پہن لیں، بال اس طرح بنا لیں۔ کھانے میں یہ بنا لیں، وہ بنا لیں۔ وغیرہ....." اسی طرح وقت آگے بڑھا۔ ظہر کی نماز سے پہلے دونوں آ گئے تھے۔

"آپی، حسن بھائی تو نہیں آئے بس تایا، تائی آئے ہیں۔ آپ تیار ہو جائیں، میں جا کر سلاد بناتی ہوں۔" سعدیہ تایا، تائی کو سلام کر کے اسے اطلاع دینے آئی تھی۔ شازیہ نے بھی کمرے سے نکل کر دونوں کو سلام کیا اور دعائیں لیتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر میں کھانا لگا دیا تھا۔

اس نے سلمان سے کہا کہ سامنے اسٹور سے کولڈ ڈرنک لے آئے۔

''سلمان کو نہ بھیجو، میں لے کر آتا ہوں۔'' ابو نے سنا تو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ابو آپ کیوں جا رہے ہیں؟ اسے لانے دیں ناں اس پر بھی تو کوئی ذمے داری ڈالیں اس طرح تو وہ ہر چیز سے بے پروا ہو جائے گا، اس کو ہر چیز وقت پر بغیر محنت کے مل جاتی ہے، ہر بات اس کی مانی جاتی ہے، ہر بات میں آپ دونوں اس کی حمایت کرتے ہیں۔'' سعدیہ غصے میں آہستہ، آہستہ بول رہی تھی کہ باہر بیٹھے مہمان نہ سن لیں۔ شازیہ نے اسے چٹکی مار کر چپ کروا دیا تھا۔

''ابھی خاموش رہو بعد میں گلے شکوے کر لینا۔'' سعدیہ غصے سے خاموش ہو گئی۔ سب کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں حسن کے بارے میں بات کی اس کی نوکری کے بارے میں بتایا۔ اس دوران شازیہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ پھر انہوں نے حسن کے لیے شازیہ کا رشتہ مانگ لیا۔ انکار کی کہیں بھی گنجائش نہیں تھی۔ سب اس فیصلے پر راضی تھے۔ غرض کہ شام تک یہ محفل برخاست ہو گئی۔

''چھ ماہ بعد ہم شادی کریں گے، آپ تیاری شروع کریں۔ اور اگلے ماہ ہم تاریخ فکس کرنے آئیں گے۔''

شام میں سب لاؤنج میں بیٹھ کر اس مسئلے پر ڈسکس کرنے لگے۔ رفاقت صاحب بھی صالحہ بیگم سے مختلف چیزوں پر بات کرنے لگے۔

امی آپ اس پر کوئی ذمے داری نہیں ڈالتیں یہ کیسے کام کرے گا۔ اتنی بڑی شادی کرنی ہے اس نے بھی تو کچھ کرنا ہے یا نہیں۔'' مہمانوں کے جانے کے بعد سعدیہ بھائی کی شکایت کرنے لگی۔

''بس تم شروع ہو گئیں بھائی کے خلاف، تمہارا اکلوتا بھائی ہے اس گھر کا ولی عہد ہے تم دونوں بیاہ کر دوسرے گھر چلی جاؤ گی تو وہی تو ہے جو میرے اور

اسے ڈانٹا تو سلمان نے ان کے گلے میں بازو ڈال کر بہن کو منہ چڑایا۔ سعدیہ اور تپ گئی۔

جب صالحہ بیگم نے سعدیہ کو ڈانٹا تو رفاقت صاحب بھی سوچنے لگے کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن مصلحتاً وہ خاموش رہے۔ اور کہتے، کہتے رہ گئے کہ سلمان کو بھی اپنی ذمے داریوں کا احساس ہونا چاہیے۔

''امی آپ ہمیشہ سے کہتی ہیں ہم سے کہ سلمان کا خیال رکھنا، اکلوتا بھائی ہے۔ آپ اس سے کبھی یہ کیوں نہیں کہتیں کہ دونوں بہنوں کا تم خیال رکھنا۔ بھائی کی بھی تو ذمے داری ہوتی ہے ناں.....''

''ارے ابھی وہ چھوٹا ہے، جب بڑا ہو جائے گا تو ذمے داری سمجھ جائے گا سب..... سنبھال لے گا، ابھی اس کو میٹرک تو پاس کرنے دو پھر ان شاء اللہ دیکھنا میرا بیٹا آسمان کی بلندیوں کو چھوئے گا اس کو پڑھا لکھا کر بڑا افسر بناؤں گی۔'' صالحہ بیگم نے فخر سے کہا تو جھٹ سعدیہ بولی مگر چپکے سے تاکہ امی دوبارہ نہ ڈانٹیں۔

''بڑا افسر بنانے سے پہلے آپ اسے بڑا انسان تو بنا لیں۔'' یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد سلمان امی کے ساتھ بہنوں کے کمرے میں آ گیا اور بڑی بہن سے گلے مل کر مبارک باد دینے لگا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ جو بہن کے بچھڑنے کے تھے۔

''باجی تم چلی جاؤ گی تو میرا دل نہیں لگے گا۔'' اسے روتا دیکھ کر صالحہ بیگم فوراً بولیں۔

''ارے بیٹا روتے کیوں ہو، کہیں لڑکے بھی روتے ہیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لڑکے روتے نہیں بلکہ رُلاتے ہیں۔'' سعدیہ جھٹ سے بولی تو صالحہ بیگم نے سختی سے اسے ڈانٹا۔

''بس تم تو ہر وقت بال کی کھال نکالنا۔ بھائی کے پیچھے ہی پڑی رہنا۔''

سلمان نے گھور کر سعدیہ کو دیکھا۔ اور وہ بھائی کو

ایک چٹکی بھر کر باہر بھاگ گئی۔

دن رات دونوں بہن، بھائی کی لڑائی چلتی رہتی لیکن دونوں بہنوں کو سلمان سے بہت پیار تھا۔ سلمان کا دونوں بہنیں ہی بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس کے باوجود سعدیہ ذرا سی بھی بے پروائی پر امی سے فوراً ڈانٹ کھاتی۔ کیونکہ وہ سلمان کو بہت چھیڑتی تھی۔

☆☆☆

شازیہ کی شادی کا وقت قریب آرہا تھا۔ دونوں گھروں میں جوش و خروش سے تیاریاں ہونے لگیں۔ کیونکہ اس خاندان کی پہلی شادی تھی سب لوگ اپنی، اپنی شاپنگ میں لگے ہوئے تھے۔ گھروں میں رونق اور مہمان نوازی چل رہی تھی۔ پورے مہینے خوب ہلا گلا لگا رہا۔ خیر سے شازیہ سب کی دعاؤں میں رخصت ہوگئی اب گھر میں سلمان اور سعدیہ رہ گئے جو سارا دن ایک دوسرے کے ساتھ نوک جھوک میں وقت گزارتے۔

دن اسی طرح ہنستے مسکراتے گزر رہے تھے کہ شادی کے تین ماہ کے بعد رفاقت صاحب دل کے دورے کے باعث سب کو روتا چھوڑ گئے اب صالحہ بیگم تنہا رہ گئیں۔

وقت تھوڑا اور آگے بڑھا شازیہ کی شادی کو بھی تین سال ہو گئے تھے اور وہ دو بیٹوں کی ماں بن گئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ اب صالحہ بیگم کو سعدیہ کی فکر تھی کہ کسی طرح یہ بھی اپنے گھر رخصت ہو جائے کیونکہ اس کا ایم بی اے مکمل ہو چکا تھا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد حسن کی وساطت سے ایک رشتہ آیا۔ لڑکا بہت اچھا اور پڑھا لکھا تھا۔ سب لوگوں کو رشتہ پسند آیا اور بڑوں کی مرضی اور مشورے سے یہ فیصلہ ہوا کہ تین ماہ بعد شادی کر لیں گے۔ تاریخ طے ہوگئی۔ اب تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ شازیہ بھی شام کو حسن کے ساتھ آجاتی تھی اور امی کی مدد کرتی۔

سلمان بھی کچھ، کچھ ہاتھ بٹانے لگا تھا لیکن آتے

''امی جب سعدیہ اس گھر سے چلی جائے گی تو کتنا سکون ہوگا ناں' ہر طرف چین ہی چین ہوگا۔'' سعدیہ فوراً اس کے کان کھینچتی اور دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور اس طرح کرتے، کرتے شادی کا وقت بھی قریب آگیا۔ اور وہ بھی اس گھر سے رخصت ہوگئی۔

سلمان، سعدیہ کی شادی پر چھپ، چھپ کر رویا۔ اب وہ سنجیدہ ہوگیا تھا اس کا بھی ایم بی اے کا فائنل ائیر تھا۔ وہ پڑھائی میں مشغول ہوگیا تھا۔

☆☆☆

دن گزرتے رہے۔ دونوں بہنیں اپنے، اپنے گھروں میں خوش آباد تھیں۔ سلمان کو بھی ایم بی اے کر کے ایک ملٹی نیشنل فرم میں اچھی جاب مل گئی تھی اب صالحہ بیگم چاہتی تھیں کہ سلمان کی بھی دلہن لے آئیں تاکہ ان کی تنہائی دور ہو سکے لیکن سلمان نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ اگلے دو سال تک مجھے شادی کے لیے مت کہیے گا وہ چپ ہو رہیں۔

جب دونوں لڑکیاں گھر آتیں تو گھر میں رونق لگ جاتی۔ سلمان بچوں کے ساتھ انجوائے کرتا۔ آفس سے آکر دونوں کے بچوں سے کھیلتا اور بہنوں کی خاطر تواضع کرتا۔

اِدھر صالحہ بیگم اسی کوشش میں تھیں کہ کسی طرح بیٹے کو شادی کے لیے راضی کر لیں تاکہ گھر میں بھی رونق ہو۔ ماں، بہنیں لڑکیاں سوچتی رہتیں۔ اسی دوران سلمان نے وہیں آفس میں ایک لڑکی پسند کر لی جو بہت خوب صورت اور امیر گھرانے سے تھی۔ دونوں بہنوں اور ماں نے سلمان کے کہنے سے لڑکی کے گھر جا کر ان لوگوں سے بات کی۔ زارا ایک اچھی اور پڑھی لکھی تھی۔ اس کے گھر والے مالی طور پر کافی مستحکم تھے۔ بہر حال تین ماہ کے اندر، اندر زارا اس گھر میں بہو بن کر آگئی۔

اب سارا دن صالحہ بیگم بہو کے ساتھ ہوتیں۔

بیگم کا اپنا معمول جاری رہا۔ صبح سویرے وہ اٹھ جاتی تھیں۔ نماز کے بعد ناشتا تیار کرتیں اور پھر سلمان آفس چلا جاتا اور زارا اپنے کمرے میں.....

صالحہ بیگم ناشتے کے بعد دوپہر کے کاموں میں مشغول ہو جاتیں اور زارا مسلسل اپنے کمرے میں ہوتی۔ وہ کبھی آواز دے کر اسے باہر بلا لیتیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

''بیٹا سارا دن تم کمرے میں اکیلی بیٹھی رہتی ہو، تم میرے ساتھ باہر آ کر بھی بیٹھا کرو۔'' وہ کہتیں۔

''اچھا امی ابھی آتی ہوں۔'' بہو سن کر کہتی اور اس کے بعد وہ واپس اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کبھی کبھار وہ چار، چار گھنٹے کمرے سے نہیں نکلتی۔ صالحہ بیگم بلا، بلا کر تھک جاتیں اور پھر اکیلے کھانا کھا کر آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی جاتیں۔ زارا کو جب بھوک لگتی باہر آ کر کچن سے کھانا لیا اور پھر اپنے کمرے میں بند.....

صالحہ بیگم کو تنہائی کا احساس بیٹیوں کے جانے کے بعد کافی بڑھ گیا تھا۔ اور وہ اب زیادہ اکیلا پن محسوس کرنے لگی تھیں۔ اکثر شام کو بیٹا آفس سے آتا اور دلہن کے ساتھ باہر نکل جاتا۔ ''امی ہم ابھی آتے ہیں۔'' کہہ کر رات گئے دونوں گھر آتے۔ صالحہ بیگم رات کھانے پر انتظار کرتی رہتیں۔ لیکن وہ باہر سے کھا کر آتے۔

''بیٹا میں تم لوگوں کا کھانے پر انتظار کرتی رہتی ہوں اور تم لوگوں نے اگر باہر کھانا کھانا ہو تو مجھے بتا دیتے، مجھے فون کر دیتے تو میں انتظار نہ کرتی، کھانا کھا لیتی۔'' اس روز صالحہ بیگم نے شکوہ کیا۔

''امی آپ انتظار نہیں کیا کریں، کھانا کھا لیا کریں ہمارا کچھ پتا نہیں ہوتا۔'' سلمان نے کہا۔

''بیٹا میری دوائیں ختم ہو گئی ہیں تم سے کہا تھا کل لانے کو۔''

''ہاں امی میں بھول گیا تھا، کل لے آؤں گا۔'' سلمان نے بیزاری سے جواب دیا۔

دوسرے دن صالحہ نے پھر پوچھا۔

کریں۔'' سلمان نے پھر معذرت کی تو صالحہ نے کہا۔

''نہیں بیٹا رہنے دو میں حسن سے منگوا لوں گی۔''

دوسرے دن سلمان آفس سے جلد آ گیا تھا اور آتے ہی کہنے لگا۔

''امی آج آلو کے پراٹھے بنائیے گا بہت دن ہو گئے ہیں۔'' صالحہ بیگم بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے جلدی، جلدی ساری تیاری کر لی۔ مغرب کے بعد دونوں میاں بیوی کمرے سے تیار ہو کر نکلے وہ حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

''وہ امی آپ کو بتانا بھول گیا تھا کہ آج تو میری سسرال میں دعوت تھی، ہم جا رہے ہیں آپ ایسا کریں کہ یہ پراٹھے لنچ میں بنا کر دے دیجیے گا۔'' دونوں خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

رات گئے دونوں واپس آئے سلمان نے امی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ سو چکی تھیں پھر وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے دن صبح امی کو دیکھا تو وہ کچن میں مصروف تھیں وہاں جا کر سلمان نے ان کا حال احوال پوچھا اور ان سے معافی مانگی کہ امی میں بھول گیا تھا۔ صالحہ بیگم نے کہا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا اب تو ہمارے چل چلاؤ کا وقت ہے۔''

اب صالحہ بیگم کو سعدیہ کی باتیں یاد آنے لگیں تھیں کہ ''امی آپ بڑا افسر بنانے سے پہلے ایک اچھا انسان تو بنا لیں۔''

سلمان بڑا افسر تو بن گیا لیکن کیا اچھا انسان یا اچھا بیٹا بنا تھا؟ وہ سوچ رہی تھیں۔ ان کی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی۔

''میں نے سعدیہ سے یہی کہا تھا کہ میرا بیٹا آسمان کی بلندیوں کو چھوئے گا۔ اور اب بلندیوں کو چھونے میں اس کے پاؤں زمین چھوڑنے لگے ہیں۔ اور اس کے ہاتھ سے رشتوں کی ڈوریاں بھی آہستہ،

اب یہ روز کا معمول تھا کہ سلمان شام کو آتا اور کمرے کے اندر زارا تو ہر وقت اندر ہی رہتی اس کے بعد دونوں باہر چلے جاتے اور صالحہ بیگم پھر تنہا اور تنہائی کا زہر.....

☆☆☆

کچھ دنوں سے انہیں زارا کے معمولات میں کچھ تبدیلی لگ رہی تھی، زیادہ کھا پی بھی نہیں رہی تھی، ڈاکٹر کے ہاں بھی سلمان لے گیا تھا مگر ماں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ آج کہیں جا کر سلمان نے بتایا کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ اُف ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے... نامعلوم یہ آنسو خوشی کے تھے یا..... جب لڑکیاں گھر میں آتی تھیں تو تھوڑی بہت رونق ہو جاتی تھی مگر انہوں نے بھی آنا کم کر دیا تھا۔ صالحہ بیگم کسی سے کوئی شکوہ نہیں کرتی تھیں لیکن بیٹیاں سب سمجھ جاتی تھیں۔

سلمان یکے بعد دیگرے دو بیٹوں کا باپ بن گیا تھا۔ بیٹیاں محسوس کرتیں امی اب بہت کمزور اور خاموش ہوگئی ہیں لیکن سلمان کو اس بات کا بالکل بھی احساس نہیں تھا۔ دو ڈھائی سالوں میں زارا بچوں کو بھی زیادہ تر کمرے میں رکھتی۔ سلمان امی سے کوئی بات کرتا تو امی بہت مختصر جواب دیتیں۔

سعدیہ بہت کچھ محسوس کر رہی تھی وہ جو کچھ کہتی تھی اس کو اب حقیقت نظر آ رہی تھی لیکن اب وہ امی سے گلہ کر کے ان کو مزید دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

اب صالحہ بیگم کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی، اکیلے پن نے ان کو دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا انہوں نے کیا، کیا خواب دیکھے تھے۔ ان خوابوں کی اتنی بری تعبیر وہ سوچ کر افسوس کرتیں۔

وقت آگے سرکتا رہا اور صالحہ بیگم کمزور اور خاموش ہوتی چلی گئیں۔ کچھ عمر نے رنگ دکھایا اور کچھ بیٹے کے رویے نے۔

سلمان کو بیٹی کی بڑی آرزو تھی تیسری مرتبہ اس نے بڑی دعا کی کہ اللہ مجھے بیٹی دے دے لیکن اس مرتبہ بھی اللہ نے اسے بیٹا دیا۔ سلمان، سعدیہ سے مل

کر کہنے لگا۔

''میں نے اس مرتبہ اللہ سے بیٹی کی دعا مانگی تھی۔ لیکن اللہ نے مجھے پھر بیٹا دے دیا۔'' سعدیہ سن کر دل ہی دل میں مسکرائی اور سوچنے لگی۔

''اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔'' تین بیٹوں کے بعد سلمان کی یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

اس دوران سلمان کو کمپنی کی طرف سے ملائشیا ٹرانسفر کر دیا گیا۔

اس نے خوشی، خوشی امی کو خبر سنائی وہ سمجھا ہمیشہ کی طرح امی میری کامیابی سے خوش ہوں گی۔ مجھے بڑی دعائیں دیں گی۔ گلے لگائیں گی اور کہیں گی کہ میرا بیٹا آسمان کی بلندیوں کو چھوئے گا لیکن یہ کیا کہ امی حسرت سے اسے تکتی رہیں اور اسے اپنی خوشی کے سامنے امی کے آنکھوں کی نمی نظر نہیں آئی۔ وہ سمجھا کہ امی بیمار ہیں اس لیے گرمجوشی نہیں دکھائی اور صالحہ بیگم گیلی اور خالی آنکھوں سے بیٹے کو تکتی رہیں اور سلمان امی کو چھوڑ کر ملائشیا شفٹ ہو گیا۔ اور صالحہ بیگم تنہا رہ گئیں۔ اس کے جانے کے بعد بہو بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی کہ وہاں سے جب سلمان بلائے گا تو چلی جائے گی۔

کچھ عرصے کے بعد شازیہ اپنی فیملی کے ساتھ اپنے میکے میں منتقل ہو گئی۔ حسن تو خاندان کا تھا وہ سارے حالات اور سلمان کی فطرت جانتا تھا۔ حسن، چچی کا بہت خیال رکھتا وہ ان کی طبیعت سے بھی واقف تھا۔

سلمان ایک ماہ کے بعد واپس آیا زارا اور بچوں کو لینے..... کیونکہ اسے رہائش مل گئی تھی۔ اور گھر سیٹ ہو گیا تھا۔ وہ جاتے وقت امی سے ملنے آیا انہوں نے ایک لفظ بھی شکوے کا نہیں کہا وہ بت بن گئیں۔

وقت کی رفتار کے ساتھ صالحہ بیگم کمزور ہونے لگیں۔ سلمان کا فون آتا شازیہ اور حسن بھائی سے بات کرتا اور امی سے بات کرنے کا کہتا۔ امی ایک دو باتیں کرتیں اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیتیں۔ سعدیہ آتی تو اس سے کافی دیر بات کرتا۔ سعدیہ کچھ گلے دیتا۔ سعدیہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب کوئی فائدہ نہیں ہے، ہم اپنی بربادی کا سامان خود تیار کرتے ہیں اور پھر دوسروں سے گلہ کرتے ہیں۔ امی اسے ایک بڑا افسر بنانا چاہتی تھیں وہ بن گیا لیکن ایک ذمے دار بیٹا نہ بنا سکیں۔ ہم اپنا بویا ہوا کاٹ رہے ہوتے ہیں امی سے یہ سب کہنا ان کو دکھ دینے کے مترادف تھا۔

وقت کے ساتھ، ساتھ سلمان کے فون آنے کم ہوتے چلے گئے۔ صالحہ بیگم کمرے میں لیٹی رہتیں لیکن ان کی نظریں فون پر ہوتیں۔ بعض اوقات وہ چپکے، چپکے موبائل پر اس کی بھیجی ہوئی تصویریں دیکھ لیتی تھیں۔ سعدیہ نے کئی مرتبہ چھپ کر دیکھا تھا کہ وہ موبائل میں سلمان کی تصویر دیکھ کر روتی رہتی ہیں۔

دونوں بہنیں امی کی حالت دیکھ کر بھائی کو لعنت ملامت کرتیں مگر اسے اپنے اس بدصورت رویے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا اس لیے کہ اس کے اندر یہ احساس شروع سے ہی نہیں پیدا کیا گیا تھا۔ جب سعدیہ بولتی تھی تو صالحہ بیگم اس کو اپنی آنکھوں کا تارہ قرار دیتی تھیں اب اسی آنکھ کے تارے نے آنکھوں کے اندر موتیا پیدا کر دیا تھا۔

آج صالحہ بیگم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی کال بیل بجی اور حسن ڈاکٹر کو لے کر اندر آئے۔ ڈاکٹر نے پہلے انہیں چیک کیا۔ بات کرنے کی کوشش کی لیکن صالحہ بیگم ہلکی سی آواز میں دو تین الفاظ کہہ سکیں اور ان کی آنکھوں سے دو قطرے بہہ نکلے۔ دونوں بہنیں بھی روتے ہوئے آنسو پونچھنے لگیں۔ ان کی تمام رپورٹس ڈاکٹر نے دیکھیں اور کہا۔

''تمام رپورٹس تو ٹھیک ہیں، سب نارمل ہے بلڈ پریشر بھی ٹھیک ہے۔ انہیں کوئی غم یا صدمہ تو نہیں جس کی وجہ سے یہ ٹھیک نہیں ہو پا رہیں۔ ویسے ان کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ آپ لوگ ان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا کریں اور ان کو اکیلا نہ چھوڑیں۔ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں۔''

امی کو خوش کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ صالحہ بیگم اس سے جیسے شرمندہ ہوں۔ سعدیہ رات کو ان کے پاس ہی لیٹ گئی۔ اس نے دیکھا کہ امی دن بھر تو خاموش رہیں لیکن رات کو آدھے پہر سے وہ سلمان کو یاد کر رہی تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کے بیڈ کی سائڈ پر سلمان اور اس کے بچوں کی تصویر تھی بار، بار اس کو دیکھ رہی تھیں..... سعدیہ یہ سب چپکے سے دیکھتی رہی اور خود بھی روتی رہی، اس نے اپنے رونے کی آواز کو بلند نہیں ہونے دیا تھا۔

"امی کیا حال ہے اور یہ تصویر کس کی ہے؟" صبح اٹھ کر اس نے امی سے کہا انہوں نے مڑ کر دیکھا اور صرف ایک لفظ سلمان بولا اور خاموش ہو گئیں۔ سعدیہ نے بہن کو یہ سب باتیں بتائیں اور کہا کہ میں اسے فون ملاتی ہوں۔ آدھے گھنٹے تک فون ملاتی رہی مگر سلمان نے نہیں اٹھایا۔ اس نے پھر ایک اور کوشش کی تو زارا نے فون اٹھایا اور یہ کہہ کر رکھ دیا کہ۔ "سلمان نہیں ہیں آپ بار، بار فون نہ کریں۔" سعدیہ نے بتایا بھی کہ "امی کی طبیعت بہت خراب ہے اور سلمان کو بہت یاد کر رہی ہیں۔" اس وقت تو اس نے کچھ نہیں کہا پھر ایک گھنٹے کے بعد سلمان کا فون آ گیا کہ "امی سے میری بات کراؤ۔" وہ بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن لائن کٹ گئی۔

دو گھنٹے بعد سعدیہ نے پھر فون ملایا اور امی کے کان سے لگا دیا۔ سلمان امی، امی کرتا رہا لیکن صالحہ بیگم سے کوئی بات ہی نہیں ہو سکی۔ غم نے ان کی زبان بند کر دی تھی وہ اب خاموش ہو چکی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ بیٹیوں سے شرمندہ ہوں کہ انہوں نے بیٹیوں کو بیٹے کے سامنے کوئی اہمیت نہ دی لیکن کام بیٹیاں ہی آ رہی تھیں۔

ایک دفعہ سلمان کے رونے پر انہوں نے کہا تھا۔ "رو کیوں رہے ہو کہیں لڑکے روتے ہیں۔" اور سعدیہ نے کہا تھا۔ "لڑکے روتے نہیں رُلاتے ہیں۔" اور آج وہ رو رہی تھیں اور رُلانے والا خود ان کا لختِ جگر تھا۔

کی طبیعت زیادہ خراب ہے تم پاکستان آ جاؤ تا کہ ان سے مل لو....."

"آج کل کمپنی میں بہت مصروفیت چل رہی ہے ان شاء اللہ میں جلد ہی آؤں گا۔ ابھی آفس کی بہت ذمے داری ہے۔" سعدیہ نے سوچا کہ بچپن سے ہی امی نے اس پر کوئی ذمے داری نہیں ڈالی۔ اگر ڈالتیں تو اس کو اپنی اس ذمے داری کا احساس آفس کی ذمے داری سے زیادہ ہوتا۔

پھر آخر تک وہ نہ آ سکا۔ صالحہ بیگم کی نگاہیں دروازے کو تکتی رہ گئیں اور وہ نہ آ سکا تھا۔

سلمان کو اطلاع دی گئی مگر پھر بھی وہ نہ آیا۔ دونوں بہنوں اور دونوں دامادوں نے ان کو آخرت کے سفر کے لیے تیار کیا سارے رشتے دار موجود تھے سب سلمان کا پوچھ رہے تھے لیکن جواب کیا تھا کہ "آفس کی ذمے داری زیادہ تھی۔"

وقت تیزی سے آگے سرکتا رہا۔ اس دوران وہ فون کرتا رہا۔ لیکن اب بہنیں بھی بہت مصروف ہو گئی تھیں۔ ان کے دل کو بھی سخت صدمہ اور دکھ ملا تھا۔

اور ایک دن سلمان اچانک اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آ گیا۔ سب بہنوں، بھانجوں، بھانجیوں اور دیگر لوگوں سے ملا۔ اپنے تینوں بیٹوں سے ملایا۔ تصویریں جو ریک پر تھیں اور پاس پڑے البم سے نکال کر اپنے بچوں کو دکھائیں اور بتا رہا تھا۔

"یہ میری امی، تمہاری دادی ہیں۔ میری امی مجھے بہت چاہتی تھیں۔ میں امی کا لاڈلا تھا۔ امی میرے بہت لاڈ اٹھاتی تھیں۔"

سعدیہ قریب کھڑی سب سن رہی تھی چپکے سے بولی۔

"امی تمہارے لاڈلے بہت اٹھائی تھیں تم ان کا جنازہ نہ اٹھا سکے، ہائے بدنصیب انسان....." دونوں بہنوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

امی کا لاڈلا، اکلوتا سپوت کہ جس کو دیکھ، دیکھ کر وہ جیتی تھیں وہی ان کی موت کا باعث ہو گیا تھا۔

منی ناول

میں انمول

سعدیہ رئیس

جیسے، جیسے رات اپنے جوبن پر آرہی تھی رنگا رنگ کپڑوں اور سب طرف جلتی روشنیوں کی چکا چوند بڑھتی جارہی تھی۔ لاؤنج کے صوفے پر ایمل سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی' اس کے چہرے پر نئے نجوگ کے انوکھے شرمیلے سے تاثرات تھے لیکن کچھ، کچھ گھبراہٹ کے آثار بھی تھے تاہم وہ غیر مطمئن ہرگز نہ تھی۔ شاید اس نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا اور اسی میں اس کی بھلائی تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جو لوگ حالات

سے سمجھوتا نہیں کرتے بے سکونی ان کی روح کو ہمیشہ تڑپاتی رہتی ہے۔ وہاں سب بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے زیادہ تر گفتگو فیشن اور فٹ نیس پر تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں ایک دوسرے کے کپڑوں پر تبصرے کررہی تھیں یا پھر پیٹھ پیچھے ہنسی اڑا رہی تھیں۔

وہ کچھ بیزار سی ہوکر اس محفل سے اٹھ گئی۔ عرصہ ہوا تھا اس بیزاری نے اس کے وجود کو جکڑ رکھا تھا۔ اسے جیسے قرار ہی نہیں تھا۔ وہ باہر آکر چھوٹے سے برآمدے میں رکھی خالی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ باہر قدرے اچھا موسم تھا ورنہ اندر تو گھٹن اور حبس بڑھ گیا تھا۔ چہار دیواری تلے موتیا اور رات کی رانی کے پودے خوب پھل پھول رہے تھے۔ موتیا اور رات کی رانی کی مسحور کن خوشبو سب طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بلا امتیاز و بلا جھجک وہ پھول اپنی خوشبو سب طرف لٹا رہے تھے۔

"آہ......ہا......" ایک گہری دبی، دبی سانس سینے سے خارج ہوئی۔ کئی ایک یادیں آنکھوں میں جھلملانے لگیں...... خوشبو، ساون، رنگ اور بچپن سے جوانی تک کے بیتے ہوئے خوشگوار پل یکے بعد دیگرے اس کے خیالوں میں روشن ہوگئے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے بہت شدید پیاس لگنے لگی۔ سامنے ہی بڑا کولر رکھا ہوا تھا۔ اس نے گلاس میں پانی نکالا اور ابھی ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا کہ صائمہ آنٹی سامنے سے چلی آئیں۔

"ارے انمول...... تم یہاں کیا کررہی ہو اکیلے...... آؤ اندر آؤ، ایمل کے پاس بیٹھو......" وہ کچھ متفکر سی اور کچھ تشویش سے بولیں۔

انمول نے ایک سرسری سی نظر ان پر ڈالی اور خفیف سا مسکرا دی۔

"کچھ نہیں...... پانی پینے آئی تھی۔" اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

"اچھا جلدی آؤ...... لڑکے والے آنے ہی

ان سے فون پر......" وہ اسے تاکید کرتی مڑ کر چلی گئیں۔ آج تو ان کی چھب ہی نرالی تھی۔ سبز اور سفید رنگ کے کامدار سوٹ میں وہ اپنی عمر سے کہیں کم اور بہت زیادہ تر و تازہ لگ رہی تھیں۔ انہوں نے بالوں کے سائڈ میں موتیے کی لڑیاں بھی لٹکا رکھی تھیں۔

"کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں ایسے لوگ جو سب کچھ حاصل کرلیتے ہیں، جو خوش رہتے ہیں اور خود میں مگن رہتے ہیں۔" انہیں دیکھ کر اس کے اندر عجیب سے احساسات کروٹیں لینے لگے۔ شوریدہ سے جذبات میں جیسے ابال سا اٹھا اور اس کی سنسناہٹ سے اس کا چہرہ تمتما گیا۔ اسے اپنے کپڑوں سے اپنی تیاری سے الجھن ہونے لگی حالانکہ ان فیروزی کپڑوں میں وہ بہت جچ رہی تھی، اس پر بڑا خوب صورت سوتی اور ریشم کا کام بنا ہوا تھا۔ اسی وقت موبائل کی میسج ٹون بجی اور اس نے میسج کھولا تو چہرہ یک دم روشن ہوگیا۔

"چھت پر آجاؤ......ابھی فوراً......" یوسف نے اسے بلایا تھا۔

اس کا اداس دل خوش ہوگیا۔ ماند چہرے پر بجھتی جوت پھر جگمگانے لگی۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا...... سب کے سب اندر مصروف تھے۔ وہ ہوا کے مست جھونکے کی طرح ایک زقند میں چھت کے اندھیرے زینے کی طرف بڑھ گئی جہاں یوسف اس کا منتظر تھا۔

اسے سامنے دیکھ کر وہ جیسے ایک لمحہ تو خود کو بھی بھول گئی...... اور یوسف کا حال بھی مختلف نہ تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں صحرا کی دھول اور اذیت تھی، جدائی کا کرب تھا۔

"انمول......" اس کی خفیف سی زیر لب سرگوشی ٹھنڈی مدھر ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کی سماعتوں میں بہار کا پیام بن کر اتر ی۔

"یوسف......" وہ جیسے اس کے سحر میں مسمرائز ہوئی بے خودی میں چلتی اس کے قریب پہنچ گئی......

ہوائیں رقصاں تھیں۔ آرزوئیں اور خواب بھنگڑا ڈالے ایک رومانوی سا شور مچا رہے تھے۔ زمان و مکاں کا ہوش بھلائے وہ نہ جانے کب تک بے خود رہتی کہ موبائل کی میسج ٹون نے چونکا دیا۔

"کہاں ہو جلدی آؤ، سب تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔" ایمل کا میسج تھا۔

وہ گھبرا کر الٹے پاؤں بھاگی۔ اسی چکر میں زینے پر پاؤں بھی مڑ گیا اور وہ پاؤں کی تکلیف سے نڈھال وہیں لڑکھڑاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اے ہے..... کیا ہوا تمہیں..... کہاں تھیں تم؟" صائمہ آنٹی اسے تلاش کرتی ہوئی ادھر آ نکلیں۔

اس کا بکھرا، بکھرا سراپا، اڑی، اڑی رنگت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئیں۔ ہلکا ہلکا سا کاجل اس کے رونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ کو سناٹے میں آ گئیں۔

"کچھ نہیں ہوا..... میرا پاؤں مڑ گیا اور اب مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔" اس نے روہانسی ہو کر سوجی سوجی وجہ بتائی۔

"اور وہاں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں..... ایک ہی تو بہن ہو تم ایمل کی..... کیسے جاؤ گی تم اندر تک..... کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی تم سے کہا بھی تھا....." وہ ناراضی سے بولیں۔

اسے ان کی موجودگی سے الجھن ہونے لگی۔ ابھی تو اس کا خمار نہ اترا تھا۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے اور دہکتے گال کے ساتھ، ساتھ ناہموار دھڑکنیں سنبھل ہی نہیں پا رہی تھیں۔ اس نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

"کیا کر رہی تھیں آخر اتنی دیر سے یہاں پر..... جنید بھی تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔" صائمہ آنٹی کے..... پے در پے سوالات نے اسے بیزار کر دیا۔

"کچھ نہیں..... میں تو بس خوشبو کی تلاش میں گئی تھی..... پھول توڑنے گئی تھی۔ موتیا کے....." وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ بہ مشکل بات بنا پائی۔

گلاب، موتیا کے گجرے رکھے ہیں وہ پہنو ناں..... حد ہو گئی ہے بھئی... وقار صاحب بھی تم کو ڈھونڈ رہے تھے اور کافی خفا ہو رہے تھے تمہاری وہاں غیر موجودگی پر..... اب اٹھو اور آہستہ، آہستہ چلو....." وہ اسے سہارا دینے کو تیار کھڑی تھیں مگر اسے سہارا لینا پسند نہیں تھا۔ وہ اب سب کچھ اپنے بل بوتے پر کرنا چاہتی تھی۔

وہ دھیرے، دھیرے چلتی آگے بڑھ رہی تھی تب ہی یوسف مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا، وہ ڈیکوریشن کا سامان رکھوا رہا تھا۔ اس کے دل کی دنیا میں دھمال سا مچ گیا۔ وہ ایمل کے پاس پہنچی تو رسم شروع ہو گئی۔ وہاں سب ہنس بول رہے تھے، مذاق کر رہے تھے، ایمل کے گل رنگ چہرے پر فقرے اچھال رہے تھا مگر انمول تو وہاں تھی ہی نہیں..... اس کے خالی دل میں، کھلی آنکھوں کے ہر منظر میں سب طرف صرف یوسف ہی یوسف تھا۔

☆☆☆

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ آرام دہ بستر پر گہری نیند سونے کے باوجود اس کا بدن تھکن سے چور، چور تھا۔ اس نے مندی، مندی آنکھوں سے دیکھا کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ باہر چہل پہل کے آثار تھے۔ شاید ماسی بھی آ گئی تھی اور برتن دھو رہی تھی۔ وہ کسلمندی سے پڑی رہی۔ بند آنکھوں تلے یوسف کی شبیہ لہرائی تو از خود ہی پیاری سی مسکان اس کے لبوں پر مچل گئی مگر اگلے ہی پل وہ مسکراہٹ یوں سمٹی جیسے بادلوں میں برق سی چمکتی ہے..... اور اس کے دل پر بھی بجلیاں گری تھیں۔ کچھ دیر کروٹیں بدل کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بکھرے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹ کر کیچر میں مقید کیا۔ سائڈ ٹیبل پر دھرے مرجھائے ہوئے گجروں کی باس کمرے میں سب طرف پھیلی تھی۔ اسے ان مرجھائے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ نہ جانے کس نے رکھ دیے تھے یہاں..... کل رات تک تر و تازہ سے شگفتہ پھول

تھی وہ شاخوں پر، گلے اور ہاتھوں میں سجے رہے اس کے بعد ان کو ایک طرف ڈال دیا گیا۔ وہ کچھ بے چین سی ہو کر اٹھ گئی۔ دیوار گیر آئینے میں بے ساختہ خود کو بغور دیکھا اور رخساروں پر ہاتھ پھیرا..... ہموار، شفاف اور چمکتے رخسار، صراحی دار گردن، سڈول کلائیاں اور ملائم ہاتھوں کی نازک انگلیاں..... کتابی چہرے پر بجی روشن آنکھیں..... سب کچھ ٹھیک تھا، اسی وقت ایمل دروازے کو دھکیلتی اندر آ گئی۔

''اٹھ گئیں لاڈو..... بہت کرلیا آرام اب آجاؤ میدان میں بہت سے کام کرنے ہیں۔'' وہ آتے ہی شروع ہو گئی۔

''اُف..... سر پر ہی سوار ہو جاتی ہو، ناشتا تو کر لینے دو پہلے.....'' وہ تنک کر بولی۔

''ناشتا..... واٹ، دن کے ایک بجے ناشتا نہیں برنچ ہوتا ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے آجاؤ تب تک کھانے کا دسترخوان بھی لگ جائے گا۔'' ایمل نے فوراً جواب دیا اور تاکید کرتی باہر نکل گئی۔

''ایک تو یہ ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے، پتا نہیں کیا مسئلہ ہے اس کو.....'' وہ بڑبڑاتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔

وہ خفا، خفا سی کمرے سے باہر نکلی تو واقعی..... دسترخوان لگ چکا تھا اور رات کی بچی ہوئی روٹی کے ساتھ ہرے مسالے کا سالن کھایا جا رہا تھا۔ تازہ پراٹھے بھی دستیاب تھے۔ اس نے انڈے پراٹھے پر اکتفا کیا اور ایمل کے ہاتھ کی خوشبودار چائے پی۔

ناشتا کر کے اوسان کچھ بہتر ہوئے تو اطراف کا پھیلاوا نظر آیا۔ مٹھائی کے ٹوکرے، پھل اور ساتھ میں خشک میوہ جات کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک طرف ایمل کی سسرال سے آئے ادھ کھلے سوٹ کیس میں اس کا سامان جھانک رہا تھا۔

''پھوپی رقیہ اگر آجاتیں تو بڑی سہولت ہو جاتی، مٹھائی اور پھل کے حصے آرام سے کر دیتیں۔ اب کون میرے ساتھ لگنا پڑے گا..... سارے رشتے داروں تک پہنچانی ہے یہ مٹھائی۔'' صائمہ آنٹی نے اس کے اٹھنے سے پہلے ہی اہم کام سونپ دیا۔

''میں..... مگر مجھے کیا پتا.....؟'' وہ جان بچانا چاہتی تھی۔

''سب رشتے داروں کے نام تم ہی بتاؤ گی مجھے..... بیٹھو یہاں اور ایمل سامنے دراز سے کالا پوائنٹر لے آؤ..... ڈبوں پر سب کے نام لکھ دیے جائیں گے۔'' اس کی بات کو خاص اہمیت نہ دیتے ہوئے انہوں نے ایمل کو بھی ہدایت دی۔

وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں اور مٹھائی کے ڈبے ٹوکرے سے نکالنے لگیں۔

''ایسا کرو پہلے سب کے ناموں کی لسٹ بنالو کہیں کوئی رہ نہ جائے۔'' انہوں نے ہدایت دی۔ ماسی کے جانے کا وقت ہو گیا اسے کھانا وغیرہ دینے کے لیے وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ اسی وقت ڈیکوریشن کے برتن واپس لینے کے لیے بندے آ گئے۔ ان کے ساتھ یوسف بھی تھا۔ انمول کے دل کی دھڑکن مس ہوئی اور صبح، صبح کے اس دیدار پر وہ کھل سی گئی۔

''میں جا کر بتا دیتی ہوں کہ برتن کہاں رکھے ہیں۔'' وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر باہر لپکی۔

یہ سنہری موقع بھلا وہ کیوں ضائع کرتی اور اب تو اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسے خود ہی حالات کو اپنے حق میں سنوارنا پڑے گا۔

''ارے تم یہاں کہاں آ گئیں، اندر چلو..... وقار صاحب خود دیکھ لیں گے ان لوگوں کو.....'' صائمہ آنٹی جانے کب وہاں آ گئی تھیں۔

اسے ان کی آمد سخت ناگوار گزری بلکہ اسے تو ان سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ فی الحال تو وہ چپ چاپ ہی ان کے ساتھ اندر آ گئی۔ ایمل نے گہری نظر سے اس کو دیکھا مگر بولی کچھ نہیں مگر اس لمحہ اسے ایمل کی نظروں میں چھپی تنبیہ نظر آ گئی تھی۔ جسے اس نے نظر انداز

سب میوہ جات اور پھلوں کے جوس لگا کر وہ کمرے میں جانے کے لیے اٹھی تب تک ڈیکوریشن کا تمام سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تھا۔ اسے یوسف کی ایک جھلک ہی نظر آئی۔

''شام کو چکر لگانا میرے پاس یوسف.....'' وقار صاحب نے بطورِ خاص یوسف سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں چلتی قندیلوں کو ایمل نے بڑی تشویش سے دیکھا۔

ایمل کے سامان کا سوٹ کیس لے کر وہ کمرے میں آگئی اور اشتیاق سے ایک، ایک چیز دیکھنے لگی۔

''بڑی خوش قسمت ہو تم..... کس قدر محبت اور مان سے سب کچھ ہوا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی دل کی بات زبان پر آگئی۔

''تم بھی خوش قسمت ہو، جنید بھائی کسی سے کم نہیں۔'' ایمل نے فوراً جواب دیا..... ''اس ظاہری چمک دمک سے بہتر سچے دل سے کی جانے والی محبت ہے اور مان بھی انہی کو ملتا ہے جو اس میزان پر پورے اتریں۔'' ایمل کے سادہ سے لفظوں میں بہت کچھ تھا۔

''اچھا..... بہت باتیں کرنے لگی ہو۔'' اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''تمہارے اٹھنے سے پہلے جنید بھائی کا فون آرہا تھا تمہارے موبائل پر۔ پھر انہوں نے لینڈ لائن پر فون کیا تو میں نے انہیں بتایا کہ تم سو رہی ہو۔'' ایمل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا.....'' وہ مختصراً بولی۔

''کیا اچھا کیا..... اب تم خود جنید بھائی کو کال کر لو.....'' اس نے مشورہ دیا۔ ''ویسے ایک بات بتاؤ..... کل رات رسم کے وقت تم کہاں تھیں؟'' اسے اچانک ہی یاد آیا تھا۔

''میں..... یوسف کے ساتھ تھی۔'' اس نے... بلا جھجک بتا دیا۔

''کیا.....؟'' ایمل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''یہ تم ٹھیک نہیں کر رہیں انمول..... اب تم جنید بھائی کو.....'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''کیا جنید..... جنید لگا رکھی ہے، تم جانتی ہو اس میں بندھن میں میری مرضی کا کوئی دخل نہیں..... تم جانتی ہو اچھی طرح سے کہ یوسف کی میری زندگی میں کیا اہمیت ہے..... تم سب جانتی ہو اور پھر بھی کہہ رہی ہو.....'' وہ جیسے پھٹ پڑی۔

''مگر انمول..... یہ ٹھیک نہیں..... دیکھو جس منزل جانا نہیں پھر اس راہ پر کیوں چل رہی ہو..... حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھو.....'' ایمل شاک کی حالت میں سمجھانے لگی۔

''مجھے دیکھو..... میں نے بھی وقت اور حالات کے ساتھ، ساتھ سب کو قبول کر لیا ہے۔'' اس نے اپنی مثال پیش کی۔

''تم تو ہو ہی موم کی ناک..... جدھر موڑو ادھر مڑ جاؤ..... مگر میں کوئی کٹھ پتلی نہیں، جیتی جاگتی انسان ہوں..... میں اپنا حق لے کر رہوں گی..... میں حالات کو بدل سکتی ہوں۔'' وہ جیسے جذبات میں آکر تمام باریکیاں اور نازکیاں فراموش کرتی جا رہی تھی۔

''انمول..... یہ تم اچھا نہیں کر رہیں۔'' حالات کو بدلنے کی کوشش کرو گی تو بکھر جاؤ گی۔'' ایمل نے لکنت زدہ انداز میں پھر اسے ٹوکا مگر اس کے پتھریلے عزائم کے سامنے اس کے سارے لفظ بودے ثابت ہوئے۔ اسی وقت اس کا موبائل گنگنانے لگا۔

''اُف..... چپکو..... اس کو کوئی اور کام نہیں.....'' اس نے کوفت سے جنید کی کال کاٹ دی۔

''انمول.....'' ایمل نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس کے جارحانہ عزائم اس کے مزاج سے عیاں ہو رہے تھے۔ وہ خوفزدہ سے انداز میں اسے تکتی رہ گئی۔

شام کو اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ ایمل کی نصیحتیں اسے ناگوار گزری تھیں۔

''ایمل میری بہن ہے مگر اسے مجھ سے ذرا بھی ہمدردی نہیں۔'' اس نے دکھ سے سوچا۔ اور عشق پیچاں کی بیل تلے بکھرے سفید اور گلابی پھولوں کو یاسیت سے دیکھا۔ وہ ان پھولوں کی دیوانی تھی۔ اکثر ہی بیل

تلے بیٹھ کر پھولوں کو تکتی رہتی تھی۔ ان پھولوں میں ماضی کی خوب صورتیاں اور رنگ بھی شامل تھے۔

☆☆☆

وہ بھی ایک حبس آلود گرم دوپہر تھی جب وہ گھبرا کر باہر نکلی تھی اور عشق پیچاں کی بیل تلے بیٹھ کر سب طرف چمکتی دھوپ کو دیکھنے لگی۔ ہوا برائے نام تھی۔ انڈر ریڈ روم میں ماما دبیز پردے ڈالے گہری نیند سو رہی تھیں ان کا کمرا قدرے خنک رہتا تھا کیونکہ اس کے اوپر پانی کی ٹنکی بنی ہوئی تھی اور پھر سورج کے رخ پر بھی نہیں تھا۔ لاؤنج، ڈرائنگ روم اور بقیہ دونوں کمروں میں گرمی اور خاموشی رینگ رہی تھی۔ کچن کے روشندان میں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھا تھا وہ اس میں دبکی چوں، چوں کر رہی تھیں۔ سورج آگ برسا رہا تھا اور اس کے قہر سے گھبرا کر چیل، کوّے بھی کہیں کونوں کھدروں میں جا چھپے تھے۔ ایمل نہ جانے کس کونے میں گھسی بیٹھی تھی۔ وہ اکثر دوپہر کو ڈرائنگ بک میں رنگ بھرا کرتی تھی یا اپنے کھلونے پھیلا کر آپا بوا کھیلا کرتی تھی۔ اسے بھی پیشکش کرتی تھی اپنے ساتھ کھیلنے کی مگر انمول کو یہ کھیل پسند نہیں تھے۔ اس کا مزاج قدرے ہٹ کر تھا۔ وہ اکیلے بیٹھ کر گھنٹوں فطرت کے مظاہر کو دیکھتی تھی۔ اترتی دھوپ، ڈھلتی شام، پودے، درخت، پھول، پرندے، آس پڑوس میں بنے گھروں میں کسی کی امارت اور کسی کی غربت کو ناپتی تولتی رہتی تھی۔ وہ ایمل سے صرف دو سال بڑی تھی مگر اس کی سوچ کی پرواز قدرے بلند اور ہٹ کر تھی۔ وہ ایمل سے زیادہ سمجھدار تھی۔

اس وقت جب سورج کی شعلہ فشانیاں عروج پر پہنچ گئی تھیں اور گرم ہواؤں سے سانس لینا محال ہو رہا تھا تو ایکا ایکی ہی سورج کی چمک اور تابناکی کو بادلوں نے ڈھک لیا۔ سب طرف بادلوں کا سایہ ہو گیا۔ دھوپ کی حدت کم ہو گئی اور ایک دم ہی موٹی، موٹی بوندیں کھلے صحن میں پڑنے لگیں۔

"آپا..... ایمل..... ایمل..... باہر آؤ بارش ہو رہی ہے۔" وہ زور سے چیخی۔ اور ایمل وہیں کہیں قریب ہی تھی جو ایک آواز پر دوڑ لگاتی آ گئی اور دونوں مل کر صحن میں اچھل کود کرنے لگیں۔ اچانک اس کی نظر برابر والے گھر پر گئی اور وہ ٹھٹک گئی۔ وہاں ایک تیرہ، چودہ سالہ لڑکا بیٹھا بڑے اشتیاق سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"ارے یہ مہر آنٹی کے گھر کون لڑکا ہے؟" اس نے ایمل کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

"کون ہو تم..... یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" ایمل نے اپنی تیز باریک آواز میں پوچھا۔ لڑکا اس کے مخاطب کرنے پر مسکرا دیا۔

"میں..... تمہارا دوست ہوں....." اس نے مخلصانہ جواب دیا۔

"نہیں، ہم تمہیں نہیں جانتے، تم ہمارے دوست نہیں ہو....." اب انمول نے سمجھداری سے جواب دیا۔

اس کے جواب پر وہ کچھ اور مسکرا دیا۔

"میں مہر آنٹی کی نند کا بیٹا ہوں..... گاؤں سے آیا ہوں۔" اس نے وہیں سے اپنا تعارف کرایا۔

"گاؤں سے۔" وہ دونوں چونکیں۔ ان کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ گاؤں کیا ہوتا ہے۔

"یہ گاؤں کیا ہوتا ہے؟" ایمل نے فوراً پوچھا۔

اس بار لڑکا جواب دینے کے بجائے گھر کے ٹیرس سے کود کر دیوار پر آیا اور ربر پلانٹ کے موٹے تنے سے لٹک کر نیچے کود گیا۔ دونوں حیرانی سے اس کا کرتب دیکھ رہی تھیں۔

"تم تو دو چھلانگوں میں یہاں آ گئے۔" وہ دونوں ہی متاثر ہو گئی تھیں۔

"مجھے تو درخت پر چڑھنا بھی آتا ہے، میں نے چاچا حمید کے باغ سے بہت آم اور جامن چرا کر کھائے ہیں۔" اس نے فخریہ بتایا۔

"آ..... تو تم چور ہو.....؟" ایمل نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"چور..... نہیں، نہیں وہ چاچا حمید کو پتا ہوتا تھا سب، وہ منع کرتے تھے کہ کچے پھل نہ اتارا کرو بس ان

کونگ کرتا تھا۔" وہ وضاحت دینے لگا۔

بوندا باندی اب ہلکی پھوار میں بدل گئی تھی اور وقتاً فوقتاً ہو رہی تھی۔ ان تینوں کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔

"تم یہاں کیوں آ گئے..... اب واپس کیسے جاؤ گے..... مہر آنٹی کو پتا لگا تو ڈانٹیں گی تم کو....." انمول نے فکرمندانہ انداز میں سوالات کیے۔

"میں تو تم لوگوں سے باتیں کرنے اور کھیلنے آیا تھا اور جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس بھی چلا جاؤں گا وہ کوئی مسئلہ نہیں....." وہ بے فکری سے بولا۔

"اچھا! تم ہم سے کیا باتیں کرو گے؟" انمول نے محتاط سے انداز میں پوچھا۔

"میرا نام یوسف ہے اور تم دونوں کا؟" اس نے بات چیت کا آغاز کر دیا۔

"میرا نام ایمل اور یہ میری بہن انمول ہے۔" ایمل نے جھٹ جواب دیا۔

"ایمل..... چلو اندر..... پتا نہیں کون ہے یہ..... مہر آنٹی کے گھر سوائے ان کے اور ان کی بیٹی کے کوئی نہیں ہوتا..... ہر کسی سے فوراً دوستی نہیں کرتے..... اور تم..... جاؤ یہاں سے فوراً۔" انمول نے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایمل کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچا اور مشکوک نظروں سے لڑکے کو تکنے لگی۔

اس کے سرد سے غیر دوستانہ رویے پر لڑکے کا منہ اتر گیا۔

"مجھ پر بھروسا کرو، میں سچ کہہ رہا ہوں ماموں حامد کا بھانجا ہوں۔ گاؤں سے آیا ہوں پڑھنے کے لیے، اب یہیں رہوں گا ان کے پاس۔" اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اچھا..... اس سے پہلے تو کبھی تم نظر نہیں آئے، شمع باجی نے بھی کبھی ذکر نہیں کیا۔" انمول اب تک محتاط تھی اور سمجھداری کا تقاضا بھی یہی تھا۔

"میں اتنا بور ہو رہا تھا اور تم لوگوں سے کھیلنے آیا تھا۔ پتا ہے مجھے بہت سارے کھیل آتے ہیں، پٹھو ماری، کھوکھو، پہل دوج اور لنگڑی پالا بھی آتا ہے۔" اس نے للچانے والے انداز میں بتایا تھا مگر دونوں پہلے سے بھی زیادہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگیں کہ ان عجیب و غریب کھیلوں کے نام انہوں نے پہلی دفعہ سنے تھے۔

وہ تو آنکھ مچولی، لوڈو، ریس، گروڑ پتی اور کرکٹ اور ہاکی جیسے کھیلوں سے واقف تھیں۔

"اگر تمہیں یہ کھیل نہیں آتے تو کوئی بات نہیں، میں تمہیں سکھا دوں گا۔" ان کے حوصلہ شکن رویے دیکھ کر اس نے ایک بار پھر انہیں دلچسپی دلانے کی کوشش کی۔

"اونہوں..... نہیں....." نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ ایمل کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف غیر محسوس طریقے سے بڑھی۔

"انمول..... ایمل....." اندر سے ماما کی آواز آئی تو وہ لڑکا چابکدستی سے اچھل کر پیڑ کی شاخ پر لٹکا اور ہلکا سا جھولا لے کر اپنے پیر دیوار پر جما کر اوپر ٹیرس میں پہنچ گیا۔ ٹیرس پر جا کر اس نے دونوں کو زبان چڑائی کیونکہ ان دونوں نے اسے لفٹ نہیں کرائی تھی۔

"کون ہے انمول، کس سے باتیں کر رہی ہو؟" ماما نے تجسس سے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ کیونکہ وہاں وہ دونوں اکیلی کھڑی تھیں۔

"وہ مہر آنٹی کے گھر سے آیا تھا ماما..... ہمیں نہیں پتا کون ہے؟" انمول منہ بسور کر بولی۔

"کیا مطلب.....؟ کون آیا تھا..... کوئی تھا ابھی یہاں پر.....؟" ماما نے ٹھٹک کر پوچھا۔ ان کی تشویش بجا تھی۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا وہ بڑی بے فکری سے دوپہر کو قیلولہ کیا کرتی تھیں اب یہ نئی بات پتا چلی تو پریشان ہو گئیں۔

"وہ ایک لڑکا ہے ماما..... کہہ رہا تھا کہ حامد انکل کا بھانجا ہے اور گاؤں سے آیا ہے۔" انمول کو تفصیل بتانی پڑ گئی ورنہ اس نے سوچا تھا کہ ماما سے اس بات کا ذکر نہیں کرے گی۔

"گاؤں سے؟" دونوں کی طرح ماما کو بھی حیرت ہوئی مگر اگلے ہی پل اُن کے ماتھے پر بل سے پڑ گئے۔

"جب تم اس کو جانتی نہیں تھیں تو دروازہ کیوں کھولا اس کے لیے..... اگر کوئی چور اچکا ہوتا یا غلط آدمی ہوتا تو نقصان ہو جاتا..... پھر کیا کر لیتیں تم.....؟" بڑی ہونے کے ناتے وہ انمول کی ہی کھنچائی کر رہی تھیں۔

"میں نے دروازہ نہیں کھولا..... وہ خود آیا تھا۔" انمول روہانسی ہو گئی..... اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"وہ یہاں دیوار سے کود کر اور پیڑ پر چڑھ کر آیا تھا۔" ایمل نے کھٹاک سے پوری بات بتا دی۔

"کیا.....؟" ماما کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"پوچھتی ہوں مہر سے، آخر کیا قصہ ہے یہ..... سب شرفا رہتے ہیں یہاں پر..... یہ کیا طریقہ ہے۔" وہ ناگواری سے بڑبڑاتی اندر مڑ گئیں۔

☆☆☆

اگلا دن شامتِ اعمال کا دن تھا۔ ماما نے فون پر مہر آنٹی سے بات چیت کی تھی اور کل والا واقعہ بھی ان کو جتایا تھا جس کے نتیجے میں مہر آنٹی شام کو چائے پر اُن کے گھر حاضر تھیں اور یوسف ان کے پاس ہی صوفے پر مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ایک بار اس کی نظر انمول سے ملی تو ان نظروں میں پگھلتے شکوے نے انمول کو شرمندہ کر دیا۔ اس نے جان بوجھ کر اس کی شکایت نہیں کی تھی سب کچھ خود بخود ہوا تھا۔

"میرا کوئی قصور نہیں..... اس کا طریقہ ہی غلط تھا۔" اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈھارس دی۔

"یہ کیا حرکت کی ہے یوسف بیٹا..... کتنی بری بات ہے کسی کے گھر میں دیوار پھلانگ کر جانا..... وہ تو شکر ہے کہ زیب کے گھر میں کودے اگر غلطی سے بائیں طرف والے پڑوس میں کود جاتے تو مرزا صاحب تو میری جان کو آ جاتے۔ اتنا سخت پردہ ہے ان کے گھر میں..... ایک مشکل کھڑی ہو جاتی۔" مہر آنٹی نے دھیمے ہموار لہجے میں یوسف کو گھرکا۔

یوسف کے پاس کوئی جواب نہیں تھا وہ گھر میں بھی ممانی کی اتنی باتیں سن چکا تھا کہ اب اپنے کیے پر پچھتاوا ہی ہو رہا تھا اور ان دونوں کے لیے غصہ بھر رہا تھا اس کے دل میں۔ رائی کا پہاڑ بنا دیا تھا دونوں نے اور برا الگ ٹھہرا تھا وہ۔

"مرزا صاحب بہت سخت مزاج کے ہیں، تمہارا پیچھا لے لیتے وہ....." ماما نے بھی اسے سمجھایا۔

"تم پڑھنے کے لیے آئے ہو یہاں پر، یہ سب کرنے نہیں اور چار دن ہوئے نہیں آئے ہوئے اور تم نے یہ حرکت کر دی۔ یہاں سب کے الگ، الگ گھر ہیں۔ اپنی، اپنی لائف ہے کوئی بغیر اجازت کسی کے گھر میں نہیں گھستا اور نہ ہی یوں بے تکلف ہوتا ہے۔ آئندہ دھیان رکھنا ورنہ واپس بھجوا دوں گی گاؤں۔" مہر آنٹی مستقل اسے سخت سست سنا رہی تھیں۔

وہ مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہنوز سر جھکائے بیٹھا تھا البتہ اس عزت افزائی پر اس کا چہرہ سرخ سا پڑ گیا تھا۔

"سوری آنٹی....." اس نے بھنچی بھنچی آواز میں ماما سے معذرت کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں گھر جا رہا ہوں....." وہ اکھڑے سے انداز میں بولا۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا، پہلے چائے پی لو پھر گھر چلے جانا اور ہاں دیکھو اپنی آنٹی اور میری باتوں کا برا مت ماننا، یہ سب تہذیب کی باتیں ہیں جو ہم تمہیں سکھا رہے ہیں اور تمہاری بھلائی کے لیے ہیں۔ تم ابھی کم عمر اور ناتجربے کار ہو، نئی جگہ پر آئے ہو اس لیے محتاط رہو، نئے لوگوں کے طور طریقوں کو سمجھو اور ان کو اپنا کر خود بھی اسی رنگ میں رنگ جاؤ....." ماما نے پیار اور سلیقے سے اسے سمجھایا۔

"جاؤ..... باہر گھوم پھر لو جب تک۔" ماما نے اس کی مشکل آسان کی۔ اتنی باتوں کے بعد اس سے وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔

"دراصل گاؤں میں بھی ان حرکتوں میں پڑ گیا تھا۔ یاری، دوستی کے چکر میں پڑ کر پڑھائی پر دھیان نہیں دے رہا تھا۔ باپ ہے نہیں، ماں، بہن نے سلائیاں کر کر کے پڑھایا ہے اسے۔ اب ان کے قابو میں نہیں رہا تو ماموں کے پاس بھیج دیا سدھارنے

کو..... اچھی دردِ سری ہے میری۔'' اس کے جانے کے بعد مہر آنٹی نے تفصیل بتائی۔

''کچھ دن لگیں گے ٹھیک ہو جائے گا سب..... میں نے دیکھا بد تمیز نہیں ہے وہ۔ ساری ڈانٹ خاموشی سے سن لی۔'' ماما نے مہر آنٹی کو تسلی دی۔

''ہاں..... لیکن کسی کی ذمے داری لینا بھی آسان نہیں..... کل کلاں ہاتھ سے نکل گیا تو اور مسئلہ..... سارا الزام ماموں کے سر ہی آئے گا۔ اس سال میٹرک کا امتحان دے گا پھر کالج میں ایڈمیشن کرانا ہوگا۔''

''شمع بھی تو اکیلی، اکیلی سی ہے، اچھا ہے اسے بھی کمپنی ملے گی۔'' ماما ان کے خیالوں کا رخ مثبت کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں، شمع پر ہی تو لاد دیا اس کو، وہی اس کو پڑھائے گی اور گائڈ کرے گی۔'' مہر آنٹی نے بیزاری سے کہا۔

معاً ماما کو خیال آیا کہ وہ دونوں وہاں بیٹھی یہ ساری گفتگو بغور سن رہی ہیں۔

''جاؤ، آپ دونوں کھیلو۔'' ماما نے دونوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔

مہر آنٹی کی زبانی کافی معلومات مل گئی تھیں دونوں کو اور اس کے لیے دل میں نرم گوشہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔

''بیچارہ اپنی ماما سے دور..... گھر سے دور یہاں اکیلا رہے گا۔'' انمول نے ہمدردی سے کہا۔

''اور مہر آنٹی کی ڈانٹ بھی کھائی..... بابا بھی نہیں اس کے تو۔'' ایمل کو بھی افسوس ہو رہا تھا اس کے حالات جان کر۔

باہر صحن میں وہ انہیں کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ خالی آنگن میں ہوا کی اٹھکیلیوں سے پودے جھوم رہے تھے اور دیوار پر چڑیاں بیٹھی شور مچا رہی تھیں۔

''یہ کہاں چلا گیا؟'' انمول کو فکر ہوئی۔ وہ ایمل کا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھی اور سب طرف نظریں دوڑانے لگی۔ کافی دیر بعد وہ اسے نظر آ ہی گیا تھا۔ رات کی رانی کے جھاڑ کی اوٹ میں کیاری کی منڈیر پر

تک کر بیٹھا تھا اور زمین پر پڑے پتوں اور پھولوں کو کسی تنکے سے اِدھر اُدھر ہلا جلا رہا تھا۔ وہ قریب پہنچی تو ایک ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر دوبارہ اس فالتو کام میں مشغول ہو گیا جیسے بہت مصروف ہو، اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ انمول کو نظر انداز کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس سے ناراض تھا۔

''تم یہاں کیوں بیٹھے ہو اُدھر چلو..... میں نے وہاں جھولا ڈالا ہوا ہے۔'' انمول نے دوستانہ انداز میں پیشکش کی۔

''شکریہ..... میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' وہ لٹھ مار انداز میں بولا۔

بے مقصد ہی رات کی رانی کے جھاڑ سے دو تین پتیاں توڑ ڈالیں۔

''تم ناراض ہو ناں.....؟'' انمول خود کو اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی ذمے دار سمجھ کر پست لہجے میں پوچھنے لگی۔

''میں کیوں ناراض ہوں گا تم سے، میں تو تم کو جانتا بھی نہیں۔'' وہ بدستور ناراض انداز میں بولا۔

''اچھا— وہ تو پہلے بات ہوئی تھی اب تو ہمارا تعارف ہو گیا ناں— تم حامد انکل کے بھانجے ہو۔'' اس نے بات بڑھائی۔

''یہ تو میں نے پہلے بھی تم کو بتا دیا تھا مگر تم تو مجھے جھوٹا اور چور سمجھ رہی تھیں۔'' وہ قدرے درشتی سے بولا۔

انمول سٹپٹا گئی۔ اس کا ردِ عمل جارحانہ سا تھا۔ جیسے ابھی لڑ پڑے گا۔

''نہیں تو..... میں نے تم کو جھوٹا اور چور کب کہا—؟'' وہ گھبرا کر بولی۔

''اور میری شکایت لگانے کیا ضرورت تھی؟ کیا میں کھا جاتا تم دونوں کو—'' اب وہ بڑے حق سے اس سے جرح کر رہا تھا کیونکہ سامنے کھڑی شرمندہ سی سہمی، سہمی لڑکی نے اسے بہادر بنا دیا تھا وہ اس کی پے در پے شکایات سے بوکھلا سی گئی تھی۔

''سوری..... فرینڈ..... وہ میری مجبوری تھی.....

پھر وہ مجھ پر شک کرتیں اور پھر ایمل بھی تو تھی وہاں پر..... اگر میں غلط بتاتی تو تو ایمل سچ بول دیتی۔'' اس نے صفائی پیش کی۔

''اوہ..... فرینڈ.....؟'' وہ طنزیہ ہنسا۔

''اب کیوں بنایا ہے مجھے فرینڈ..... اس وقت تو اپنی بہن کو منع کر رہی تھیں۔ اس پر بھروسا نہ کرو.....'' وہ کچھ بھی نہیں بھولا تھا، وہ بدستور لڑائی کے موڈ میں تھا۔ پلکیں جھپک، جھپک کر آنسو پیتی انمول پر ایک دم ہی اسے ترس آنے لگا۔ وہ اس کے سامنے کمزور پڑی تو وہ شیر ہو گیا ورنہ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس سے یوں بات کرنے کا۔

''اچھا، اچھا..... ٹھیک ہے..... معاف کیا میں نے..... اب جاؤ تم۔'' اس نے شاہانہ انداز میں اسے جانے کا حکم دیا۔

''کیوں جاؤ..... اب ہم کو وہ کھیل تو سکھاؤ ناں جو تم کہہ رہے تھے۔'' انمول جانے کب وہاں چلی آئی تھی۔

اس کے انداز پر یوسف کے چہرے پر خود بخود مسکراہٹ در آئی۔ کیسے حق سے وہ اس پر دھونس جما رہی تھی۔

''بچوں آ جاؤ..... چائے آ گئی ہے۔'' ماما نے دور ہی سے آواز لگائی۔ جس وقت وہ چائے پی رہا تھا تو انمول کی ناک کی نوک مارے ضبط کے ہلکی گلابی ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا اس کے ساتھ اسے اس چھوٹی سی لڑکی کو دکھ پہنچا کر افسوس سا ہوا۔

مہر آنٹی چائے پیتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ارے بیٹھو تو..... چلی جانا آرام سے، دو قدم پر تو گھر ہے۔'' ماما نے ان کو روکا۔

''شمع اکیلی ہے ناں..... تم کو پتا ہے پھر اس کے مزاج کا بھی..... ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا ہے۔ زیادہ دیر رکوں گی تو چڑ جائے گی۔'' وہ لاچاری سے بولیں۔

''اب یوسف کے آنے سے دوسرا ہٹ ہو گی تو امید ہے کہ اس پر اچھا اثر پڑ جائے گا۔'' ماما نے ان کو

مہر آنٹی کی ایک ہی بیٹی تھی شمع جو پولیو کا شکار ہو کر معذور ہو گئی تھی اور وہیل چیئر پر ہی زندگی گزار رہی تھی۔ اس معذوری نے اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ اور غصہ بھر دیا تھا۔ کبھی، کبھی تو وہ ہسٹیرک بھی ہو جاتی تھی اس لیے مہر آنٹی اس کو بہت سنبھال کر رکھتی تھیں۔

مہر آنٹی کے جانے کے بعد سب طرف ایک سکوت چھا گیا۔ ایمل اپنا ہوم ورک کرنے لگی اور انمول نے بیزاری سے بستہ اور کتابیں ایک طرف ڈال دیں۔ یوسف کے رویے پر اس کا دل بہت چھوٹا ہو رہا تھا۔

"ماما اور مہر آنٹی کے سامنے تو ایسے معصوم بن کر بیٹھا تھا اور جب میں نے بات کی تو اتنی بدتمیزی سے بات کی..... ویسے خود فری ہو رہا تھا تو کچھ نہیں اور جب میں نے دوستی کی بات کی تو ایسے بولا مجھ سے۔" اسے رہ، رہ کر یوسف پر غصہ آ رہا تھا۔ اس روز کے بعد وہ کئی دنوں تک اسے نظر نہیں آیا مگر پھر رفتہ، رفتہ وہ یوں ان سب کی زندگی میں گھل مل گیا کہ ان سب کی زندگی کی اہم ضرورت بن گیا۔ کئی دن تک تو ناراضی چلتی رہی۔ وہ اپنی ڈانٹ اور شکایت پر خفا ہو گیا اور انمول اس کی سرد مہری اور طنز پر روٹھ سی گئی تھی البتہ ایمل کو بے چینی سے اس کا انتظار تھا۔

"وہ لڑکا دوبارہ نہیں آیا..... کب آئے گا وہ.....؟" اس نے اشتیاق سے سوال کیا۔

"تو نہ آئے..... ہم کون سا اس کے انتظار میں بیٹھے ہیں، ہمیں اپنے بہت سے کام ہیں....." انمول نے نروٹھے پن سے بیزاری سے کہا۔

حالانکہ وہ خود بھی لاشعوری طور پر اس کی منتظر تھی مگر کئی بار ٹیرس کی طرف دیکھنے کے باوجود اس دن کے بعد سے پھر اس کی جھلک نظر نہیں آئی..... وہ دن میں کئی بار ادھر نظر ڈالتی یہاں تک کہ آمد شام کی ملگجاہٹ سب طرف پھیل جاتی اور ڈھلتی شام کے ساتھ، ساتھ انمول کی موہوم سی امید بھی ناامیدی اور اداسی میں ڈھل جاتی۔

نہ جانے کیوں اپنی تمام تر بیگانگی اور سرد رویے کے باوجود وہ اسے اچھا لگا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر وہ اس کو پڑنے والی ڈانٹ کا ذمے دار خود کو سمجھ رہی تھی..... یا پھر اس کی پہلی ملاقات کی اپنائیت اور دوستانہ انداز اس کو پسند آ گیا تھا۔

پندرہ، بیس دن بعد ایک روز صبح، صبح اسکول کی وین کا انتظار کرتے ہوئے بالآخر وہ نظر آ ہی گیا۔ وہ اپنے ماموں حامد کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر اسکول جا رہا تھا۔

اس وقت وہ بہت سیدھا، شریف اور تمیز دار لگ رہا تھا۔ حلیہ بھی معقول تھا۔ اسکول کے یونیفارم میں کافی مہذب لگ رہا تھا اور بال بھی شاید اس نے کٹوا دیے تھے جو شکل نکل آئی تھی ورنہ پہلے تو بالوں کا چھجا سا ماتھے پر گرا ہوا تھا اور شاید یوسف نے بھی اسے دیکھا تھا مگر دیکھ کر نظر انداز کر گیا۔ کوئی ہائے ہیلو نہیں کی۔ انمول کو نہ صرف دکھ ہوا بلکہ بہت برا بھی لگا۔

"ارے، وہی لڑکا..... وہ دیکھو مہر آنٹی کا گاؤں والا مہمان....." ایمل اس کے احساسات سے بے خبر بے اختیار چیخ پڑی۔

اور انمول جو اتنی دیر سے خود بھی یہی پوز کر رہی تھی کہ اس نے بھی اسے نہیں دیکھا اب ایمل کے یوں شور مچانے پر جز بز الگ ہوئی اور ایمل پر غصہ بھی بہت آیا کیونکہ اس کی بلند آواز لڑکے کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ خفیف سا مسکرا رہا ہے اور اگلے ہی پل اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے انمول کو چڑانے کے لیے ایمل کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ بھی ہلایا۔

"چپ کرو..... کیا گنواروں کی طرح شور مچا رہی ہو۔" اس نے بلاوجہ ایمل کو ڈانٹا۔

"اے ہیلو..... انمول بی بی اپنی دو سال کی بڑائی کسی اور پر جمانا۔ خواہ مخواہ مجھے گنوار کہہ رہی ہو۔" اس نے بدلحاظی سے جواب دیا۔

"بری بات..... لڑتے نہیں، انمول ٹھیک کہہ رہی ہے کسی کو دیکھ کر ایسے ری ایکٹ نہیں کرتے بیٹا۔

ہاں وہ حامد صاحب کا بھانجا ہی ہے۔ بڑے اچھے انگلش میڈیم اسکول میں اس کا داخلہ کرایا ہے انہوں نے۔" بابا جانے کب ان کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے تھے اور دونوں کی منہ ماری سن رہے تھے۔

اسی اثنا میں تیز ہارن بجاتی وین آگئی۔ اور دونوں بابا..... سے پیار لے کر وین میں بیٹھ گئیں۔ لیکن وہ سارا دن انمول نے ایمل سے بات نہیں کی۔

اگلی بار وہ اخبار لے کر ان کے گھر آیا تھا جو غلطی سے ہاکر مہر آنٹی کے گھر پھینک گیا تھا۔ دروازہ انمول نے ہی کھولا تھا۔

"تم.....!" اسے دیکھ کر اسے کرنٹ سا لگا جیسے یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں، ممانی نے اخبار بھجوایا ہے، ہاکر ہمارے گھر ڈال گیا غلطی سے۔" اس نے بھی بغیر سلام دعا کے جواب دیا۔

"اچھا، لاؤ دو....." اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر وہ اسے وہیں کے وہیں ٹرخانا چاہتی تھی کہ بابا کی نظر پڑ گئی۔

"ارے یوسف بیٹا آیا ہے..... آؤ، آؤ..... اندر آجاؤ....." انہوں نے فراخدلانہ انداز میں اسے محبت سے بلایا۔

اس کو پڑنے والی ڈانٹ اور شکایت کی کہانی ان کے علم میں بھی آگئی تھی۔ شاید ازالے کے طور پر وہ اسے اتنی اہمیت دے رہے تھے۔

اور کچھ یہ بات بھی تھی کہ اولاد نرینہ کی کمی سے ان میں ایک حسرت سی رہ گئی تھی۔ شاید اسی لیے وہ یوسف پر ہمیشہ مہربان رہے اور اسے خود سے قریب کرتے گئے۔ اتنا قریب کہ گھر کے ہر کام میں اسے پیش، پیش رکھتے۔ اپنے اندر کی ایک ناکام تشنہ آرزو کو تقویت دینے کے لیے وہ یوسف پر بے دریغ محبت لٹاتے تھے۔ ہر روز صبح سویرے اٹھ کر پودوں کو پانی دیا کرتے تھے۔ اب بھی وہ یہی کام کر رہے تھے کہ یوسف اخبار لے کر آگیا اور بابا نے دل کھول کر اس کا سواگت کیا۔

انمول کو اس کی یہ پزیرائی ایک آنکھ نہ بھائی۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہہ سکی البتہ روکھا سامنہ بنا کر پیچھے ہٹ گئی۔

ماما نے سب کے لیے ناشتا بنا لیا تھا بابا نے اصرار کر کے اسے اپنے پاس بٹھا کر چائے پلائی اور کیک بسکٹ اسے بھی کھلائے جو انمول نے فرمائش کر کے ماما سے بنوائے تھے۔ انمول سلگ، سلگ کر ناشتا کرتی رہی۔

اس سے تو بات کرنا درکنار وہ اسے پہچان بھی نہیں رہا تھا اور بابا اسے اتنی اہمیت دے رہے تھے۔

ایک روز وہ کھیر کا باؤل لے کر آیا تھا مہر آنٹی نے کھیر بھجوائی تھی اس روز انمول کو موقع مل گیا۔ اس سے کھیر کا پیالہ لے کر اس نے بے رخی اور بدتہذیبی کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا اور پیالہ لے کر مزے سے اندر آگئی اور فریج میں رکھ دیا۔ بڑے سکون اور خوشی کے ساتھ بیٹھ کر جوس پیا۔ آج اس نے اپنا تمام بدلہ چکا دیا تھا۔

پانچ منٹ بعد اطلاعی گھنٹی ایک تواتر کے ساتھ بجی تو ماما کچن سے ہڑ بڑا کر دروازہ کھولنے آگئیں۔ دروازہ کھولا تو بھری دھوپ کی تپش سے سرخ چہرہ لیے یوسف کھڑا تھا۔

"ارے بیٹا آپ..... آؤ، کیسے آنا ہوا؟" وہ اسے شفقت سے اندر لے آئیں۔

"پانچ منٹ سے یہاں کھڑا ہوں، کھیر لے کر آیا تھا، انمول پیالہ لے کر اندر آگئی تھی کہ ابھی خالی کر کے دے رہی ہوں اور ابھی تک آئی نہیں تو مجھے گھنٹی بجانی پڑی..... سوری آنٹی آپ کو تکلیف ہوئی۔" اس نے بھی جھوٹ بولنے کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔

بس پھر اس کے بعد شامت اعمال انمول کی تھی جسے نہ صرف ماما کی ڈانٹ سننی پڑی۔ "غیر ذمے داری کا لقب بھی ملا اور بدتہذیبی پر ایک لیکچر بھی سننا پڑا۔ اسی پر بس نہیں اسے سامنے بیٹھے شریف معصوم صورت بنائے یوسف کو ٹھنڈا اسکوائش بھی پلانا پڑا اور اس کا دل خون ہوتا رہا..... جی چاہ رہا تھا کہ اس اسکوائش میں

زہر ملا دے۔

زہر تو نہ ملا کی البتہ اسکواش کا گلاس دیتے ہوئے اس کے کپڑوں پر اسکواش چھلکا دیا۔ اس بار یوسف کھل کر مسکرا دیا تھا اور انمول اور بھی زیادہ تپ گئی تھی۔ شاید یہ سرد مہری کی لڑائی مزید کچھ دن اور چلتی مگر ایک دن پھر کچھ ایسا ہوا کہ خود بخود ہی دونوں میں دوستی ہو گئی۔

اطلاعی گھنٹی زور سے بجی تو وہ اپنے خیالات کی دنیا سے نکل آئی۔ ڈھلتی شام کے سائے سب طرف پھیل گئے تھے اور سورج کی تپش زدہ ہوا اب مہربان ٹھنڈے بادلوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی سرد جھونکوں میں بدل کر موسم کو خوشگوار بنا رہی تھی۔

ایمل کچن میں تھی کیونکہ برتنوں کی کھڑ پٹر کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سست قدموں سے چلتی دروازے تک گئی اور دروازہ کھولا تو سامنے یوسف کو دیکھ کر اس کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔

"ارے تم..... آؤ ناں..... اندر آؤ....." اس نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔

"وہ دراصل بابا نے بلایا تھا، ڈیکوریشن کا حساب کتاب کرنا تھا۔" وہ سہولت سے اندر چلا آیا۔ بابا کے بے حد اسرار پر وہ ان کو بابا ہی کہا کرتا تھا۔ اس کے ہر بڑھتے قدم میں استحقاق اور بے تکلفی تھی کہ یہاں کے چپے، چپے پر اسی کے قدموں کے نقش تھے اور انمول کے دل پر بیتے وقت کی محبتوں اور بے اختیاریوں کے نقش تھے جو مٹائے نہیں مٹ سکتے تھے۔

اس کی بات پر اسے یاد آیا کہ بابا نے اسے بلایا تھا مگر وہ تو اس وقت مٹھائی کے حصے بانٹنے گئے ہوئے تھے۔ اسے بلا کر وہ خود بھول گئے تھے۔ اور زندگی میں ایک ہی بھول کبھی کبھار ناسور بن جاتی ہے۔ ایسا روگ جو نہ جینے دے اور نہ مرنے دے..... انمول بھی یہ بات بھول گئی تھی۔ وہ دونوں وہیں لاؤنج کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور ایک دوسرے کو یوں دیکھنے لگے جیسے صدیوں کے بچھڑے سر اب ہو رہے ہوں۔ ان کو... کچھ کہنے کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں تھی وہ ایک دوسرے کی نظروں کی زبان دل کی زبان، بن کہے، بن سنے ہی سمجھ جاتے تھے۔

اس سے کہ جب محبت کا البیلا راگ ان کے گرد بڑے الوکھے سُر بکھیر رہا تھا۔ اور محبت کرب کی صورت ان کے وجودوں میں اترتی جا رہی تھی۔

گھنٹی کی آواز تو سنائی دی مگر آنے والی کی آواز نہ آئی، ایمل اسی تجسس میں کچن سے مصروف سے انداز میں باہر آئی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔

وہ دونوں والہانہ سی بے خودی کی کیفیت میں ارد گرد کو فراموش کیے جیسے ایک دوجے میں کھوئے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے قدموں کی ہلکی سی چاپ بھی ان کو سنائی نہ دی۔

"انمول..... اکب آئے یوسف بھائی آپ؟" اس نے کھنکھار کر قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

یوسف کچھ سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا اور نظروں کا زاویہ بھی بدل لیا۔ انمول بھی بے وجہ کلائی میں پڑی چوڑیوں پر انگلی پھیرنے لگی۔

"بابا نے بلایا تھا....." یوسف نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا..... مگر بابا تو ابھی نہیں ہیں، جب آئیں گے تو خود کال کر کے بلا لیں گے آپ کو....." ایمل نے قطعی سے انداز میں اسے جانے کو کہہ دیا تھا۔

"چائے بن گئی ہو گی، چائے تو پلا دو یوسف کو..... بری بات ہے گھر آئے مہمان کو چائے، پانی کو پوچھنا چاہیے۔ اب بڑی ہو جاؤ سسرال جا کر کیا کرو گی۔ وہاں تو جوتے پڑ جائیں گے اس غیر ذمے داری پر۔" اس سے پہلے کہ یوسف وہاں سے جانے کا فیصلہ کرتا انمول نے خود ہی ایمل سے چائے کا کہہ دیا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑا بھی کہ کل کے فنکشن کے حوالے سے اس کے چہرے پر گلابیاں سی بھر گئی تھیں۔ مگر اس کے مذاق پر ایمل مسکرا بھی نہ سکی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر رک گئی اور خاموشی سے پلٹ گئی۔ اس کی دور رس نگاہیں جو دیکھ رہی تھیں وہ بالکل ٹھیک نہیں تھا..... ایک بڑی تباہی اور طوفان نظر آ رہا تھا

جو اسے اندر ہی اندر ہولا رہا تھا۔

چائے بناتے ہوئے اس نے... کچن کی کھڑکی سے دیکھا وہ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ انمول کی ہنسی کی کھنکھناہٹ چاروں طرف کسی آوارہ خوشبو کی طرح بکھر رہی تھی۔

چائے کا برتن اٹھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور دل خدشوں سے لرزنے لگا۔ اس نے چائے دم پر ہی چھوڑی کمرے میں جا کر اپنا موبائل اٹھایا اور تیزی سے ایک نمبر پر دو تین بیل دیں..... ایک منٹ بعد ہی اس کا اپنا موبائل بجنے لگا۔ وہ تیر کی طرح باہر آئی اور بجتا ہوا موبائل انمول کی طرف بڑھایا۔

''تمہارا فون ہے..... میرا خیال ہے کہ تمہارے نمبر پر فون کر کے عاجز آ گئے ہوں گے جنید بھائی۔ اب میرے نمبر پر فون کیا ہے۔'' اس نے وزنی لہجے میں بہت کچھ جتایا۔ اس سے انمول کے شفاف چہرے پر ناگواری اور بیزاری کی لہر دوڑ گئی۔ فراخ چمکتی پیشانی پر لکیریں سی بن گئیں۔

''کال کاٹ دو..... ابھی میں مصروف ہوں۔''

اس نے موبائل لینے کے لیے ہاتھ بھی نہ بڑھایا۔

''ریسیو کر کے خود کہہ دو..... میں چائے بنا رہی ہوں۔'' وہ زبردستی اس کی گود میں موبائل ڈال کر کچن میں چلی آئی۔

مگر اس نے کال ریسیو نہ کی اور بے رحمی سے کاٹ دی۔ ایمل سے چائے بنائی دوبھر ہو گئی، وہ چائے لے کر ان کے پاس پہنچی تو دونوں کسی پرانی بات کو یاد کر کے ہنس رہے تھے۔ انمول اپنی کرسی سے اٹھ کر اب یوسف کے برابر والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ دونوں کے چہرے اندرونی خوشی سے تمتما رہے تھے۔ شاید وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور اسے دیکھ کر دونوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔

اسے گھبراہٹ کے مارے پسینے آنے لگے۔ وہ دل سے دعا مانگنے لگی کہ بابا جلدی آ جائیں۔

''یاد ہے ایمل تمہیں وہ کیریوں والی تھرل.....''

انمول نے اسے بھی شامل کرنا چاہا تھا۔

''میرے سر میں درد ہے..... میں اپنے کمرے میں ہوں.....'' وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے اعصاب شل ہو رہے تھے اور کسی انہونی کا اشارہ دے رہے تھے۔ وہ نڈھال سی بیڈ پر گر گئی۔

جو بات اسے غلط لگ رہی تھی وہ انمول کو کیوں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ہر طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں..... صرف دل کے دروازے کھولے کسی بھٹکے ہوئے گمراہ راستے پر چل پڑی تھی وہ.....

ایمل ان دونوں کے مابین تعلق کو جانتی تھی مگر وہ کس منہ سے بابا کو یہ بتاتی، اس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ کسی کو راز دار بنانا خود اپنا ہی تماشا بنانا تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ اپنی کمزوریوں کو ظاہر کر کے انسان اپنا بھرم کھو دیتا ہے اور اسے تو ابھی بھرم رکھنا تھا۔ فیصل کے ساتھ اس کا نیا، نیا سنجوگ بنا تھا۔ ایک ذرا سی بات فسانہ بن سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انمول کیوں اس اندھے راستے کی مسافر بن رہی ہے جہاں سوائے خارزار کے اور کچھ بھی نہیں۔

معاً انمول کی ہنسی کی مدھم سی جلترنگ سنائی دی۔ ایمل اس کی ہنسی کے سحر میں جکڑ سی گئی۔ ہنستی مسکراتی مدھم سی سرگوشیاں اور شبیہات اس گھر میں چاروں طرف بکھری تھیں اس وقت کہ جب وقت اپنا تھا اور سب طرف چھائی رونق میں محبت اور سکون بھی تھا۔ اسے بے اختیار وہ ہنستے ہوئے لمحے یاد آ گئے۔ جن کی بازگشت شاید اب بھی اس گھر کے در و دیوار میں اور کونوں کھدروں میں کہیں ہوتی تھی۔ وہ ہنستے ہوئے لمحے اسے رُلاتے چلے گئے۔

☆☆☆

گرمیوں کی لمبی دوپہریں اب اتنی بور اور بے رنگ نہ رہی تھیں۔ یوسف کے اضافے نے ایمل اور انمول کی زندگی میں نہ صرف رنگ بکھیرے بلکہ بوریت بھی دور کر دی۔ جب سے انمول اور یوسف کی دوستی ہوئی تھی فاصلے خود بخود مٹ گئے تھے۔ اسپلٹ کی

ٹھنڈک میں جب ماما اپنے بیڈ روم میں گرم دوپہروں میں آرام کرتی تھی، وہ دونوں دبے پاؤں باہر چلی آتی تھیں۔ جہاں یوسف کے ساتھ آنکھ مچولی اور پکڑم پکڑائی کھیلتی تھیں۔ وہ انہیں مرزا صاحب کے گھر میں لگے درخت سے کچے پکے بیر بھی توڑ کر دیتا تھا۔ دونوں اس کی مہارت پر حیران تھیں، یہ ان کے لیے بڑا نیا اور انوکھا طریقہ تھا۔ وہ ایک پتھر میں لمبی سی ڈوری باندھ کر اس کے ذریعے بیر توڑا کرتا تھا۔ آموں کے موسم میں کچی پکی کیریوں کے ڈھیر لیے چلا آتا جسے کالے نمک کے چسکے کے ساتھ مل کر خوب کھایا جاتا۔ اس کے علاوہ دوستی کی بنیادی وجہ وہ سائیکل بھی تھی جو اسے اس کے ماموں حامد نے دلوائی تھی اور اس نے انمول اور ایمل سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں بھی سائیکل چلانی سکھائے گا۔ کئی دنوں تک تو یہ پریکٹس چپ چاپ خاموشی سے ہوتی رہی مگر جس دن ایمل سائیکل سے گری اور اس کے گھٹنے اور ہاتھ سڑک پر گرنے سے چھل گئے تو یہ بھانڈا بھی پھوٹ گیا۔ اس روز دونوں کو ماما سے بہت ڈانٹ پڑی۔ لیکن پھر بابا کی طرفداری سے بالآخر انہیں سائیکل سیکھنے کی اجازت مل گئی۔

اس روز کھلی فضا میں پبلک پارک کے فٹ پاتھ کے ساتھ ڈگمگاتی سائیکل چلاتے ہوئے انمول کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ جو کام علی الاعلان کیا جاتا ہے اس میں زیادہ مزہ آتا ہے بہ نسبت اس کے کہ چوری چھپے کیا جائے مگر وہ اب بہت سے عام لوگوں کی طرح اپنے بچپن کے رٹے رٹائے اور سیکھے سکھائے سبق بھول گئی تھی۔

ماما نے باقاعدہ ایک ٹائم ٹیبل بنا دیا تھا کہ کب اور کس دن وہ کھیلنے جائیں گی۔ تھوڑی سی پابندی تو ہوئی مگر پھر اس میں بھی مزہ آنے لگا۔ ویک اینڈ پر تو اور بھی مزہ آتا تھا۔ اس روز بابا بھی گھر پر ہوتے تھے۔ ہر ویک اینڈ پر کرکٹ اور بیڈمنٹن کھیلنے کی عادت بابا نے ہی ڈالی تھی اور آخر میں آؤٹنگ کی عیاشی ساری کسر نکال دیتی۔ یوسف بھی اکثر ان کے ساتھ ہوتا تھا کبھی ایسا ہوتا کہ شمع باجی کی ڈانٹ ڈپٹ یا کسی بھول چوک کی سزا کے طور پر یوسف کو ان کے گھر جانے اور ان کے ساتھ کہیں جانے کی اجازت نہ ملتی۔ مگر شمع باجی کے منہ لگتے بھی ڈر لگتا تھا کہ وہ دو سینڈ میں عزت افزائی کر دیتی تھیں، ان کی گھوری اتنی خطرناک ہوتی تھی کہ دونوں ہی ڈر جاتی تھیں۔

پتنگ اڑانا بھی یوسف نے ہی ان دونوں کو سکھائی تھی۔ گرمیوں کی حبس بھری فضا ہو یا سردیوں کی دھند بھری شام..... ان دونوں کی ہر ساعت میں یوسف شربت میں گھلے رنگ کی طرح موجود تھا۔ اسی لیے اسے خود سے جدا کرنا بہت اذیت ناک تھا۔ کھٹکے کی آواز پر وہ چونک گئی، کمرے میں اندھیرا سا پھیل گیا تھا۔ باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ گھبرا کر اٹھی۔ بیرونی حصے میں بھی اندھیرا تھا۔ باہر کسی نے لائٹ نہیں جلائی تھی۔ انمول کہیں موجود نہیں تھی۔ اس نے لاؤنج کی اور پورچ کی لائٹ جلائی تو چونک گئی۔ انمول وہیں لاؤنج کی کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ کسی گہری سوچ میں گم..... کہیں بہت دور پہنچی ہوئی..... ایسی ویران جگہ کہ جہاں سے نکلنے کا رستہ بھی بھول چکی ہو۔ اس کے چہرے پر صحراؤں کی دھول سی اڑ رہی تھی۔ کانچ سی آنکھوں میں وحشت سی بھری تھی۔ یہاں تک کہ ایمل کا دل بھر آیا۔ اسے مجسمہ بنی انمول پر دکھ بھی ہو رہا تھا اور رحم بھی آ رہا تھا مگر وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اسی وقت اس کی گود میں پڑا موبائل تھرتھرایا۔ انمول نے چونک کر اسکرین دیکھی اس کا چہرہ سپاٹ تھا ہر احساس سے عاری مگر اس پر تناؤ تھا۔

''ہیلو.....'' کال ریسیو کر کے اس نے کھردرے سے انداز میں کہا۔ دوسری طرف پھوپی رقیہ جان تھیں۔

''کہاں ہوتی ہو انمول..... صبح سے دس بار فون کرا دیا مگر ملتی ہی نہیں۔'' پھوپی رقیہ جان نے اپنے مخصوص انداز میں شکوہ کیا۔

''جی بس مصروفیت چل رہی ہے آپ تو جانتی

ہیں کہ گھر کی تقریب میں کس قدر تھکن ہو جاتی ہے۔"
اس نے رکی سے انداز میں جواب دیا۔
دونوں کی بات چیت جاری تھی۔ ایمل کو خیال آیا کہ شام کے لیے پلاؤ بنانا ہے۔ سات بج چکے تھے اور بابا نو بجے کھانا کھانے کے عادی تھے۔ اس نے کچن کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ دوبارہ کسی کام سے اِدھر آئی تو اس بار انمول ہنس ہنس کر کسی سے بات کر رہی تھی۔
"اوہ.....!" اسے حیرت ہوئی۔
"ٹھیک ہے پھر کل شام پانچ بجے ٹھیک رہے گا۔"
اس کے سامنے ہی اس نے کال ختم کی تھی۔
"زہے نصیب تو جنید بھائی کی بھی قسمت چمک ہی گئی آخر..... شکر ہے تم نے لفٹ تو کرائی۔" وہ شوخی سے مذاق کرنا چاہتی تھی مگر انمول کی رکھائی کے سامنے شوخی بھی کہیں چھپ گئی تھی جیسے.....
"چپ کرو، الٹا سیدھا مت بولا کرو..... میں یوسف سے بات کر رہی تھی۔ مجھے بہت جلد اس مسئلے کو حل کرنا ہے اب....." اس کے اٹل سے انداز میں چھپی سنگینی کو محسوس کر کے ایمل پوری جان سے کانپ گئی۔
"تم غلط کر رہی ہو انمول..... دیکھو....." اس نے ہر بار کی طرح اسے سمجھانے کی ناکام سی کوشش کی۔
"خدا کے لیے اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھو، میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔" اس نے کڑے لہجے میں کہتے ہوئے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے اور پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔
اب وہاں لاؤنج میں کوئی نہیں تھا صرف ایمل کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اسے سب طرف گرد کے اڑتے طوفان میں تباہی پھیلتی دکھائی دے رہی تھی۔ حتیٰ کہ پورچ میں نمودار ہوتی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تب وہ چونکی۔ اسے حیرت ہوئی کہ گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز بھی اسے سنائی نہیں دی۔
"خیریت تو ہے ایمل..... گیٹ کیوں کھلا ہوا تھا؟ تم یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو؟" وقار صاحب نے تشویش سے پوچھا۔
"حالات پہلے ہی خراب ہیں بہت..... آئے دن لوٹ مار اور ڈکیتیوں کے واقعات ہو رہے ہیں۔ دھیان رکھنا چاہیے تھا اور پھر ٹائم بھی ایسا ہے۔" صائمہ آنٹی نے بھی سرد سے انداز میں لتاڑا۔
"وہ یوسف بھائی آئے تھے، آپ نے بلایا تھا ناں ان کو مگر پھر چلے گئے۔ میں ابھی گیٹ بند کرنے جا ہی رہی تھی۔" ایمل نے بہ مشکل اپنے اوسان سنبھال کر جواب دیا۔
درحقیقت تو وہ اعصابی طور پر بے حد بکھری ہوئی اور ڈری ہوئی تھی۔ فیصل سے اس کی منگنی صائمہ آنٹی نے ہی کرائی تھی وہ ان کے ماموں کا بیٹا تھا اور انمول کے عزائم جارحانہ تھے، کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ نیا رشتہ ابھی قائم ہی ہوا تھا کہ اسے ٹوٹنے کا دھڑکا لگ گیا تھا۔ اس نے فیصل کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ وہ اسے اچھا لگا تھا بلکہ سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی ایک نئی زندگی اور نیا ماحول چاہتی تھی۔ وہ پرانے دور کو بھولنا چاہتی تھی مگر ان کی یادیں انمٹ تھیں اور اب انمول تباہی کے دہانے پر کھڑی۔ سب کچھ تہس نہس کرنا چاہتی تھی اپنا آج بھی اور کل بھی اور ساتھ میں ایمل بھی گھن کی طرح ضرور پستی۔

☆☆☆

اگلا دن نہایت خاموشی سے نکلا تھا یا پھر ایمل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ الٹے سیدھے خیالات نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔ رات بے چینی میں گزری۔ آنکھ لگ جاتی تو ڈراؤنے اور بے تکے خواب دیکھ کر اٹھ جاتی۔ اس کی آنکھوں میں پھیلے گلابی ڈورے اس کے رت جگے کی چغلی کھا رہے تھے۔
"اوہو..... تو خوابوں میں بھی ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔" انمول نے طنزیہ سے انداز میں چھیڑا۔
ایمل کی بہ نسبت وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر تر و تازہ اور شاداب لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گلابیاں سی بکھری تھیں اور آج تو وہ کچھ اور بھی جاتی و چوبند اور

متحرک لگ رہی تھی۔ بلاوجہ لب مسکرا رہے تھے اور موڈ بھی بہت اچھا تھا۔ اس وقت بھی وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے سراپے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ پہلے سے کہیں بہتر اور خوب صورت ہوگئی تھی۔ اس سے اس کی غرور سے تنی گردن کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نہ صرف خود پسندی میں مبتلا ہوگئی ہے بلکہ خود غرضی کی حدوں کو بھی پہنچ گئی ہے۔ وہ صرف خود کو دیکھ رہی تھی اور کسی کو نہیں۔

''مجھے چھوڑو..... تم اپنی فکر کرو..... کہیں زیادہ لمبی چھلانگ لگانے سے منہ کے بل نہ گر جاؤ.....'' کل سے اب تک وجود کے اندر ہونے والی جنگ نے ایمل کے لہجے میں تلخی بھر دی۔

''تم اپنے ننھے سے ذہن پر زور نہ ڈالو اور پریشان بھی مت ہو.....'' اس بار انمول کا لہجہ نرم تھا مگر انداز حتمی تھا۔ اسی اثنا میں صائمہ آنٹی وہاں چلی آئیں۔

''انمول، تمہیں ٹیلر سے کچھ کام تو نہیں..... کون سے کپڑے پہنو گی تم کل جب ہم لڑکے والوں کے ہاں جائیں گے تو.....؟'' صائمہ آنٹی نے ان دونوں کے درمیان پھیلی کشیدگی کو محسوس کیے بغیر پوچھا۔

''میری فکر نہ کریں..... بہت کپڑے ہیں میرے پاس.....'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''ہاں، یہ بھی اپنا منگنی والا سوٹ پہن لے گی جو خالص جنید بھائی کی پسند کا تھا۔'' ایمل نے طنزیہ انداز میں لقمہ دیا۔

''آ..... اچھا..... ہاں وہ بھی ٹھیک رہے گا۔ میرا مقصد تھا کہ پہلے سے دیکھ لو کپڑے نکال کر کہیں کچھ آلٹریشن ..... وغیرہ تو نہیں کرانی..... چوڑا، پتلا تو نہیں کرنا۔'' صائمہ آنٹی نے ہلکے سے قہقہہ لگا کر کہا۔

شاید انہوں نے انمول کی بھری، بھری جسامت پر طنز کیا تھا۔ انمول کی آنکھوں میں برہمی جھلکنے لگی۔

''شام کو شاپنگ پر چلنا ہے، ابھی دیکھ لو، سب ورنہ پھر ایمرجنسی بھاگ دوڑ ہوتی ہے۔'' صائمہ آنٹی نے مزید ہدایت دی۔

انمول کچھ نہ بولی، ایمل نے تعجب سے اسے دیکھا کیونکہ اس نے تو شام کو یوسف سے ملاقات طے کر رکھی تھی مگر انمول اب ہر کام پہلے سے طے کر کے کرتی تھی۔ اسی لیے سرِ شام ہی جویریہ کی آمد پر انمول کھل اٹھی۔

''ارے جویریہ..... کیسی ہو تم..... بڑے دن بعد آئیں؟'' وہ اس کے گلے لگ کر بناوٹ سے بولی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ جویریہ کو اس نے خود ہی بلایا تھا جویریہ اس کی بہت گہری دوست تھی اور اس کے بہت سے رازوں کی راز دار بھی تھی بلکہ یوسف اور انمول کے درمیان پنپنے والی محبت کی مددگار بھی تھی۔ اس نے ہمیشہ دوست ہونے کا حق ادا کیا تھا۔

''او کے..... صائمہ آنٹی میں جویریہ کے ساتھ شاپنگ پر جا رہی ہوں۔'' اس نے انہیں سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نہیں دی۔

''ارے مگر..... مجھے بھی تو جانا ہے.....'' صائمہ آنٹی اس وقت کچھ نہ کر پائیں وہ انمول کو روک نہ پائیں اور روکتی بھی تو کیسے روکتیں کہ وہ تو پروا کے آوارہ جھونکے کی طرح جھومتی جھامتی اونچی فضاؤں میں ڈول رہی تھی۔

جویریہ اب بھی اس کی مددگار رہی..... جویریہ کو ڈھال بنا کر اس نے یوسف کے ساتھ ایک یادگار شام گزاری..... وقت تھا کہ تیزی سے گزر رہا تھا اور اب دونوں کا باتوں سے دل ہی نہیں بھر رہا تھا کہ یہ موقع بڑے دنوں بعد ملا تھا۔ اس کیف آور ملاقات سے سرشار جب وہ گھر پہنچی تو لاؤنج میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ سامنے صوفے پر جنید بیٹھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سادہ سے عوامی سوٹ میں وہ خود بھی سادگی کا مرقع لگ رہا تھا۔

سارا مزہ کرکرا ہوگیا وہ ناچار اس کے پاس گئی۔ اسے دیکھ کر ایک بے ساختہ مسکراہٹ جنید کے چہرے پر پھیل گئی۔

''کب سے آیا ہوا ہوں..... کہاں تھیں۔ موبائل بھی آف تھا۔'' اس نے نرمی سے پوچھا۔ انمول کے اندر باہر کڑواہٹ سی بھر گئی۔ بھلا وہ کون ہوتا تھا اس سے سوال جواب کرنے والا..... یہ زبردستی کا بندھن

اب ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔

''جویریہ کے ساتھ گئی تھی۔ خیریت ہے کیسے آگئے.....؟'' اس نے عام سے انداز میں پوچھا مگر اندر کی ناگواری چھپا نہ سکی۔

''یونہی.....اماں نے یہ بھیجا ہے تمہارے لیے۔'' اس نے پاس رکھا شاپر اسے تھما دیا۔

''اماں نے.....؟'' وہ حیرت سے بڑبڑائی۔

شاپر میں ایک چھوٹا سا مخملی باکس تھا جس میں دو خوب صورت طلائی کڑے سجے تھے۔

''بڑا آیا ماں کا بیٹا.....کا کا.....جیسا نہ ہو تو.....'' وہ دل ہی دل میں اسے نوازنے لگی۔

''آیئے جنید بھائی کھانا لگ گیا۔'' ایمل نے آکر اطلاع دی۔

''ارے یہ کیا تکلف کیا.....چاچی انتظار کر رہی ہوں گی پہلے ہی دیر ہوگئی۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں نکل چکا ہوں۔'' اس نے شائستگی سے معذرت کی۔ ایمل کے دو تین بار اصرار پر بھی وہ راضی نہ ہوا تو وہ پلٹ گئی۔

''کیسے لگے؟'' ایمل کے جاتے ہی اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

اس کے چہرے پر پھیلا اشتیاق، سادگی اور سادہ سی مسکراہٹ اسے سخت زہر لگ رہی تھی۔

''کیا ضرورت تھی اس کی..... میں تو ویسے بھی میچنگ کی چوڑیاں پہنوں گی۔' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے انمول نے رکھائی سے جواب دیا۔ اس کا سرد لہجہ ایسا تھا جیسے وہ کہنا چاہ رہی ہو کہ کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی۔ اس کے روکھے سے جواب پر جنید کا چہرہ بجھ گیا۔

''اچھا چلتا ہوں.....خدا حافظ.....'' وہ ایک دم اٹھا اور لاؤنج پار کر گیا۔ انمول نے جواب میں اسے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ صائمہ آنٹی جب تک آئیں وہ گیٹ تک پہنچ چکا تھا، وہ اس کے پیچھے وہیں پہنچ گئیں۔ دونوں میں کیا بات ہوئی اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اس نے وہ کڑے بھی بیزاری سے ایک طرف ڈال دیے۔

''کتنی بری بات ہے.....اتنی دور سے آیا اور صرف اسکواش پی کر چلا گیا۔ تم نے اتنی دیر لگا دی ورنہ کھانا کب کا تیار تھا۔ کہاں رہ گئی تھیں؟'' اپنی بات کہتے، کہتے صائمہ آنٹی نے اسے مخاطب کیا۔

''جی.....کیا کہا.....؟'' انمول نے ساری بات سنی ہی نہیں تھی وہ تو بس اپنی سوچوں میں گم تھی۔

''میں نے ہی زور دیا تھا کہ اسے ایمل کے دولہا کو انگوٹھی پہنانے ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ میرے ہی اصرار پر وہ آیا مگر اس قدر انا ہے کہ سسرال میں رہنے کے بجائے اپنے چاچا کے گھر رک گیا اور ادھر تم نے اتنی دیر لگا دی۔'' صائمہ آنٹی کو رہ، رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔ اپنی پریشانی میں انہوں نے نوٹ ہی نہیں کیا کہ انمول ان کی کسی بات پر توجہ نہیں دے رہی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے صائمہ آنٹی کو روکھا سا جواب دے دیا۔ کھانا کھا کر ایمل کمرے میں آئی تو انمول کے پاس مخملی باکس دیکھ کر اٹھا لیا۔ کھول کر دیکھا آنکھوں کو خیرہ کرتے نگینوں سے جگر، جگر چمکتے کڑے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک گئیں۔

''بیوٹی فل.....یہ.....یہ.....شاپنگ کی ہے تم نے؟'' اس نے حیرت سے انمول کو دیکھا۔

''یہ کڑے وہ بیوقوف لے کر آیا تھا۔ اماں نے بھجوائے ہیں۔'' اس نے منہ چڑا کر اس کی نقل اتار کر بتایا۔

''چچ.....چچ.....کتنی بری بات ہے انمول، جنید بھائی تمہارا اتنا خیال کرتے ہیں اور تم کیسے، کیسے خراب القابات دے رہی ہو ان کو.....'' ایمل نے اس کے احساس کو جگانا چاہا۔

''میرے سامنے اس کی وکالت نہ کیا کرو.....جس دیس جانا نہیں اس کے کوس کیا گننے.....؟'' انمول نے سراسر حقارت سے کہا۔

''خدا کو مانو انمول.....یوں تو برباد ہو جاؤ گی تم۔'' ایمل نے دہل کر کہا۔

''اگر کچھ کر نہیں سکتیں تو بد دعا بھی مت دو.....''

وہ تلخی سے بولی۔

"میں تمہیں بددعا نہیں دے رہی — میں تو تم کو بچانا چاہتی ہوں پریشانیوں اور مصائب سے — میں آنے والے وقت کی توڑ پھوڑ سے خوفزدہ ہوں۔" اس کے یوں منہ بھر کر بددعا دینے والی بات پر تڑپ کر ایمل نے صفائی دینے والے انداز میں وضاحت دی۔ انمول اس کی ماں جائی تھی وہ اس کی بھلائی چاہتی تھی اور انمول اس سے بدگمان ہوگئی تھی۔

"تم اپنا دیکھو میری فکر میں دبلی نہ ہو۔ میں خود سنبھال لوں گی سب کچھ — اتنا بہت کچھ سہہ کر اب مجھے بھی مسائل کو ہینڈل کرنا آگیا ہے۔" انمول نے خشک لہجے میں اسے تنبیہ کی۔

ایمل اس کے بیگانے سے انداز پر دکھی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی کیونکہ اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ لفظ نہیں بچے تھے۔

انمول بیزاری سے مشرقی کھڑکی میں کھڑی ہوگئی — آسمان پر اب چاند تاروں کی حکومت تھی۔ گہرے گھور آسمان کی وسعتوں میں ٹمٹماتے ستاروں اور چاند نے گہری چپ سادھ رکھی تھی۔ جیسے ان کے اندر چھپے بہت سے اسرار کہیں افشانہ ہوجائیں۔

☆☆☆

اور وہ بھی ایک ایسی ہی اداس اور اکیلی رات تھی جب وہ پورچ کی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی خود کو تنہا اور شکستہ محسوس کررہی تھی کہ یوسف نے ٹیرس سے آواز دی۔

"ہے — کیا ہوا — سوئی نہیں ابھی؟" اس نے کچھ بلند آواز میں پوچھا۔

"نہیں — مجھے نیند نہیں آرہی۔ جب تک ماما گھر نہیں آجائیں مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگے گا۔" اس نے بھیگی، بھیگی آواز میں جواب دیا۔ اگلے ہی پل یوسف درخت کی شاخ سے لٹک کر اس کے پاس آبیٹھا۔

"ہائے — واپس جاؤ ابھی — کوئی دیکھ لے گا تو —" انمول کو جیسے کرنٹ لگا وہ اچھل کر رہ گئی۔

"ایک تو میں دلجوئی کرنے آیا ہوں اوپر سے مجھے باتیں سنا رہی ہو۔" وہ خفا ہوا۔

"ٹائم دیکھا ہے، رات کے دس بج چکے — ابھی ماما، بابا بھی آتے ہوں گے۔" اس نے احساس دلایا۔

ماما چیک اپ کے لیے گئی ہوئی تھیں — ان کا علاج کافی مہینوں سے جاری تھا۔ ان کے گردوں میں مسئلہ چل رہا تھا اور اب وہ کافی تکلیف دے رہا تھا اس لیے آج سہ پہر سے ماما گھر سے گئی ہوئی تھیں اسی لیے وہ اداس بیٹھی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے پھر —؟ میں چلتا ہوں، مجھے لگا شدید تمہیں میری ضرورت ہے۔" وہ اس کی بات سن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"یو — سوف — کچھ دیر رک جاؤ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"کیوں — اب کیوں روک رہی ہو — اور ایمل کہاں ہے؟" اس نے خفگی بھرے انداز میں اپنائیت سے پوچھا۔

"وہ سوگئی ہے — مگر میں سو نہیں پارہی — پتا نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔" وہ اپنے احساسات کہتی چلی گئی۔

"گھبراؤ مت — میں تمہارے پاس ہوں، ماما بھی آجائیں گی گھر، پریشان نہ ہو۔" یوسف نے اس کے یخ بستہ ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

اس وقت جیسے اسے کوئی احساس ہی نہیں رہا اس کے ساتھ کی تقویت سے اس نے خود فراموشی کی کیفیت میں اس کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔

"ارے، تم رو رہی ہو؟" اپنے شانے پر نمی محسوس کر کے یوسف نے بے اختیار اسے تھام کر چہرے پر نظر ڈالی۔ اس سے وہ دل میں اترنے کی حد تک پیاری اور دل سے قریب لگی۔ یہ پہلی واردات ہوئی تھی اس کے قلب پر۔

"روؤ مت — خدا سے دعا کرو — سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے تسلی دی۔

"خود کو اکیلا نہ سمجھو، میں تمہارے ساتھ ہوں — تم

بہت پیاری اور اچھی لڑکی ہو..... تم نے مجھے اسیر کرلیا ہے انمول..... میں..... میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔ میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا..... پلیز مت روؤ....."

اس وقت چاند تاروں کے تھال تلے..... مدھم سے اجالے میں وہ اپنے جذبات و احساسات اس پر نچھاور کرتے ہوئے بے خودی کی کیفیت میں چلا گیا تھا۔ ماہ و سال کی روانی میں وہ اٹھارہ کا سن پار کر چکا تھا مگر اس کی اٹھان غضب کی تھی اور ماموں حامد کے گھر رہائش نے اسے مکمل طور پر سنوار کر کچھ اور بھی وجیہہ بنا دیا تھا۔ اور انمول اس وقت پندرہ برس مکمل کر چکی تھی۔ وہ نامانوس سے جذبات کی آنچ سے پگھلتی مکمل طور پر یوسف کے سامنے جھک گئی تھی۔

ٹیرس پر کھٹکا سا ہوا تو دونوں چونک پڑے۔

"یوسف....." شمع باجی کی واضح پکار سے دونوں کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ انہوں نے ٹیرس کا بلب روشن کر دیا تھا جاتے ہوئے بھی انمول وہاں سے ہٹ نہ سکی اور یوسف کو اس کے پاس بیٹھے دیکھ کر شمع باجی نے کڑے تیوروں سے اس کو گھورا۔

"تم وہاں کیا کر رہے ہو اس وقت.....؟" انہوں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں، انمول نے آواز دے کر بلایا تھا۔" یوسف کی بات سن کر انمول کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"یہ کہہ رہی تھی کہ شمع باجی کو بلا دو..... اسے ڈر لگ رہا تھا کیونکہ اس کے ماما، بابا ابھی تک اسپتال سے نہیں آئے۔" یوسف کی اگلی وضاحت سے انمول کی سینے میں اٹکی سانس بحال ہوئی۔

"اچھا....." اتنی معقول وجہ سن کر وہ کچھ کہہ نہ سکیں مگر عجیب نظروں سے انمول کو دیکھتی رہیں۔

"اتنی رات کو یہاں سیڑھیوں پر کیوں بیٹھیں آکر..... کمرا بند کر کے لیٹ جاتیں، مجھے فون کر دیتیں یا پھر....." شمع باجی نے اسے ڈپٹنے والے انداز میں کہا۔

"اور تم سے ہزار بار کہا ہے مجھے شمع باجی نہیں شمع جی کہا کرو..... سمجھ نہیں آتی ایک بار....." پھر یوسف کی شامت آئی تو اسے سنانے لگیں۔ نہ جانے انہیں اپنی عمر چھپانے یا چھوٹی بننے کا کیا شوق تھا کہ باجی کے لفظ پر منہ سے اکھڑ جاتی تھیں۔

"اور یہ تم گئے کیسے تھے اُدھر..... پھر دیوار پھلانگی ہے ناں..... بتاؤں گی میں ممی کو....." شمع باجی نے دھمکی دی۔

"وہ..... یہ رو رہی تھی ناں....." اس نے صفائی دینی چاہی۔ اسی وقت مرکزی دروازے پر گاڑی کی مخصوص آواز سنائی دی اور یوسف لپک جھپک شاخ سے لٹک کر دیوار پھلانگ کر اپنے ٹیرس میں کود گیا۔ اب وہ شمع جی کو ہاتھ جوڑ کر منا رہا تھا۔ انمول کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

بابا، ماما کے اندر آنے سے پہلے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں واپس آگئی مگر اس روز وہ اپنا دل یوسف کو دان کر چکی تھی۔ اس روز وہ محبت کی مسافر بن کر محبت کی نگری میں در، در پھرتی رہی۔ اس رات وہ جب کمرے میں واپس آئی تو اس کے اندر بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ وہ یوسف کی محبت کا بیج بو کر اس کی آبیاری شروع کر چکی تھی۔

وہ دونوں اب دوستی سے اوپر محبت کی ڈور سے بندھ گئے تھے۔ ماحول پر چھائی تاریکی اور خاموشی کو دور سے آتی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے پاٹ دیا اور خاموش فضا میں کار کی مدھم سی روشنی قریب آتی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی مہر آنٹی کے گھر کے باہر رک گئی۔ خلاف توقع گاڑی سے یوسف کو اترتے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔ خیال تھا کہ وہ ضرور ادھر دیکھے گا مگر ایسا نہیں ہوا اس نے گاڑی سے اتر کر مرکزی دروازہ کھولا اور پھر دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اندر لے جانے لگا۔ پچھلی نشست پر مہر آنٹی اور شمع جی کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے کچھ اور اچک کر کچھ دیکھ لینے کی کوشش کی مگر بیکار رہا کیونکہ گاڑی اندر جا چکی تھی۔ اب اگر وہ اوپری منزل کے ٹیرس سے جا کر جھانکتی تو اسے کچھ نظر آسکتا تھا مگر رات کے اس پہر جب پورے گھر

پر خاموشی کی دبیز چادر تنی تھی اس کا دل نہ چاہا کہ وہ ٹیرس پر جائے۔ یوسف کو تو وہ دیکھ ہی چکی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ اسمارٹ اور جاذب نظر ہو گیا تھا۔ اس کا سراپا دل و نظر میں بسائے جانے کب وہ نیند سے ہم آغوش ہوئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔

صبح چپ چپاتے گہری خاموشی سے گزر گئی۔ وہ خوابوں کی نگری میں مست البیلی معشوقہ کی طرح یوسف کے سنگ گھومتی رہی..... دھوپ دریچوں کو چھونے لگی مگر نیند کی حالت نہ ٹوٹی۔

''اٹھو بھئی کچھ گھر کی بھی خبر لو..... ایمل بیچاری اکیلی کیا، کیا دیکھے گی۔'' صائمہ آنٹی نے اس کا کندھا زور سے ہلایا۔ اسے سخت ناگوار گزرا..... اس نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں اور پھر موند لیں۔

''اوں..... ہوں..... اٹھ جاؤں گی، سونے دیں ابھی۔'' اس نے کروٹ بدلنی چاہی۔

''دوپہر ہو گئی ہے، مجھے بہت کام کرنے ہیں ابھی..... ایمل کے ساتھ مل کر پیکنگ ہی کرا دو..... کیسی بہن ہو تم؟ ایک کام نہیں کرا رہی ہو اس کے ساتھ۔ آج جانا بھی ہے فیصل کے گھر.....'' صائمہ آنٹی نے جھنجلا کر اس کا شانہ جھنجھوڑا۔

اتنی تفصیلی بات سن کر وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ آنکھیں رگڑتے ہوئے وہ تکیے کے سہارے تھوڑا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''دوپہر ہو گئی؟ کیا ٹائم ہوا ہے؟'' اس نے سوتی آواز میں پوچھا۔

''ایک بجنے والا ہے، کیا ہو گیا انمول، تم پہلے تو اتنی سست نہ تھیں۔'' صائمہ آنٹی کے انداز میں بیزاری تھی۔

''اٹھ تو گئی اب.....'' وہ چڑ کر بولی۔ ''ایمل کہاں ہے؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''ایمل کچن میں دوپہر کے کھانے کے لیے سلاد بنا رہی ہے۔ اب اٹھو اور فٹافٹ چائے بنا کر پیو تاکہ یہ سستی، کاہلی ختم ہو۔'' صائمہ آنٹی نے ڈپٹ کر کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔

انا گیر

نئی سلسلے وار کہانی

ریت کے سمندر سے نمو پانے والے
ایک شیر دل نوجوان کی داستان

جس کا دل محبت کا اسیر تھا

مگر

وہ ہر ظلم و جبر کے سامنے قہر بار تھا

تحیر اور ہنگاموں میں پروان چڑھتی

دلکش و دل ربا تحریر

امجد جاوید

کے قلم سے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

میں فروری 2020ء
سے پیش کی جا رہی ہے

''اونہہ..... ایسے آرڈر کر رہی ہیں جیسے ان کے حکم کی غلام ہوں..... بہت مان لی میں نے سب کی۔''
وہ باغیانہ سے انداز میں بڑبڑاتی بیڈ سے اتری۔

ہاتھ منہ دھو کر اور بال بنا کر جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو اذان ظہر کی آواز بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایمل واش بیسن میں ہاتھ دھو رہی تھی اسے دیکھ کر اس نے کوئی خاص تاثر نہیں دیا۔

انمول دھپ کر کے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئی اور پلیٹ میں رکھا چمچہ پلیٹ پر بجانے لگی۔ ایمل نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کچن میں جا کر اس کے لیے چائے بنا کر لے آئی اور اس کے سامنے رکھ دی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں اداسی تھی۔

''اے..... ناراض ہو کیا؟'' انمول نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

''مجھے کوئی حق نہیں تم سے ناراض ہونے کا۔'' وہ ناراضی بھرے انداز میں بولی۔

''ارے واہ..... ایک ہی تو بہن ہے میری اور وہ بھی مجھ سے ناراض نہ ہو تو کتنی بری بات ہے ناں.....'' وہ بدستور شرارت کے موڈ میں تھی۔

اس نے دھیرے سے ایمل کی کلائی پکڑ لی۔

''آئی ایم سوری..... رات میں کچھ زیادہ ہی اوور ہو گئی تھی۔ میں نے کچھ غلط کہہ دیا تھا تم کو.....'' اس نے مدھم لہجے میں اس سے معذرت کی۔

اس کے ذرا سے التفات پر ایمل نرم پڑ گئی آخر وہ اس کی بہن تھی۔ وہ زیادہ دیر خفگی برقرار بھی نہیں رکھ سکتی تھی کہ وقت نے اسے سمجھوتا کرنا سکھا دیا تھا۔

''غلطی کرنا انسان کی سرشت ہے اور غلطی کو مان لینا بہت بڑی خوبی ہے لیکن غلطی کو درست نہ کرنا اور غلطی کو دہرانا اس کی زندگی کی سنگین غلطی بن جاتی ہے۔'' ہلکے سے مسکرا کر ایمل نے بند لفظوں میں اسے بہت کچھ باور کرانے کی کوشش کی۔ انمول نے چند لمحے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ خود سے چھوٹی ایمل بے حد سمجھدار، سنجیدہ اور بڑی، بڑی لگنے لگی۔ وہ مختصر سے عرصے میں ہی بہت بدل گئی تھی۔

''کیا بات ہے بھئی..... بیچارے فیصل پر رحم آ رہا ہے مجھے، روز لیکچر سن کر کیا حال ہوگا اس کا۔'' اس کی بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے اس نے ہنس کر کہا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ ایمل کی بات سن کر اندر سے کچھ بے چین سی ہو گئی تھی۔

''میری بات پر سنجیدگی سے غور کرنا، اسے مذاق میں مت اڑاؤ.....'' ایمل کے لہجے میں سنجیدہ پوشیدہ تھی۔

''اچھا.....! مگر میری بات بھی یاد رکھو کہ جو لوگ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں وہ بزدل اور کمزور لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں ہر کوئی اپنے مفاد میں استعمال کر لیتا ہے۔ ان کے حصے میں گھاٹا آتا ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں ایمل کو جتایا۔

''اچھا.....'' ایمل نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

''مگر میں سمجھتی ہوں کہ وقت اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہی عقلمندی ہے کیونکہ نہ ہم وقت بدل سکتے ہیں اور نہ حالات کو البتہ خود کو ضرور بدل سکتے ہیں۔'' وہ ناصحانہ انداز میں بولی۔

''بہر حال..... سب کی اپنی، اپنی سوچ ہوتی ہے۔ مجھے نہ شکست پسند ہے اور نہ بزدلی..... بہتر ہوگا کہ اس ٹاپک کو مزید ڈسکس نہ کریں۔ ویسے بھی آج تمہاری زندگی کا اہم دن ہے۔ فیصل تمہاری زندگی میں شامل ہو رہا ہے۔ خوش قسمت ہو تم، آج کے دن تمہارے دل میں پہلے سے کوئی قبضہ ...کر کے نہیں بیٹھا ہوا ورنہ سوچو کتنی مشکل ہوتی ایڈجسٹ کرنے میں..... مگر تم کہاں سمجھو گی میری فیلنگز کو..... جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے اس درد اور تکلیف کو.....'' جذبات کی رو میں انمول بولتی چلی گئی اور ایمل ایک بار پھر لاجواب سی ہو کر اسے دیکھتی رہ گئی۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ انمول سے کچھ کہنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ شام تک اس نے ...

بہ مشکل اپنا موڈ بحال کیا اور مسکرا کر سب سے ملتی رہی۔ انمول البتہ خوشگوار موڈ لیے سب سے مل رہی تھی۔ اس نے زبردستی کے مذاق کر کے ایمل کے ساتھ مل کر پیکنگ بھی کرائی۔ آج وہ بڑے دل سے تیار ہوئی تھی۔ میرون اور گولڈن بنارسی پٹی کے دوپٹے کے ہالے میں وہ دمک رہی تھی۔ میرون فراک کے گھیر پر بھی گولڈن بنارسی بارڈر تھا۔ ساتھ میں میرون نگوں اور زرقن کا خوب صورت طلائی سیٹ اسے چار چاند لگا رہا تھا۔

''اُفوہ..... آج تو چاند نکل آیا زمین پر۔'' کسی نے برملا تعریف کی۔

''لگتا ہے کہ جنید کی محبت راس آگئی ہے۔'' کسی اور دل والے نے فقرہ کسا۔

اسے لگا کسی نے اسے پتھر کھینچ مارا۔ لبوں کی مسکراہٹ ایک آن میں غائب ہوئی اور موڈ آف سا ہو گیا۔ وہ منظر سے ہٹ کر دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق سب کو یہاں جمع ہو کر اکٹھے فیصل کے گھر کی طرف جانا تھا ابھی کچھ مہمانوں کا انتظار تھا کچھ ہی دیر بعد پورچ سے مانوس سی آواز سن کر وہ تیزی سے اُدھر لپکی۔

یوسف گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ آج اس نے رائل بلیو رنگ کا عوامی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس کے شانے پر دیدہ زیب رنگوں کی مشینی کڑھائی کی گئی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں موبائل تھا اور دائیں ہاتھ سے وہ عادت کے مطابق اپنے سر کے بالوں کے پچھلے حصے کو سنوار رہا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُرکشش اور دراز قامت ہو گیا تھا۔ یوسف کی ایک نظر اس کے حسنِ جہاں سوز پر پڑی اور وہ تھم سا گیا۔

وہ اپنے ہوشربا حسن سمیت اس کے دل کے ایوانوں میں تھسی جا رہی تھی۔ کٹاؤ دار ہونٹوں پر میرون لپ اسٹک کی تہ انہیں کچھ اور بھی خم دار بنا رہی تھی۔ آج وہ بڑے دل سے تیار ہوئی تھی اور جس کے لیے تیار ہوئی تھی وہ عین اس کے سامنے تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے ہوش اڑاتے رنگ و روپ کے سامنے کنگ سا کھڑا اسے تک رہا تھا جیسے سوائے اس کے باقی سب کچھ بھول چکا ہو۔

''یوسف.....'' اس نے دل میں ہی پکارا تھا۔

یوسف مسمرائز سا دو چار قدم اس کی طرف بڑھا ہی رہی تھی کہ پیچھے سے آتی کھنکھار پر کچھ چوکنا سا ہو کر تھم گیا۔

یہ مہر آنٹی کی کھانسی کے ٹھسکے کی آواز تھی۔ یوسف کے پیچھے مہر آنٹی خراماں، خراماں سی کچھ چلی آ رہی تھیں۔ ہلکے کاسنی کپڑوں میں وہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ خوش اور چست لگ رہی تھی اور ان کے پیچھے ہلکی لنگڑاتی چال میں آتی شمع جی کو دیکھ کر تو وہ حیران ہی رہ گئی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ شمع جی کہیں آتی جاتی تھیں۔ اور ان کا موڈ بھی سالوں میں کبھی ایک آدھ بار ہی ٹھیک ملتا تھا مگر اس وقت وہ بھی مسکرا کر اس سے ملیں۔ شاید ایمل کی خوشی میں وہ اتنی زیادہ خوش تھیں۔

''اور بھئی انمول کیسی ہو؟ بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی۔'' انہوں نے دوستانہ سے انداز میں حال احوال پوچھا۔

''اوہ..... ہو سکتا ہے کہ یہ بھی حالات کے ساتھ بدل گئی ہوں۔'' انہیں سرسری سا ہوں، ہاں میں جواب دیتے ہوئے وہ مستقل سوچ گئی۔

''گھر کی تقریب میں تو آئی نہیں آپ.....؟'' اس نے شکوہ کر دیا۔ جس روز ایمل کو انگوٹھی پہنائی گئی تھی اس روز صرف مہر آنٹی اکیلی آئی تھیں۔

''ہاں، تھوڑی طبیعت سیٹ نہیں تھی میری۔'' ہر بار کا دُہرایا گیا ایک ہی جواب تھا ان کے پاس۔

''یہ تو اب بھی نہیں آ رہی تھی بڑی مشکل سے راضی کیا ہے میں نے۔ تمہاری اور ایمل کی ناراضی کی دھمکی دی۔ کل رات ہی ہم یوسف کے ساتھ جا کر یہ نیا سوٹ لے کر آئے ہیں، ایک سوٹ کی رشوت بھی دینی پڑی مجھے اس کو۔ کیسا لگ رہا ہے شمع کا سوٹ؟'' مہر آنٹی نے تفصیلی انداز میں اصل بات بتائی۔ شمع جز بز سی منہ بناتی رہی۔

''اچھا، تو آپ لوگ رات کو شاپنگ کر کے آئے

تھے، میں نے دیکھا تھا اس وقت آپ لوگوں کو۔ ہوں اچھا لگ رہا ہے سوٹ..... کلر کمبی نیشن بہت اچھا ہے۔'' اس نے توصیفی انداز میں سوٹ کو دیکھا۔

''دیکھا اچھا لگ رہا ہے ناں اور یہ شمع کو خواہ مخواہ کچھ پسند ہی نہیں آتا۔ میں بھی اس کی باتوں میں الجھ کر کنفیوز ہو جاتی ہوں۔ پھر یوسف کی پسند سے کلر منتخب کرلیا..... دیکھو کیسا اٹھ رہا ہے شمع کے فیئر کلر پر مرجنڈا کلر۔'' مہر آنٹی نے خوش ہو کر تعریف کی۔

''ممی، آپ بھی ناں.....'' اگلے ہی پل شمع کے چہرے پر ناگوار تاثرات در آئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب موڈ خراب ہو گیا اور جب ان کا مزاج خراب ہوتا تو کوئی دوسرا اسے ٹھیک نہیں کر سکتا تھا۔ شمع ان سب کے درمیان سے نکل کر تیزی سے لنگڑاتی چال سے اندر کی طرف بڑھ گئی مہر آنٹی اس کا موڈ بھانپ کر انہیں آواز دیتی ان کے پیچھے ہی لپکیں۔

''ارے شمع سنو تو.....''

یوسف دو قدم آگے بڑھ کر اس کے نزدیک ہوا۔ اس کی پُرشوق نظروں میں محبت کا سمندر امڈ رہا تھا مگر سمندر کی لہروں میں ہجر کا نوحہ رواں تھا۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو..... تم میری ہو..... صرف میری.....'' اس کی کمبھیر سی سرگوشی انمول کے رگ و جاں میں سرور بن کر دوڑتی چلی گئی۔ گیٹ پر آہٹ ہوئی انمول پلٹ کر اندر چلی گئی۔ اس کے گال تمتما رہے تھے اور ہاتھوں پیروں میں سنسناہٹ سی دوڑ رہی تھی۔ یوسف کی نگاہوں میں جادو تھا..... وہ اس کے سحر میں جکڑی جیسے خود بھی لاچار سی ہو گئی تھی۔

مہر آنٹی، صائمہ آنٹی کے پاس بیٹھی نہ جانے کیا باتیں کر رہی تھیں جبکہ شمع جی ان سب سے ہٹ کر ایک گوشے میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر برہمی اور بے بسی سی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ مہر آنٹی زبردستی انہیں لے کر آئی ہیں ورنہ وہ سدا کی آدم بیزار تھیں۔ اسے ان کے بدلے ہوئے خوشگوار لہجے پر بھی حیرت تھی ورنہ ایک وقت تھا کہ وہ سیدھے منہ اس سے بات نہیں کرتی تھیں اور ایک وقت تھا کہ وہ اس سے کڑوے لہجے میں ہی بات کرتی تھیں اور کڑے تیوروں سے دیکھتی تھیں۔

اس نے ایک گلاس پانی پی کر اپنے بے قابو جذبات کو سنبھالا۔ کچھ دیر اکیلے کمرے میں بیٹھ کر اپنی دھڑکنوں کو قابو کیا، پانچ دس منٹ بعد ہی ایمل اسے ڈھونڈتی ہوئی آ گئی۔

''انمول کہاں ہو.....؟ جنید بھائی آ گئے..... بلا رہے ہیں تمہیں.....'' ایمل نے اس کے کانوں میں صورِ اسرافیل پھونکا۔

وہ زرد سی پڑ گئی۔ چہرے کی لالی یکسر ختم ہو گئی۔ آنکھوں سے پھوٹتی چمک کی جگہ چنگاریاں سی بھر گئیں۔ یہ زبردستی کا بندھن جی کا روگ بن گیا تھا اس کے لیے..... نہ نبھانا آسان اور نہ توڑنا آسان تھا۔

''یہ کیوں آ گیا..... کیا مصیبت ہے اس کو..... کیسے جان چھوٹے گی اس سے۔'' وہ پاؤں پٹختی باہر آ گئی۔

سامنے ہی جنید سراپا انتظار کھڑا تھا۔ آج اس نے سیاہ پینٹ اور میرون لائننگ والی شرٹ پہن رکھی تھی۔

''واؤ..... گڈ کپل..... زبردست میچنگ.....'' کسی مہمان نے دونوں کے کپڑوں کے ایک رنگ کو سراہا۔

اس تعریف پر جنید کے چہرے پر شوخ مسکراہٹ پھیل گئی اور انمول کے سرتاپیر آگ ہی لگ گئی۔

اس نے کچھ جھنجلا کر اور کچھ چڑ کر شانوں پر جھولتے دوپٹے کو ٹھیک کرنا چاہا تو وہ اس کے بندے میں الجھ گیا۔ اس نے بیزاری سے دوپٹا کھینچا تو وہ بندے میں مزید الجھ گیا۔

''ارے..... آرام سے..... آہستہ سے۔'' آن کی آن میں ہی جنید نے آگے بڑھ کر بنا اجازت ہی اس کے بندے میں پھنسا دوپٹا سہولت سے نکال دیا۔

وہ اس کے اس قدر قریب کھڑا تھا کہ اس کے ملبوس سے اٹھتی خوشبو اس پر گراں گزرنے لگی۔ اس کی انگلیوں کا لمس اسے اپنی گردن پر سرسراتے کیڑے کی طرح برا لگا۔

''اُف..... میں خود نکال لیتی.....'' اس نے جھٹکے

سے دوپٹا پیچھے کر کے ناگواری سے کہا۔

''کیوں نکال لیتیں..... خدا نے مجھے موقع دیا تو میں کیوں ناشکری کرتا۔'' جنید کے کھلے، کھلے چہرے پر مسکراہٹ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اور انمول اس کی نظروں کی تپش سے جھلستی، سٹپٹاتی تیزی سے وہاں سے پلٹی۔ وہ اس سے جتنا بچ رہی تھی وہ اتنا ہی زیادہ فری ہو رہا تھا۔

''اس قصے کو جلدی سے ختم کروں تو جان چھوٹے میری.....'' اس نے اسی وقت دل میں تہیہ کیا۔

اس کے بعد اس کا موڈ اتنا خراب ہوا کہ وہ ایمل کے منگیتر فیصل سے بھی ہنسی مذاق نہ کر سکی..... اس کا دل جیسے پوری دنیا سے بیزار ہو گیا تھا۔ اور یہ بیزاری اس کے چہرے کی اسکرین پر صاف نظر آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے، تمہیں کیا ہوا؟ شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' جب تیسری چوتھی بار کسی نے اس سے یہ دریافت کیا تو وہ کوفت سے سب کی نظروں سے بچ کر اس بھرے حصے سے نکل کر نسبتاً کھلے حصے میں چلی آئی۔ یہ گھر کا اندرونی حصہ تھا۔ سب لوگ لاؤنج کی طرف تھے۔ اسے بہت پسینے آ رہے تھے اور خواہ مخواہ کا رونا بھی آ رہا تھا۔ نین کٹوروں میں اب تاب نہیں رہی تھی چھلکے پڑ رہے تھے۔

''اونہہ..... عجیب مصیبت ہے، انسان اپنی مرضی کی زندگی بھی نہیں جی سکتا۔'' اس نے دکھ سے سوچا۔

دکھ کی انتہاؤں پر کچھ باغی آنسو بالآخر حدوں کو توڑ کر نکل ہی آئے۔ اس نے واش بیسن پر لگے آئینے میں خود کو دیکھا پلکیں جھپک، جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کی اور پوروں سے آنکھوں کے کناروں پر ٹھہرے آنسو صاف کرنے لگی..... وہ نہیں چاہتی تھی کہ سب کے سامنے اس کے دکھ کا اشتہار بنے۔

''ہے..... کیا ہوا انمول..... یہاں کیوں آ گئیں؟'' جنید نہ جانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا جو پیچھے ہی چلا آیا۔

وہ اس کی اچانک اور غیر متوقع آمد پر بری طرح ڈر گئی۔

''اُف.....!'' اس نے کڑے انداز میں اسے دیکھا۔

''جان کو ہتھیلی ہو گیا یہ تو.....'' اس نے دل میں سوچا۔

''کچھ نہیں اندر گرمی بہت تھی ناں..... اس لیے تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے یہاں آ گئی تھی..... تم کیوں آ گئے یہاں؟'' وہ جبراً خود پر قابو پا کے نرمی سے بولی۔

''تمہاری ہر تکلیف دل پر محسوس ہوتی ہے..... مجھے لگا تم پریشان ہو؟ ارے کیا تم رو رہی تھیں؟'' سادگی سے دل کی بات کہتے، کہتے اس کی نظر پلکوں پر ٹھہرے ایک موتی پر پڑ گئی۔

''نن..... نہیں تو..... کیوں روؤں گی میں بھلا..... شاید مسکارا زیادہ لگ گیا اور کوئی ذرہ آنکھ میں چلا گیا اس سے آنکھ میں جلن ہو رہی تھی۔ اُف اندر جاؤ تم۔''

اسے جلدی، جلدی وضاحت دے کر اس نے پھر دوبارہ اسے جانے کو کہا۔ مگر اگلے ہی پل آگے بڑھ کر اس نے اس کی دونوں کلائیاں تھام لیں۔ انمول اس غیر متوقع حرکت پر گنگ رہ گئی۔

''سچ بتاؤ..... کیا ہوا؟'' اس نے بڑے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ جز بز سی کلائی چھڑانے کی کشمکش کرنے لگی۔

''چھوڑو بھی، کوئی دیکھ لے گا تو..... کچھ نہیں ہوا مجھے.....'' اب تو اسے زور کا رونا آنے لگا تھا اور چہرے پر پہلے سے بھی زیادہ بیزاری اور کوفت پھیل گئی۔

''تو دیکھ لے..... اپنی چیز ہے میری آخر.....'' وہ شرارت سے بولا۔

''ارے..... وہ کڑے نہیں پہنے جو میں دے کر گیا تھا۔'' اس کی کلائی میں موجود دوسری چوڑیوں کے سیٹ کو دیکھ کر اس نے استفسار کیا۔ اسے مکمل اطمینان تھا اور کوئی جلدی بھی نہیں تھی جبکہ انمول چاہتی تھی کہ گھڑی کی چوتھائی میں وہ وہاں سے چلا جائے۔

''میری مرضی نہیں پہنے.....'' وہ کچھ غصے سے بولی۔

''اب اپنی مرضی کو لپیٹ کر رکھ دو..... میری پسند اور میری مرضی ہو گی اب۔'' اس نے جتایا۔

اس کے ہاتھوں میں تھمی کلائیوں میں اس کی

گرم ہتھیلی کے لمس سے سب طرف کرنٹ سا دوڑ رہا تھا۔ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ اسی وقت فیصل کی دو شرارتی کزنز کسی کام سے ادھر آئیں اور دونوں کو یوں دیکھ کر شرارت سے کھنکھارتی، ہنستی دوسری طرف چلی گئیں۔

"یہاں تو فلم چل رہی ہے۔" دونوں کا تبصرہ اسے کھولا گیا۔

اور وہ جو اتنی دیر سے اس سے کلائی چھڑا نہیں پا رہی تھی ایک جھٹکے سے ہاتھ پیچھے کھینچ کر کلائی چھڑا لی اور اس زور آزمائی میں کئی چوڑیاں ٹوٹ کر زمین پر بکھر گئیں۔

"ارے..... دیکھو کہیں ہاتھ میں تو کانچ نہیں لگا؟" جنید بہت گھبرا کر پھر اس کی طرف بڑھا۔

مگر اس بار اس نے اس سے تشریف لے جانے کو کہنے کے بجائے خود ہی وہاں سے جانے میں عافیت سمجھی۔ غصے اور کوفت کے ساتھ اسے توہین کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

"اُف، نہ جانے کیا سمجھ رہی ہوں گی وہ دونوں لڑکیاں کہ میں اس کی محبت میں مر رہی ہوں..... اور پتا نہیں کیا رومانس چل رہا ہے۔" اس کا چہرہ کچھ جلال سے اور کچھ جنید کی اس جرأت پر سرخ ہو رہا تھا۔ کان گرم ہو کر دھواں دینے لگے اور سانس کتنی ہی دیر تک قابو میں نہ آئی۔

"اُف..... یہ تو کمبل ہی ہو گیا..... اب کیا کروں میں..... کیا کروں....." غصے اور بے بسی سے اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

وہ بہت برا دن گزرا تھا بلکہ برے دن تو اس کے جب ہی شروع ہو گئے تھے جب جنید کو اس کی زندگی میں شامل کیا گیا تھا۔ وہ سر پٹختی رہ گئی اور جنید کا نام اس کے نام کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور اس کی دھڑکنوں میں دھڑکتا یوسف اس کے بہت قریب ہو کر بھی اس سے بہت دور کر دیا گیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی یوسف اور اس کے درمیان

ساتھ سفر کرتا محبت کا ان دیکھا جذبہ دونوں کے درمیان پنپتا رہا۔ جس روز سے یوسف نے اس سے قول و قرار کیا تھا اس کے بعد سے تو زندگی کی جون ہی پلٹ گئی۔ ساری دنیا پُرکشش اور خوب صورت لگنے لگی تھی۔ وہ اپنے ہر کام اور مشورے میں یوسف پر انحصار کرنے لگی تھی اور یوسف بھی تو اس کی ایک پکار پر لبیک کہتا ہوا آ جاتا تھا چاہے کتابیں منگوانی ہوں، نوٹس بنانے ہوں، کیلی کے گھر جانا ہو یا گھر کا سودا منگوانا ہو، یوسف ہمیشہ حاضر ہوتا، شمع لاکھ منہ بناتیں، غصہ دکھائیں، کڑے تیوروں سے گھورتیں مگر یوسف انہیں بھی خاطر میں نہ لاتا۔ حتیٰ کہ انمول کے ساتھ بھی شمع کا رویہ بہت تلخ ہو جاتا تھا مگر انمول، یوسف کی محبت کی سرمستی میں ڈوبی تھی وہ کبھی شمع جی کے لہجے یا طنز کا برا نہیں مانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بیچاری ڈپریشن اور احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ اپنی معذوری کے سبب ان کا مزاج تلخ ہو گیا ہے اسی لیے وہ ہر وقت یوسف پر آرڈر چلاتی رہتی تھیں۔

یوسف ان کے ہر حکم کا پابند تھا ان کا ہر کام یوسف ہی کرتا تھا مگر وہ چاہتی تھیں کہ یوسف ہر معاملے میں ان کی مرضی پر چلے۔ ان کی مرضی سے سوئے جاگے، کھائے پیے، آئے جائے یا دوستیاں بنائے اور جب یوسف اپنی مرضی کرتا تو ان کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ جاتا۔ وہ اسے برا بھلا کہتیں، چیختیں چیختیں، ناراض ہو جاتیں اور ماموں حامد سے شکایت لگا کر اسے مزید ڈانٹ پڑواتیں۔ تب اسے یوسف پر رحم آتا۔ اور دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہو جاتی اس ہمدردی میں وہ یوسف کا زیادہ خیال کرتی تھی جو کچھ بھی خاص پکتا اس میں یوسف کا حصہ ضرور ہوتا اور یوسف اس سے بڑھ کر اس کا خیال رکھنے لگا۔ ہوتے، ہوتے یہ اپنائیت، ہمدردی اور انسیت پیار میں بدل گئی کچھ اس طرح کہ دونوں پور، پور اس میں ڈوب گئے۔

(باقی آئندہ)

معافی

ناہید فاطمہ حسنین

''مجھ سے کہاں غلطی سرزد ہوئی۔ میری تربیت میں کب کمی آئی؟'' وہ بیڈ کراؤن سے ٹکی خود سے مخاطب تھیں۔ آج وہ بے حد دلگیر تھیں۔

''آج کل کی اولاد ہے ہی بے راہ رو، خودسر، بدتمیز، ضدی.....''

''ضدی.....؟''

''ضدی'' کی تکرار ان کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگی۔ ضدی پر آکر تو وہ خود ہی اٹک گئی تھیں۔

''ضدی.....'' تو وہ اپنے خاندان میں مشہور تھیں۔ اکثر اماں ان کی ضد سے عاجز ہو کر کہتیں۔

''میری ساس اللہ بخشے کہتی تھیں اس کا نام بدل دے، نادیہ نام میں ''نا'' آتا ہے اسی لیے یہ اتنی ضدی، خودسر اور ہر بات میں ''نہ۔نہ'' کرنے والی ہے مگر میں نے ان کی ایک نہ سنی..... آج بھگت تو رہی ہوں۔''

اماں کے جملے ان کے کان کے پردوں میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ آنکھ سے ایک آنسو ان کے ہاتھ کی پشت پر آ گرا۔

وہ اکلوتی لڑکی تھیں..... شادی کے چار سال بعد ہوئیں تو اماں، بابا کچھ زیادہ ہی نخرے اٹھانے لگے۔ ہر بات منہ سے نکلتے ہی پوری کر دی جاتی۔ جب ضدیں، فرمائشیں بڑھ کر خودسری تک جا پہنچیں تو اماں گھبرا گئیں، سختی برتنے لگیں۔ ان کی سختی سے وہ اور ضدی ہو گئیں۔ ابا ہمیشہ ان کی ضد پوری کر دیتے۔ جس پر دادی اور اماں دونوں ابا سے خوب لڑا کرتیں۔ مگر ابا کو پروا کب تھی..... ان کے بعد دو جڑواں بھائی بھی ہوئے مگر ان کا مقام ایک انچ پھر بھی نیچے نہ آیا۔

رنگت سانولی پائی تھی مگر نین نقش قیامت کے پائے تھے اس پر دراز قامت اور لمبے گھنے سیاہ بال ان خوبیوں نے انہیں ایسا کر دیا تھا کہ نظر ان پر اٹھے تو پلٹنا بھول جاتی تھی۔

ایک روز ابا دفتری کام سے کراچی گئے، وہ کسی بات پر اماں سے روٹھ گئیں اور کھانا کھانے سے صاف انکار کر دیا۔ پہلے تو اماں اور دادی منا، منا کر تھک گئیں پھر غصے میں اماں نے نہ صرف برا بھلا کہا بلکہ پیٹھ پر دو دھموکڑے بھی جڑ دیے۔

"دو میری طرف سے بھی لگا دے۔" پان میں کتھا چونا لگاتی دادی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پھر کیا تھا..... بڑے سے صحن میں پڑی کھری چارپائی پر دھڑام سے گر کر منہ لپیٹ لیا۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد دادی نے چیخ، چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

"ارے ویسے ہی رنگت کم ہے۔ دھوپ میں پڑے، پڑے جل کر کوئلہ ہو جائے گی اسے اٹھاؤ..... اندر لاؤ....."

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

چار گھنٹے ہو گئے دھوپ دیواروں پر آخری پہرہ دے رہی تھی مگر ان کی ضد کے آگے سب ہیچ تھا۔ انہوں نے پوری دھوپ خود پر گزاری مگر ضد نہ چھوڑی۔

اب تو دادی اور اماں دونوں انہیں منا، منا کر تھک گئیں مگر وہ ایسی شدت پسند و ضدی کہ آنکھیں ہی نہ کھولیں۔

"اٹھ جا میری نادیہ..... دیکھ ضد چھوڑ دے، صبح سے کچھ نہیں کھایا تھوڑا سا کھا لے....." دادی چمکارنے لگیں مگر انہوں نے گویا آنکھوں اور لبوں پر ایلی لگا لی تھی۔

"حسن آرا میں تمہیں بچپن میں کہتی تھی اس کا نام بدل دو..... ہر بات میں زندگی بھر "نہ..... نہ"..... کرے گی۔ اب بھگتو....." تھک ہار کر دادی اندر چلی گئیں۔

رات گئے ابا آئے تو انہوں نے انہیں منایا ساتھ ہی کراچی کی سوغات دی تب وہ اندر آئیں۔

دونوں بھائیوں پر ایسا رعب کہ ایک چنگھاڑ پر وہ سہم جاتے خود پڑھاتی تھیں اور بھائی مارے خوف کے بہترین زرلٹ دیتے۔

جب دونوں اماں کو تنگ کرتے تو وہ الٹا انہیں آوازیں دے کر دونوں بھائیوں کی شکایت لگاتیں۔

"نادیہ، ذرا دیکھنا راشد، شاہد کو....." اور دونوں ایسے فرار ہوتے کہ جیسے کچھ کیا ہی نہ ہو۔

☆☆☆

جوان ہوئیں تو ایسا رنگ و روپ نکالا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ ان کی رنگت سانولی ہے۔

دادی کے بھائی کا پوتا کراچی سے سامان دادی کے لیے لایا۔ انہیں دیکھا تو خود تو پلٹ گیا دل انہی کے گھر چھوڑ آیا۔ پی آئی اے میں پائلٹ تھا، کراچی جاتے ہی رشتہ بھیج دیا۔

یہاں کس کو انکار ہو سکتا تھا؟ لمبا اونچے قد کا براؤن مونچھوں کے نیچے چمکتے سفید موتی جیسے دانت، مدھم لہجے میں بولتا ہوا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ پھر نوکری بھی بہترین..... ان کی نادیہ ساری دنیا گھوم لے گی۔

"نادیہ سے اس کی رائے لے لو....." ابا نے مشورہ تو اماں کو دیا تھا۔ تڑخ دادی اٹھیں۔

"کس بات کا مشورہ؟ سلطان حسن یہ سب تمہارا پیدا کیا بگاڑ ہے۔"

"اس میں بگاڑ کیا۔ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔"

''چپ..... اگر ہر مطلب کی جگہ پر اسلام کو لائے تو.....'' دادی بھنا گئیں۔

''میرا خیال ہے.....'' اماں ساس اور شوہر کی گفتگو خاموشی سے سن رہی تھیں درمیان میں بول اٹھیں۔ ''سلطان ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر ہماری ناک کٹا دے۔''

''پھر ٹھیک ہے، سن لو..... خبردار جو تم نے پوچھا ہو..... سلطان میاں ہی اس نہ کرنے والی سے پوچھیں۔''

☆☆☆

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، ابا بھیگی بلی بنے دادی کے سامنے تھے۔

''اس نے کہا ہے کہ وہ ایک بار قاسم رضا سے خود مل کر فیصلہ کرے گی۔''

''ایں.....؟'' دادی کو کانوں سنی پر یقین نہ آیا۔

''پگلا گئی ہے؟ دماغ تو نہیں چل گیا اس کا.....'' اماں نے ناک بھوں سکیڑیں۔

''اس میں ایسا کچھ حرج بھی نہیں.....'' ابا دھیمے ہی تھے۔

''اس بگاڑ کے تم ہی ذمے دار ہو۔'' اماں اور دادی بہ یک وقت بول اٹھیں۔

''سراسر بے حیائی۔'' دادی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''شہزادی کا پیغام قاسم رضا تک کون پہنچائے گا؟'' اماں نے سر پکڑ لیا۔

''میں بات کرلوں گا، تم جی ہلکان مت کرو.....''

☆☆☆

''ایک میری شرط ہے اور ایک میری عرض ہے۔'' وہ ان کے روبرو بہت پُراعتماد تھیں۔

''دلچسپ.....'' وہ ہولے سے ہنسے۔ ''چلیں پہلے شرط بتا دیں۔''

''میرا نام نادیہ سلطان حسن ہے۔''

''جانتا ہوں۔''

''یہ اسی طرح رہے گا، میں اسے نہیں بدلوں گی۔''

''پھر بھی نہیں..... یہ ممکن نہیں کہ میں اپنی زندگی سے اپنے باپ کا نام نکال دوں.....'' چند ثانیے وہ سوچتے رہے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ اب عرض کیا کرتی ہے؟''

''عرض یہ کرنی ہے کہ مجھ سے شادی کے فیصلے پر نظرثانی کر لیجیے۔''

''ہیں.....؟'' وہ چونک کر ہنس دیے۔

''جی.....''

''کیوں؟''

''کیونکہ میں بہت بری ہوں، بہت، بہت ضدی۔ ضد میری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ ضد میری فطرت میں شامل ہے اور فطرت نہیں بدلتی۔ میں جس بات میں نہ کردوں ہاں نہیں کرتی۔''

وہ بہت دلچسپی سے مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے اور وہ پورے کے پورے وجود سے ان کے دل میں سمائی جا رہی تھیں۔

''دادی اور اماں کا خیال ہے کہ میری جہاں بھی شادی ہوگی سسرال میں کسی سے نہیں بنے گی۔'' اب کے اس نے صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مارا۔

''یہ ان کا خیال ہے آپ فکرمند نہ ہوں.....'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بس یا اور کچھ.....؟'' قاسم نے اشارے سے پوچھا تو وہ ان کی ہتھیلی پر پھیلی لکیروں کے جال میں الجھ گئیں۔ انہیں لگا وہ پوری کی پوری قاسم کے سحر میں گرفتار ہو چکی ہیں۔

☆☆☆

رخصت ہو کر وہ کراچی آ گئیں۔ قاسم نے جتنے اچھے ہونے کا احساس دلایا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ اچھے ثابت ہوئے۔ شادی کے سال بعد سسر کا انتقال ہو گیا۔ ان کے سسر بہت اللہ والے تھے، وہ بھی ان سے بہت محبت رکھتی تھیں۔ البتہ اس گھر میں ان کے ستارے ان کی ساس سے کبھی نہ ملے۔ سوان سے نوک

ساس ہمیشہ قاسم سے بیٹھ کران کی عیب جوئیاں کرتی رہتیں۔قاسم سر جھکائے سنتے رہتے، کمرے میں آنے سے قبل اپنے کان صاف کر لیتے۔

''اماں سے کہیں کچھ مزدور لگالیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' قاسم نے سوالیہ نظروں سے انہیں تکا۔

''تھک جاتی ہوں گی ناں میری برائیاں کرتے، کرتے۔'' بات سمجھ کر انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا جواب کچھ نہ دیتے۔ وہ ماں کے بھی انتہائی فرمانبردار تھے اور بیوی تو تھیں ہی من چاہی۔

وہ چونکہ اپنے گھر میں سب سے بڑی تھیں، رعب رکھنا ان کی عادت تھی اور یہی عادت ان کے ساتھ لگی چلی آئی تھی۔ یہاں ساس کا رتبہ ان سے بڑا تھا، وہ ان کے رعب میں کیوں آتیں۔ وہ خود ایک دبنگ عورت تھیں۔ اِدھر نادیہ کی ان سے بننے یا نبھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا دونوں میں سرد جنگ چھڑی رہتی۔

جب زویا ہونے والی تھی تب ان کی ساس جان بوجھ کر اپنی بہن کے گھر اسلام آباد چلی گئیں۔ اس بات نے نادیہ کے دل میں گرہ ڈال دی پھر ساری زندگی نادیہ کا ان سے دل صاف نہ ہوسکا۔

بڑھتی عمر نے ایک ٹھہراؤ تو ضرور پیدا کر دیا تھا مگر وہ اپنی ضد اپنی نہ سے دستبردار ہونے کو قطعی تیار نہیں تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی ساس کی سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔

☆☆☆

قاسم نے اول دن سے جو اُن سے پیار کیا تو آخر تک نبھایا۔ ان کی چاہت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ انہیں بیڈ ٹی کی لت بھی قاسم ہی نے لگائی تھی سو وہ آنکھیں بند میں کھولتیں قاسم بیڈ پر ہی ٹی پہلے پیش کر دیتے۔ انہوں نے بھی قاسم کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ان کی ہر بات بے چون وچرا... مانتیں مگر جہاں ان کی سوچ کی سوئی اٹک جاتی تو قاسم کے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوتیں۔

یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی ایک مثال تھی کہ انہوں نے کبھی نادیہ کو کسی بات میں نہ تو طعنہ دیا نہ الزام لگایا۔ اور نہ ہی اپنی مردانہ حیثیت استعمال کرتے ہوئے کبھی کوئی بات منوائی۔ بہت سمجھانے کے بعد بھی اگر وہ کوئی بات نہ مانتیں تو قاسم خود ہی سپر ڈال دیتے۔ ایسے میں نادیہ دل ہی دل میں شرمندہ تو ہوتیں۔ اور اپنی فطرت سے مجبور عادتِ بد کے سبب خود کو تنہائی میں کچوکے بھی لگاتیں، ملامت بھی کرتیں۔

☆☆☆

زویا انتہائی کمزور پیدا ہوئی تھی۔ انہوں نے دن رات ایک کر دیے۔ آہستہ، آہستہ زویا نہ صرف جان پکڑتی گئی بلکہ گول مٹول صحت مند نظر آنے لگی۔ زویا میں گویا قاسم اور ان کی جان اٹکی رہتی۔ جوں، جوں زویا بڑی ہوئی وہ ایک سخت گیر ماں کا روپ دھارتی چلی گئیں۔ انہیں ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا کہ تاریخ خود کو دُہرا نہ لے۔ ماں کی سخت طبیعت کے باعث زویا باپ کے قریب ہوتی چلی گئی۔

''اتنی سختی نہ برتا کرو نادیہ..... زویا ابھی بہت چھوٹی ہے۔'' قاسم اکثر انہیں سمجھاتے۔

''نہیں قاسم..... آپ نہیں سمجھیں گے..... میرے والدین بھی میری ہر جا اور بے جا بات مانتے تھے اور میں بگڑتی چلی گئی۔ میں نہیں چاہتی زویا وہی کچھ کرے جو میں کر چکی.....'' ان کے لہجے میں شکست کی ہلکی سی رمق موجود تو تھی مگر چند ثانیے بعد وہ بھاپ بن کر اڑ جاتی۔

☆☆☆

ایک روز قاسم فلائٹ لے کر آئے تو ایسا سوئے کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکے۔ نادیہ کی تو زندگی اجڑ گئی۔ وہ قاسم کے بغیر نامکمل بلکہ کچھ بھی نہیں تھیں..... ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ نہ انہیں کپڑے بدلنے کا ہوش رہا، نہ کھانے پینے کا۔

کبھی، کبھی قاسم کو یاد کر کے ہذیانی انداز میں چیخ، چیخ کر ان کا گلا رندھ جاتا۔ کبھی، کبھی ان کی آواز بالکل بند ہو جاتی اور اکثر روتے، روتے پیچھے کی طرف دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو جاتیں۔

زویا جس طرح ان کی دلجوئی کر سکتی تھی کر رہی تھی۔

مگر کب تک......؟اس کا بھی تو باپ گیا تھا۔ صدمے سے وہ بھی نڈھال تھی مگر نادیہ کو لگتا ان کا تو سبھی کچھ چلا گیا۔

☆☆☆

قاسم کو مرے ڈیڑھ سال ہونے کو آیا تھا۔ مگر نادیہ کو سکون مل کے نہیں دے رہا تھا۔ وہ قاسم کی تصویر ہاتھ میں لے کر گھنٹوں روتی رہتیں۔ اتنا کہ نڈھال ہو کر بے ہوش ہو جاتیں۔ اب سب کچھ زویا کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی studies بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ وہ کئی بار بہت سختی سے ان سے بات کر چکی تھی اور دوسری طرف وہ اسے پاگلوں کی طرح تکے چلی جاتیں۔

گھر میں ملازم اسی طرح موجود تھے، کھانا ہمیشہ نادیہ بناتیں، کام والی سبزی کاٹتی، روٹی پکاتی اور دوسری کام والی صفائی ستھرائی اور اوپر کے دوسرے کام کرتی۔ دونوں رات کو کھانا لے کر چلی جاتیں۔ یہ قاسم کی زندگی سے معمول رہا۔ انہوں نے ملازم کو رہائش دینا کبھی پسند نہیں کیا۔ بس ایک چوکیدار تھا جو بیک وقت ڈرائیوری بھی کرتا تھا مگر گھر میں وہ بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اب حال یہ تھا کہ نادیہ سے سالن بنتا ہی نہیں تھا۔ کام والی کو سالن بنانا آتا نہ تھا۔ سو زویا نیٹ سے ریسیپی نکال، نکال کر کھانے بناتی مگر اس کے ہاتھ میں ذائقہ نہیں تھا۔

اب زویا بہت الجھنے لگی تھی۔ ادھر نادیہ پوری، پوری رات جاگتیں، کبھی ہذیانی انداز میں چیختیں پھر... رونے لگ جاتیں۔ صبح سات آٹھ بجے تھک ہار کر خواب آور دوا لیتیں تب کہیں جا کر دوپہر تک سوتی رہتیں۔ زویا نے بہت چاہا کہ وہ رات میں نیند کی گولی لے کر جلد سو جائیں تو صبح جلد اٹھ جائیں گی۔ مگر نادیہ کسی کی سنتی کب تھیں؟

”آپ کو میرا بالکل کوئی ہوش نہیں...... آپ مرے ہوئے پاپا کو تو روتی رہتی ہیں مگر بیٹی کو زندہ درگور کیا ہوا ہے، آپ کو اپنا ہوش نہیں تو میرا تو خیال کریں۔“ زویا نے جس درشتی سے یہ سب کہا وہ نادیہ

غزل

دل یہ چاہے کہ ہر اک خار گلستاں کرلیں
اپنا ہر لمحہ احساس فروزاں کرلیں
جُوں حنا گل کی طرح رنگ بکھیرے جائے
اپنے ہاتھوں پہ وہی رنگ نمایاں کرلیں
کچھ محبت کی صدا دل کے قریں آنے لگی ہے
آؤ ہم بھی تو سنیں دل کو غزل خواں کرلیں
گل کو ہیں زخم بہت خاک چمن ہے ہر سو
کیا یہ ممکن ہے کہ ہر کوچہ پُر افشاں کرلیں
کوئی تو زخم بھرے کوئی تو احساس کرے
راہ اب ایسی چلیں درد کا درماں کرلیں
ایسی دلداری تو ہو کہ فضا مہک اٹھے
شادمانی کی فضا بہرِ گلستاں کرلیں
ہاتھ میں ہاتھ رہے درد کا احساس رہے
آؤ سب مل کے یہی وقت مہرباں کرلیں

کلام: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

آنکھوں سے اسے دیکھے چلی گئیں۔

”ممی میں زندہ ہوں، مری نہیں...... زندہ وجود کھانا مانگتا ہے، کام والی اچھا کھانا نہیں بنا سکتی۔ ڈیڑھ سال سے اس کا پکایا زہر مار کر رہی ہوں یا باہر سے منگواتی ہوں...... اگر آپ تین وقت کا کھانا صرف ایک وقت کھاتی ہیں تو میں کیا کروں......؟ آپ کی طرح میری بھوک نہیں مری۔ مجھے کھانا چاہیے اور زندگی بھی...... یہ...... یہ دیکھیں۔“ اس نے آستین اونچی کر کے کلائی سے اوپر اپنا ہاتھ دکھایا جو بری طرح جلا ہوا تھا۔

وہ بری طرح اچھلی۔ جیسے ڈیڑھ سال کی بے خبر نیند سے جھٹکے سے اٹھ بیٹھی ہوں۔

”یہ یہ کیسے؟ یہ کیا ہوا؟“

”ہاتھ جلا ہے...... ہاتھ...... کھانا پکانا کب سکھایا تھا مجھے...... پکاتے ہوئے سارا سالن گر گیا کھانا جلس

گئی۔" وہ رونے لگی۔

نادیہ ہونٹ کترتی رہ گئیں۔

"اب..... اب سے تم کو شکایت نہیں ہوگی۔" اٹھنا چاہا تو لڑکھڑا کر بیڈ پر ڈھے گئیں۔ کچھ دیر قبل ہی خواب آور دوائیں کھائی تھیں جو اب اثر دکھا رہی تھیں۔ وہ پیچھے کو لڑھک گئیں اور زویا پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

اب اتنا ہو گیا تھا کہ وہ کھانا پکاتیں، گھر کو دیکھتیں مگر کبھی جو بھولے سے قاسم کا ذکر نکل آتا اُن کی حالت غیر ہو جاتی۔

در: ب وہ دھیرے، دھیرے اپنی دنیا سے نکل کر گھر کی دنیا میں لوٹیں تو محسوس ہوا زویا کی موجودگی کے باوجود وہ اکیلی اور تنہا ہیں۔

زویا تھی اور اس کا موبائل..... یا پھر زویا کا فرینڈ سرکل..... وہ اپنی کسی نہ کسی گیدرنگ میں مصروف..... انہیں اگر اس سے کوئی ضروری بات بھی کرنی ہوتی تو گھنٹوں اس کے متوجہ ہونے کا انتظار کرنا پڑتا اگر پھر بھی بات کرنا چاہتیں تو وہ ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیتی۔

"mummy wait" اور ویٹ کرتے، کرتے وہ بات ہی بھول جاتیں۔

کبھی، کبھی اس پر بہت غصہ کرتیں، موبائل، نیٹ اور سوشل میڈیا کو برا بھلا کہتیں تو وہ جھنجلا جاتی۔

"ممی پلیز..... یہ سارے کوسنے طعنے روم سے باہر جا کر دیں۔ میں گروپ میں وائس نوٹ بھیج رہی ہوں۔ آپ کی ساری آوازیں چلی جائیں گی کتنا میرا مذاق بنے گا..... پلیز....."

وہ منہ تکتی رہ جاتیں۔ یہ جو سب وہ سن رہی تھیں ان کی ہرگز سرشت میں شامل نہ تھا۔

"یہ سب کیا ہوتا جا رہا ہے؟ شاید انہیں واپس آتے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے....." وہ پھٹی آنکھوں سے سوچتیں۔

☆☆☆

اب وہ پہلے کی طرح زویا سے زبان چلانے لگی تھیں۔ مگر کوئی فائدہ.....؟ وہ الٹا ترکی بہ ترکی حساب برابر کر دیتی۔ وہ اس سے بات کرنا چھوڑ دیتیں۔ اور چند دن بعد زویا معافی مانگ کر انہیں منا لیتی اور وہ من جاتیں۔ پھر یہ روٹھنے منانے کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

ان کی اکثر ناراضی یہی ہوتی کہ زویا انہیں ٹائم نہیں دے رہی۔ وہ لمحہ بھر کو بھی موبائل خود سے جدا نہیں کرتی تھی۔ صبح جاگتی تو آنکھ کھولنے سے قبل ہی موبائل منہ کے آگے کر لیتی۔ یونیورسٹی جاتے، جاتے اور واپس آ کر رات گئے تک وہ ہوتی اور موبائل..... اکثر وہ بہت دکھی ہو جاتیں۔

"بیٹا کچھ ٹائم ہمیں بھی دے دو....." وہ روہانسی ہو جاتیں۔

"کیا ہے ممی....." زویا تنک کر کہتی۔

"صبر تو کریں..... صبر تو آپ میں ہے نہیں....." زویا کے جملے ان کے دل کے پرخچے اڑانے کو بہت کافی ہوتے۔

☆☆☆

وہ کھانے پر اس کا انتظار کرتے، کرتے غصے میں اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ "کب سے تم کو بلا رہی ہوں، ہم دو ہی تو ہیں کم از کم کھانا ہی ساتھ کھا لو....."

"بس آئی..... آپ کھانا شروع کریں۔"

"نہیں....." وہ اونچی آواز میں بولیں۔

"چوبیس گھنٹوں میں بس یہی ایک وقت ہوتا ہے جو میں تم سے بات کر لیتی ہوں..... ورنہ تو ہر وقت تم ہو اور یہ موبائل....." دوسری طرف وہی لاتعلقی کا سناٹا۔

"دل نہیں بھرتا موبائل سے تمہارا....." وہ پوری قوت سے چیخیں۔

"ہو کیا جاتا ہے آپ کو؟" غصے سے موبائل بیڈ پر پٹخ کر وہ ٹیبل تک آئی۔ جلدی، جلدی کھانا زہر مار کیا اور واپس کمرے میں..... وہ منہ دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

ان کا سارا غصہ سارا طنطنہ نہ جانے کہاں جا سویا تھا۔ اسے کچھ کہنا بیکار تھا وہ آگے سے دس باتیں سنا دیتی۔ ان کا دل اپنی ہی بیٹی سے کھٹا ہو چکا تھا۔ انہوں نے ادھر اُدھر بھاگ دوڑ کر کے اس کا رشتہ طے کر دیا۔

زویا ماں جیسے نین نقش اور باپ جیسی دھلی ہوئی جلی رنگت والی حسین لڑکی تھی۔ دیکھتے ہی پسند کرلی گئی۔

انہوں نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کا عندیہ دے دیا۔ زویا نے بہت سر پٹخا کہ اس کی تعلیم تو مکمل ہوجانے دیں۔ مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ جلد از جلد یہ بوجھ سر سے اتارنا چاہتی تھیں۔

کچھ شاپنگ باقی تھی۔ وہ صبح سے اس سے کہے جارہی تھیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہورہی تھی۔ موبائل سے فراغت پائی تو سونے لیٹ گئی تو عصر کو جاگی اور جانے سے صاف انکار کرکے موبائل میں لگ گئی۔

نادیہ سر پیٹ کر رہ گئیں۔

''ایسا منہ چھپاؤں گی تمہیں ڈھونڈے نہ ملوں گی۔'' انہوں نے دانت کچکچا کر دھمکی دی اور نیٹ ہی آف کردیا۔ ''سارے فساد کی جڑ یہی بلا ہے۔''

''نہیں جانا مجھے..... جو دل چاہے کرلیں۔''

زویا پیر پٹختی آئی اور نیٹ آن کرگئی۔

''میں بھی نیٹ نہیں کھولوں گی.....'' وہ بھی زویا کی سطح پر اتر کر اس کے مقابل آ کھڑی ہوئیں۔

یوں بار، بار ان کے نیٹ آف کرنے اور زویا کے آن کرنے میں زویا کا کافی نقصان ہورہا تھا۔ وہ تپ گئی ماں کو نیٹ بند کرتا دیکھ کر پیر پٹختی آئی اور ان کا ہاتھ زور سے جھٹک کر نیٹ آن کردیا۔

''اب بند نہ ہو.....'' اس نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی۔

وہ آنکھیں پھاڑے اسے تکتی رہ گئیں۔

بہت دیر بعد جب وہ اس ٹرانس سے نکلیں تو جی چاہا خودکشی کرلیں۔

☆☆☆

اور اب وہ نڈھال بیڈ کراؤن سے ٹکی یہی سوچ رہی تھیں۔ ان سے زویا کی تربیت میں کہاں کوتاہی ہوئی مگر انہیں جلد ہی اس بات کا جواب سمجھ میں آگیا۔ ''ضد'' اور ''خودسری'' کے جراثیم زویا کو انہی سے منتقل ہوئے تھے۔

یوں بیٹھے، بیٹھے رات کا جانے کون سا پہر آگیا۔ وہ بھوکی، پیاسی ایک فیصلہ کرکے بستر پر لیٹ گئیں تکیہ بھیگتا رہا انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ سونے کی پوری کوشش کے باوجود وہ پوری رات سو نہ سکیں۔

☆☆☆

اگلے روز دونوں میں سرد جنگ کا آغاز ہوچکا تھا۔ نہ اس نے ان سے معافی مانگی نہ انہوں نے اسے معاف کیا۔

بالآخر بظاہر انہوں نے سپر ڈال کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

شادی میں مہینہ بھر رہ گیا تھا..... پندرہ بیس دن بعد باقی رسمیں شروع ہونا تھیں۔ زویا نے ان سے معافی مانگی۔ انہوں نے اسے بہت ہی بری طرح دھتکار دیا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ کوئی بات نہیں کی۔

وہ بھی پیر پٹختی چلی گئی۔

رخصتی کا لمحہ آن پہنچا..... وہ خنجر تھی، وہ اسے سینے سے لگالیں گی۔ وہ تڑپتی رہی، مچلتی رہی مگر نادیہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ زویا کو غصہ تو تھا مگر اب وہ ازالہ چاہتی تھی۔ ان سے لپٹنا چاہتی تھی، معافی چاہتی تھی۔ اُدھر وہ تھیں جو کچھ اور سوچنے کو تیار نہیں تھیں۔ کٹھور پتھر بنی ہوئی تھیں۔ زویا کو ان کی سختی پر غصہ بھی آرہا تھا۔ پھر جب شادی ہال سے نکل کر گاڑی تک پہنچنے کا سفر کم ہی رہ گیا تو وہ تیزی سے مڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

اس اچانک افتاد سے نادیہ گھبرا گئیں جس کے لیے وہ قطعاً تیار نہ تھیں مگر انہوں نے بہت چابکدستی سے اسے کاندھے سے پکڑ کر وہیں روکنا چاہا مگر وہ ان کے گلے لگ چکی تھی۔ پھوٹ، پھوٹ کر رودی۔

''ممی معاف کردیں پلیز۔'' اس کے آواز بھینچ کر سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ آنکھوں میں آئی جھلمل نمی کو لمحہ بھر میں انہوں نے صاف کرلیا۔

''معاف کردیں ممی.....'' زویا نے صدقِ دل سے ان کے کانوں میں سسکیاں لیتے ہوئے سرگوشی کی۔

دنیا تو رونے کو ماں بیٹی میں جدائی سمجھ رہی تھی۔ مگر دونوں ہی جانتی تھیں یہ رونا کیوں ہے؟ یہ معافی کیسی ہے؟ یہ آنسو کیوں نہیں رک پارہے؟

"کر دیا......" اتنا مختصر جواب...... زویا کو تڑپا گیا۔

وہ پھر ان سے چمٹنے کو قریب ہوئی۔ انہوں نے آناً فاناً اسے کاندھے سے پکڑ کر اس کے شوہر کے سپرد کر دیا۔ اور خود اپنے قدم ایڑی کے بل الٹے گھوم کر پیچھے کر لیے۔

بارانی ہجوم میں ماں پیچھے رہ گئی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ تو گئی مگر دل وہیں ماں کے قدموں میں چھوڑ آئی۔

اگلے دن وہ میکے آئی...... نادیہ کی چپ ٹوٹ نہ سکی، زویا پورا دن روتی رہی مگر نادیہ پتھر سے موم نہ ہو سکیں۔

"بیٹا کچھ وقت ہمیں بھی دے دو......" خود نادیہ کو اپنی آواز بھیک مانگتی محسوس ہوئی۔ ان کا تناؤ بڑھتا چلا گیا۔ وہ خود کو کمپوز کرنے کی سعی میں ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔

ہفتے بھر بعد ہی زویا ہنی مون پر چلی گئی۔

جاتے وقت ملنے آئی سر پٹخ پٹخ کر معافی مانگی مگر نادیہ کو اپنے لیے وقت کی بھیک مانگتے جملے کانوں میں گونجتے رہے۔

وہ کیسے وہ بے عزتی بھولتیں جب ان کی بیٹی نے ان کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ یہ وہ پہلی ذلت تھی جو پوری زندگی میں ایک ہی بار ان کے حصے میں آئی اور یہ بے عزت و بے وقعت کرنے والی کوئی اور نہیں ان کے اپنے وجود سے نکلی ان کی بیٹی تھی۔

☆☆☆

ڈیڑھ ماہ بعد وہ وطن لوٹی تو بے چینی و بے قراری سوا تھی ڈھیر سے تحائف لیے وہ ہاشم کے ساتھ میکے آئی تو باہر پڑا موٹا سا آہنی تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

جانے کیوں اسے خطرے کی گھنٹی بجتی محسوس ہوئی۔

"تمہاری ممی کہاں ہیں؟ تم نے آنے سے پہلے فون نہیں کیا تھا؟" ہاشم نے تیوری چڑھائی۔

"نہیں، نہیں۔" وہ جز بز ہو رہی تھی۔

"پتا کرو وہ کہاں ہیں۔" ہاشم نے سر پیچھے ٹیک دیا۔

اس نے نمبر ملایا جو پاورڈ آف جا رہا تھا۔

اس کا ماتھا ٹھنکا۔ خطرے کا الارم نان اسٹاپ بجنے لگا۔ اس کی چھٹی حس کوئی اور ہی الارم بجا رہی تھی۔

ہاشم نے اس کی سمت دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ہاشم اس کی دلی کیفیت سے مکمل طور پر بے خبر تھے۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے ناگواری سے بولے۔

"میں تمہیں کب سے کہہ رہا تھا کہ کچھ دیر مجھے سونے دو مگر تمہیں ممی سے ابھی ملنے کی ضد تھی۔ تم نے انہیں اپنے آنے کا نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں...... میں انہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی، ویسے ان کے علم میں تھا میں ڈیڑھ ماہ بعد آ جاؤں گی۔"

"حد کرتی ہو تم۔" ہاشم کو اپنی نیند زیادہ عزیز تھی۔ زویا نے انہیں سونے نہ دیا وہ چڑچڑے ہوتے گئے۔

گاڑی ایک اسٹور پر پارک کی۔

"میں پانی لے کر آتا ہوں......" وہ باہر نکل گئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں میں گہری دھند کے سوا بچا کیا تھا۔ موبائل کو تکنے لگی۔ پھر زور سے چونکی۔

ممی کا دو دن قبل کا میسج تھا جو مصروفیت کے باعث موبائل آن نہ کر سکنے کے سبب دیکھ نہیں پائی تھی۔

اس نے میسج آپشن پر کلک کیا لکھا تھا۔

"تمہارے آنے سے قبل میں کراچی چھوڑ کر جا چکی ہوں گی۔ کہاں......؟ یہ بتانا ضروری نہیں...... اور یہ اسے بتایا جاتا ہے جس سے ملنے کی خواہش ہو...... اور مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں...... ایک وقت تھا جب میں تم سے بات کرنے کو ترستی تھی۔ چند لمحے مانگا کرتی تھی۔

پھر میں نے تمہارے بغیر جینا سیکھ لیا...... اور اب تم مجھ سے ملنے کی عمر بھر دعا مانگا کرنا۔ میں سب کچھ معاف کر سکتی ہوں مگر اپنی وہ بے عزتی نہیں...... جس میں مجھے میری ہی آواز بھکاریوں سی لگی۔"

وہ ہذیانی انداز میں بار بار انہیں فون کر رہی تھی اور موبائل سے ہر بار پاورڈ آف کا ریکارڈ بج رہا تھا۔

"ایسا منہ چھپاؤں گی تمہیں ڈھونڈے نہ ملوں گی۔" ممی کا کہا جملہ دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگا۔

بہارین چکن گونیا کی

شمع تفسیر

ہماری شادی کو کل آٹھ مہینے ہوئے تھے اور ہم الحمدللہ .... بہت اچھے حال میں تھے۔ بس ایک ہی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے ہم از حد جھنجلاہٹ کا شکار تھے وگرنہ سسرال کا ماحول بے حد اپنائیت والا تھا۔ ساس اگرچہ رعب دار خاتون تھیں تاہم بلاوجہ کا رعب انہوں نے کبھی نہ جمایا، سسر بھی بہت شفیق تھے۔ گھر میں جیٹھ، جیٹھانی ان کے بچے، نند، دیور سارے ہی رشتے موجود تھے۔

رہے گھر کے کام تو اس کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہماری ساس نے ہماری نند، جیٹھانی اور ہمارے درمیان بہت منصفانہ طریقے سے کاموں کی تقسیم کردی تھی۔ اور ہمارے ''وہ.....'' یعنی سرتاج صاحب دراصل ہماری سسرال میں شوہر کا نام لینا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہمارے سرتاج نے تو ہمیں ملکہ بنا کر رکھا ہوا تھا مگر..... صرف کمرے کی حد تک.....

"دن بھر کام کر کے تھک گئے ہیں یار پانی تو پلا دیں۔" ہم اک ادا سے بولتے۔

وہ فوراً روم فریج سے پانی نکال کر ہمیں پیش کر دیتے۔

"سنیں جی، سر میں بہت درد ہے۔" ہم نزاکت سے کہتے اور وہ بڑے پیار سے ہمارا سر دبانے لگتے۔ جبکہ کمرے سے باہر کا منظر کچھ یوں ہوتا۔

"رابی بھئی جلدی ناشتا لے آؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔" وہ آواز پر آواز لگاتے۔

"ڈائننگ ٹیبل پر لگا دیا ہے ناشتا....." ہم آ کر بتاتے۔

"یار پلیز یہاں لے آؤ....." ہماری دیگر مصروفیات کو نظر انداز کر کے وہ لاؤنج میں ٹی وی کے عین سامنے براجمان ہو کر کہتے۔

"یار رابی، وہ سامنے سے میرا موبائل اٹھا کر دینا۔" کاہلی سے کہا جاتا۔

"کمال ہے سامنے ہی تو رکھا ہے۔" ہم ہاتھ میں تھما کر دبی، دبی آواز میں کہتے۔

"کرنا پڑتا ہے یار....." وہ ایک آنکھ دبا کر سرگوشی کرتے۔

"رابی کنگھا لا کر دینا ذرا....." بیٹھے، بیٹھے ہی فرمائشیں ہوتیں۔ یعنی کمرے میں ہم ملکہ اور کمرے سے باہر وہ بادشاہ..... ہمارا یہ خوب صورت رشتہ بہت متوازن طریقے سے چل رہا تھا، کہیں بھی کسی فریق کی تذلیل کا پہلو نہ تھا۔ شروع کا کچھ عرصہ تو دعوتوں میں گزرا اور اس کے بعد وہی لگی بندھی زندگی جو ہمیں بہت سہل لگ رہی تھی مگر ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

☆☆☆

شادی سے قبل بھی ہم گھریلو امور میں طاق تھے اس لیے یہاں آ کر اس سلسلے میں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا..... ہاں بس ایک چیز سے ہماری جان جاتی تھی اور وہ تھا تقریبات میں جانا..... کسی کی شادی، کسی کا مایوں، کسی کا سوئم، کسی کی سالگرہ یا پھر کسی کے ہاں دعوت..... ان

کرتی تھیں..... ہم اپنی بھابی اور چھوٹی بہن کے حصے کا کام بھی گھر پر ہی رہ کر خوشی، خوشی کر لیتے اور صاف کہہ دیتے کہ خدارا ہمیں گھر سے باہر جانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ کئی بار امی کے سمجھانے بجھانے اور پھر گھر کنے پر امی کے ہمراہ گئے بھی تو ایسی بور شکل بنا کر کہ آئندہ امی نے ہمیں ساتھ لے جانے سے توبہ کر لی۔

مگر جناب..... یہ ہمارا میکا نہیں سسرال تھی۔ یہاں ہم مطلق العنان حکمران نہیں بلکہ معصوم اور تابعدار رعایا تھے۔

سو امی جان (ساس صاحبہ) حکم صادر فرماتیں۔

"دلہن آج میری خالہ زاد بہن کے پوتے کا عقیقہ ہے..... رات آٹھ بجے نکلنا ہے، تیاری پہلے سے کر کے رکھنا کبھی لائٹ چلی جائے۔"

"جی امی جان۔" ہم سعادت مندی سے سر جھکا کر کہتے۔

"دلہن آج میری ماموں زاد بھاوج کا سوئم ہے! سارے کام چھوڑ دو فوراً تیار ہو جاؤ، ذرا پہلے سے چلیں گے۔" وہ قطعیت سے کہتیں اور ہم روتے ہوئے دل کو خاموش تسلیاں دیتے کمرے کی طرف چل دیتے۔ شروع، شروع میں آنا کانی کی کوشش کی تو انہوں نے اپنے مخصوص بارعب انداز میں کہا۔

"دیکھو دلہن آج سمجھائے دے رہی ہوں..... ہمیشہ کے لیے یاد رکھ لینا! ہمارے ہاں بہویں ہی آنا جانا، میل ملاپ، خوشی غم نبھاتی ہیں..... تم سے پہلے ثروت میرے ساتھ جاتی تھی۔ اب بھی چھوٹے بچوں کے باوجود وہ تقریبات میں شرکت کرتی ہے مگر تم تو ابھی فارغ ہو ناں..... تمہیں بھلا کیا مسئلہ ہے؟"

"نہیں امی جان..... کچھ مسئلہ نہیں ہے ہم تو بس گھر کے کاموں کی وجہ سے کہہ رہے تھے۔" ہم نے منمنا کر کہا تو وہ ہنکارا بھر کر خاموش ہو گئیں مگر اس دن کے بعد سے ہمارا ان کے ساتھ جانا لازم و ملزوم ہو گیا۔

☆☆☆

اس سلسلے میں سرتاج صاحب سے غم بانٹنا چاہا تو

وہ بدک کر بولے۔ ''نہ بابا نہ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

''مگر کیوں؟'' ہم نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ امی جان سے میں اب بھی اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا اپنے بچپن میں ڈرتا تھا۔'' وہ مزے سے بولے۔

''ہونہہ..... مامازبوائے۔'' ہم نے انہیں چڑانا چاہا۔

''ہاں یار یہ تو ہے.....'' انہوں نے چڑنے کے بجائے آرام سے اقرار کرلیا تو بے بسی کے احساس سے ہماری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''ارے میرے دل کی ملکہ اس کا ایک حل ہے میرے پاس۔'' وہ ہمارا ہاتھ تھام کر پیار بھرے لہجے میں بولے۔

''وہ کیا؟'' ہم نے بے قرار ہوکر پوچھا۔

''تم جلدی سے خوشخبری سنادو امی جان کو..... یقین جانو ان چکروں سے نجات مل جائے گی تمہیں۔'' وہ نرم اور دھیمی آواز میں بولے تو ہم شرم سے سرخ چہرہ لیے رخ پھیر گئے۔

☆☆☆

''دلہن یاد ہے ناں، آج فائزہ کے دیور کے بیٹے کی سالگرہ میں جانا ہے ذرا بہترین سا جوڑا نکال کر ابھی سے استری کر کے رکھ لو.....'' ہم اپنے روزمرہ کے کاموں سے فارغ ہوکر بیٹھے ہی تھے کہ امی جان نے سروتے سے چھالیا کترتے ہوئے یاددہانی کروائی۔

''جی امی جان..... ہمیں یاد ہے! ویسے اور کوئی نہیں جائے گا کیا؟'' ہم نے پوچھا۔

''عائزہ اور عارب بھی چلیں گے ہمارے ساتھ..... سمجھیانے کی بات ہے۔'' انہوں نے ہماری نند اور دیور کا نام لیا۔

''ثروت بھی چلتی مگر ہانی کو بہت تیز بخار ہے، بیمار بچے کو لے کر کہاں جاسکتی ہے اس لیے میں نے خود ہی منع کردیا۔'' انہوں نے جیٹھانی کے حوالے سے وضاحت کی تو ہمیں اپنے سرتاج کی کہی بات یاد آئی۔

''بالکل صحیح کہہ رہے تھے وہ..... بس اب یہی حل ہے۔'' دل ہی دل میں بہت سے ارادے باندھے اور پھر بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پر آگئی۔ ''توبہ..... کیا ہو گیا ہے ہمیں۔''

ٹھیک ٹائم پر ہم سب فائزہ آپی کے گھر پہنچ گئے تھے، کافی لوگ سالگرہ کی تقریب میں موجود تھے، گھر کے کشادہ لان میں ہی بڑا خوب صورت سا سیٹ اپ کیا گیا تھا۔ مہمان خواتین زور شور سے باتیں کررہی تھیں اور موضوع گفتگو تھا چکن گونیا..... جی تازہ ترین بیماری.....

''ہاں بھئی چکن گونیا نے تو عاجز کردیا ہے میری ساس بیچاری ایک مہینے سے بستر پر ہیں۔'' فائزہ آپی کی نند نے کہا۔

''ارے بوڑھے تو بوڑھے، اس چکن گونیا نے تو جوانوں کو بھی نہ چھوڑا۔'' ایک خاتون نے تبصرہ کیا۔

''واقعی جوڑ، جوڑ دکھ جاتا ہے توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ چکن گونیا، میں تین ماہ بعد گھر سے نکلی ہوں ورنہ تو لگ رہا تھا کہ اب کبھی بستر سے اٹھ نہ پاؤں گی۔'' اس بیماری کی شکار ایک اور خاتون نے اپنا تجربہ بیان کیا۔

''آپ تین ماہ کی بات کررہی ہیں، یقین کریں چھ ماہ ہوگئے ہیں، میرا بیس سالہ بیٹا اب تک صحیح طور پر سنبھل نہیں پایا ہے، ہر دس بارہ دن بعد پیروں پر سوجن آجاتی ہے عجب مرض ہے یہ۔'' ایک ادھیڑ عمر خاتون بولیں۔

''بس بھئی قربِ قیامت ہے جو یہ نئی، نئی بیماریاں سامنے آرہی ہیں۔'' ہماری ساس بھی کانوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔ اس کے ساتھ ہی کیک کاٹنے کا اعلان ہوا اور سب خواتین اس طرف متوجہ ہوگئیں۔

☆☆☆

آج ہم امی جان کے ہمراہ پڑوس کے ایک گھر میں منعقد محفلِ میلاد میں موجود تھے بہت روح پرور ماحول تھا۔ میلاد کے بعد کھانا لگا دیا گیا اور کھانے کے دوران وہی ہاٹ ٹاپک زیرِ بحث تھا۔

''ارے بھئی اللہ بچائے اس ''چکن گونیا'' سے۔''

ایک ضعیف خاتون دعائیہ انداز میں بولیں۔ ان کے ''چکن گونیا'' کہنے پر کئی چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی

''ارے خالہ کس کو ہوگیا'' چکن مونیا۔'' ایک دوسری خاتون نے اپنی دانست میں ان کی تصحیح کرتے ہوئے کہا تو نوجوان لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں۔ ان کی ہنسی پر خاتون نے لڑکیوں کو تیز قسم کی گھوری سے نوازا اور دوبارہ استفسار کیا۔

'' بتاؤ ناں خالہ کسے ہوگیا یہ موا چکن..... اے لڑکیوں کیا نام ہے اس مرض کا۔'' بولتے، بولتے وہ رکیں۔

''آنٹی چکن گونیا.....'' ایک لڑکی اپنی مسکراہٹ دبا کر بول۔

''ہاں تو خالہ کسے ہوگیا چکن گونیا.....'' اب کے انہوں نے بھرپور اعتماد سے پوچھا۔

''ارے بیٹا، بہو بستر پر پڑی ہے ہماری..... کبھی پیروں پر سوجن اور درد کبھی ہاتھ بیکار تو۔ کبھی گھٹنوں پر ورم.....'' وہ پریشانی سے بولیں۔

''یہی ہوتا ہے اس بیماری میں..... میری بھانجی بھی چکن گونیا کا شکار ہے دو ماہ ہوگئے ہیں..... یہ بیماری واقعی توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ انسان کہیں آنے جانے جوگا نہیں رہتا۔'' پڑوس کی مسز نثار بھی بولیں۔

ہم نہایت توجہ سے یہ باتیں سن رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ چکن گونیا تو بڑے کام کی چیز ہے..... یعنی کمال ہوگیا بندہ چل نہیں سکتا تو بھلا کہیں باہر کیسے جائے گا۔

''سنیں جی اگر ہمیں چکن گونیا ہوجائے تو.....؟'' رات کو بڑے ناز بھرے لہجے میں سرتاج سے مخاطب ہو کر ہم نے کہا تو وہ گویا تڑپ کر بولے۔

''توبہ کرو توبہ.....! جن کو ہوا ہے ان سے ذرا حال پوچھو جا کر..... میرا ایک کولیگ ایک ماہ سے چھٹی پر ہے، اس کے گھٹنوں میں بیٹھ گیا ہے درد۔''

''اچھا تو کیا اس بیماری میں بالکل نہیں چلا جاتا؟'' ہم نے بے یقینی سے پوچھا۔

''شروع میں تو بالکل نہیں چلا جاتا..... سہارے کے بغیر ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جاسکتے میڈم۔'' انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''پھر تو کہیں جا، آ بھی نہیں سکتے ہوں گے۔'' ہم نے خوابناک سے لہجے میں کہا۔ اس لیے کہ ہم تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔

ہماری اس بات اور انداز پر سرتاج نے ہمیں سر سے پیر تک گھورا اور منہ پر تکیہ رکھ کر لائٹ آف کردی۔

''ہونہہ..... پاگل ہی سمجھ رہے ہوں گے ہمیں۔'' منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر ہم نے بھی کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

آج ہم نے واشنگ مشین لگائی ہوئی تھی صوفوں کے کور، اوڑھنے، بچھانے والی چادریں اور ہم دونوں میاں، بیوی کے کپڑے بھی کافی تعداد میں جمع ہوچکے تھے سو دل میں تہیہ کیا ہوا تھا کہ آج ہر حال میں ایک، ایک کپڑے کو دھو ڈالنا ہے اور پھر ڈھیر سارا آرام کریں گے کیونکہ آج شام اور رات کا مکمل کام ہماری نند عائزہ اور ثروت بھابی کے ذمے تھا۔ یہ بھی ہماری ساس کا بنایا ہوا تھا قانون تھا کہ جو فرد کپڑے دھوئے گا اس روز دیگر کام دوسرے کریں گے سو ہم بہت خوش خوش کپڑے دھو رہے تھے کہ امی جان کی آواز نے ہماری ساری خوشی ملیامیٹ کردی۔

''دلہن بس اب کپڑے سمیٹ دو ویسے بھی تقریباً سارے ہی دھل چکے ہیں۔''

''کک..... کیوں امی جان.....؟'' کچھ، کچھ سمجھتے ہوئے بھی ہم نے سوال کر ڈالا۔

''ارے دلہن! ابھی ابھی فون آیا ہے..... ہماری چچازاد بہن کی نند کا انتقال ہوگیا ہے اور ہماری چچازاد بہن کون سی دوسرے خاندان میں گئی ہے، ہماری ہی برادری کے ہیں اس کے سسرال والے..... بس تم تیاری کرلو فوراً چلنا ہے، اپنوں میں پہلے سے جانا پڑتا ہے بھئی۔'' وہ تو حکم صادر کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں جبکہ ہماری آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہہ نکلے۔

''ارے بھابی..... آپ اتنی نرم دل ہیں، امی جان کی چچازاد بہن کی نند کے انتقال کا سن کر آپ رو رہی ہیں..... عظیم ہیں بھابی آپ بہت عظیم ہیں۔'' ہمارا دیور عارب جو ساری کارروائی دیکھ رہا تھا ہمارے پاس آکر

سنجیدگی سے بولا مگر آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔
''ہونہہ...... یعنی پتا ہے کو ہے کہیں آنے جانے سے کتنی جان جاتی ہے ہماری۔'' ہم دل ہی دل میں کلس اٹھے۔
''ویسے پیاری بھابی آپ نے کبھی دیکھا تھا مرحومہ کو......؟'' بظاہر بڑی سادگی سے سوال ہوا۔
''نہیں...... آج ہی دیدار کریں گے...... آخری۔'' ہم نے کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا۔
''تو پھر رونا کیوں آیا آپ کو......؟'' اس نے ڈھیر ساری حیرت اپنے لہجے میں سمو کر کہا۔
''بس اب تو کسی کے بھی انتقال پر ہم یوں ہی رو دیتے ہیں۔'' ہم ذرا چیخ کر بولے۔
''مگر کیوں میری پیاری بھابی......؟'' عارب سراپا سوال تھا۔
''جانا جو پڑتا ہے۔'' اس بار ہم برداشت نہ کر پائے اور لٹھ مار انداز میں جواب دیا۔
''سچ بولنے کے لیے شکریہ......'' عارب ماتھے تک ہاتھ لے جا کر بولا تو ہمیں ایک دم ہی ہنسی آ گئی۔ عارب کا قہقہہ بھی بے ساختہ تھا۔

☆☆☆

آج صبح اٹھتے ہی ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے ہاتھوں اور پیروں میں جھٹکا سا آیا ہوا ہے ''انہیں'' آفس کے لیے روانہ کرتے ہی امی جان کو بتا کر تھوڑی دیر کے لیے بیڈ پر آ کر لیٹے تھے کہ نیند نے آ لیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب ہماری آنکھ کھلی اور ہم نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو کمال ہی ہو گیا۔ ہاتھوں نے ہلنے سے انکار کر دیا پیروں نے چلنے سے انکار کر دیا۔
''آ...... ؤ......'' ہمارے لبوں سے چیخ سی نکل گئی۔
امی جان جو لاؤنج میں ہی تھیں...... آواز سن کر ہمارے کمرے میں آ گئیں کیونکہ دن میں ہم دروازہ کھلا ہی رکھتے تھے۔ ہماری نند عائزہ اور عارب بھی ان کے ہمراہ تھے۔
''کیا ہوا دلہن......؟'' انہوں نے پریشانی سے کہا۔

ہٹائی جا رہی اپنے اوپر سے...... ہمیں کیا ہوا ہے انگلی تک نہیں ہلائی جا رہی۔'' ہم نے بے بسی سے کہا۔
''اٹھنے کی کوشش کرو بیٹا......'' وہ ہمیں سہارا دیتے ہوئے بولیں۔
''ہاں بھابی پلیز اٹھنے کی کوشش کریں۔'' عارب درد مندی سے بولا۔ تو ہم نے اس کی ہمدردی پر اسے ممنون نظروں سے دیکھا مگر اسی دوران اس نے اگلا جملہ داغا۔
''دیکھیں ناں! آج تو آپ نے امی جان کے ساتھ پھوپا نذیر کے بھائی کے پوتے کی رسم آمین میں بھی تو جانا ہے۔''
اس کے اس جملے پر ہمارے ساتھ، ساتھ امی جان نے بھی اسے غصے سے گھورا۔
''فکر نہ کرو، آج تم جاؤ گے میرے ساتھ...... یونیورسٹی کی چھٹیاں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ کہیں آنے جانے جوگے ہی نہ رہو......'' امی جان عارب کی کلاس لیتے ہوئے بولیں۔ ہماری نگاہیں جو عارب پر شرارے برسا رہی تھیں اب اس کی طرف مسکراہٹوں کے بگولے ارسال کرنے لگیں۔
''برے پھنسے......'' وہ سر پر ہاتھ رکھ کر منہ ہی منہ میں بولا اور بیچارگی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ ہم اس کی طرف دیکھ کر کروکٹری کا نشان بنانا چاہتے تھے مگر ہائے...... اس درد و ستم گر نے اجازت نہ دی۔
''امی جان بہت درد ہو رہا ہے۔'' ہم نے ایک مرتبہ پھر دہائی دی۔
''زمین پر پاؤں تو رکھو دلہن......'' امی جان نے فکر مندی سے کہا۔
''امی جان ہلایا تک نہیں جا رہا پاؤں......'' ہم نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔
''اے دلہن...... کہیں تمہیں وہ تو نہیں ہو گیا وہ...... وہ ارے وہی ناس پیٹا چکن گنیا۔'' وہ بولیں۔
''امی جان چکن گنیا نہیں چکن گونیا۔'' عارب نے تصحیح کی۔

بھی نہیں کہ نام لیتے ہوئے دس بار سوچیں..... بس جو بھی کہا کہہ دیا۔" انہوں نے جھلا کر کہا۔

"اچھا تو کچھ مرض عزت مآب بھی ہوتے ہیں؟ ویسے صحیح کہا آپ نے، چکن گونیا تو ہر دوسرے بندے کو ہو رہا ہے مگر کچھ بیماریاں خاص الخاص ہیں..... جیسے کینسر..... جیسے ہیپاٹائٹس جیسے....." ابھی وہ کچھ اور نام لیتا مگر امی جان غصے سے بھڑک اٹھیں۔

"کیا ہذیان بکے چلے جا رہے ہو..... کہا بھی ہے ناگن چورنگی چلنا ہے میرے ساتھ۔ جا کر تیاری کرو اپنی۔"

"ویسے امی جان یہ ناگن چورنگی کو ناگن چورنگی کیوں کہتے ہیں! کہیں خدانخواستہ وہاں کوئی ناگن وغیرہ....." وہ اپنی ہی رو میں بولتا چلا جا رہا تھا کہ امی جان کے غصے سے لال بھبوکا چہرے پر نظر پڑی تو سٹپٹا کر خاموش ہو گیا۔ سب سے چھوٹی اولاد ہونے کے ناتے اسے امی جان کی حضور میں کچھ رعایتی نمبر ضرور حاصل تھے مگر آج اس رعایت کی میعاد ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"عارب..... خاموش....." امی جان نے رعب دار انداز میں بس دو لفظ کہے اور عارب اتنا معصوم نظر آنے لگا جیسے مونٹ کلاس کا بچہ۔ ہمیں اپنے سر تاج کا خیال آیا وہ بھی تو امی جان سے اتنا ہی ڈرتے تھے بلکہ اس سے کہیں زیادہ..... ہلکی سی مسکراہٹ ہمارے لبوں پر آ گئی جسے یقیناً عارب نے اپنی توہین جانا تھا کیونکہ اس کی عزت افزائی پر عائزہ بھی زیر لب مسکرا رہی تھی اس نے امی جان سے نظر بچا کر ہم دونوں کو دیکھ کر منہ پر ہاتھ پھیرا، جس کا مطلب یقیناً یہی تھا کہ "آج ہم..... کل تمہاری باری ہے۔"

"بھابی آپ کو کوئی پین کلر دے دوں....." عائزہ نے عارب کی اشارتی دھمکی کو قطعاً نظر انداز کر کے ہم سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا..... یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! دواؤں والے ڈبے سے نکال لاؤ اور نیم گرم دودھ کے ساتھ دے دو....." امی جان بولیں۔

لینے چلی گئی۔

"دلہن تم پریشان مت ہونا، میں بھی جلد آ جاؤں گی بھائی نذیر کے ہاں سے، بھئی لین کا دین تو کرنا ہی پڑتا ہے..... ہمارے ہاں فواد کے ولیمے میں ڈھائی ہزار دے کر گئے تھے بھائی نذیر کے چھوٹے بھائی..... اب دینے کی باری ہماری ہے۔" امی جان ہمیں تسلی دینے کے ساتھ ہی اپنے وہاں جانے کی اہمیت سے آگاہ کرنے لگیں۔

"جی امی جان، آپ بے فکر ہو کر جائیں ہم ان شاء اللہ ان دو ٹیبلٹس سے ہی اٹھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔" ہم نے انہیں ٹیبلٹس دکھا کر کہا۔

"ہاں دلہن ان شاء اللہ.....!" وہ دعائیہ انداز میں بولیں۔

ٹیبلٹ کھا کر ہم نے ایک مرتبہ پھر ہلنے جلنے کی کوشش کی مگر بے سود..... زمین پر پیر رکھنا تو دور کی بات بستر پر ہی ذرا سی جنبش سے گویا جان نکل رہی تھی۔

"ارے دلہن ابھی تو گولی کھائی ہے فوراً تھوڑی اثر ہو گا ابھی لیٹی رہو اور اگر یہ وہی چکن گونیا ہے تو..... پھر تو انجیکشن لگیں گے روز..... بس اللہ جلدی سے صحت یاب کرے تمہیں، ارے ابھی تو تم نے میرے ساتھ کتنی ہی تقریبات میں جانا ہے۔" انہوں نے گویا ہمارا دل بہلانے کی کوشش کی لیکن درحقیقت یہ دل دہلانے کے مترادف تھا۔

"کتنی تقریبات امی جان.....؟" ہم نے مرے، مرے انداز میں پوچھا۔

"ایک تو وہی ہماری بہن کی نند کا چہلم ہے..... پھر ہماری نند فیروزہ کے جیٹھ کے بیٹے کا ولیمہ ہے اور اسی مہینے نواب شاہ بھی چلنا ہے۔ میرے بھانجے کی شادی ہے، شروع سے ہی میرا لاڈلا ہے وہ..... اور سب سے ضروری بات تمہارے تایا سسر کی برسی بھی اسی مہینے ہے۔" امی جان نے سارا پروگرام ہمارے گوش گزار کر دیا جسے سن کر ہمارے جسم کا سارا درد سمٹ

چہرے پر نمایاں ہو گئے۔

''کیا ہوا دلہن ..... کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے؟'' امی جان ہم سے پوچھ رہی تھیں اور ہم کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا کی تصویر بنے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

''ان میڈیسنز کے علاوہ انہیں پانچ روز تک انجیکشن لگیں گے..... صبح شام چاہیں تو گھر پر ہی نرس ارینج کر کے لگوا لیجیے گا کیونکہ فی الحال ان کے لیے چلنا بہت دشوار ہوگا۔'' ڈاکٹر صاحب نے ہمارے سرتاج کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''جی ڈاکٹر صاحب.....'' انہوں نے ہماری طرف فکرمندی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور مسز فواد آپ کو میری ہدایات یاد ہیں ناں.....'' ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف رخ سخن کیا۔

''جی ڈاکٹر صاحب بالکل یاد ہیں۔'' ہم نے کہا۔ ''نمبر ایک چالیسواں نمبر دو ولیمہ نمبر تین نواب شاہ میں شادی اور نمبر چار برسی۔'' ارے جناب گھبرائیں مت! یہ چاروں نکات ہم نے دل ہی دل میں دہرائے تھے۔ بہ مشکل تمام گھر پہنچے قدم بڑھانا تو دور کی بات پاؤں ہلانے سے جان نکلی جا رہی تھی..... گاڑی سے اترنا تو گویا قیامت تھا۔

بہر طور اب ہم اپنے کمرے میں تھے، امی جان اور ثروت بھابی ہمارے پاس بیٹھی تھیں۔ اس تکلیف کے عالم میں بھی ہمیں لگ نہیں رہا تھا کہ ہم اپنے میکے سے دور اپنی سسرال میں موجود ہیں کیونکہ ہمارے سارے سسرالی رشتے از حد ہمدرد اور پُرخلوص تھے اور پھر امی جان کی آواز نے ہمارے کانوں میں گویا رس گھولا۔

''ثروت بیٹا اس مہینے تقریبات بہت ہیں اب رابعہ کی تو طبیعت خراب ہے..... تم نے میرا ساتھ دینا ہے، نواب شاہ تو خیر عارب کو لے جاؤں گی باقی جگہوں پر تم میرے ساتھ چلنا.....''

''ٹھیک ہے امی جان..... آپ کے ساتھ میں چلوں گی۔'' بھابی نے خندہ پیشانی سے کہا تو ہمیں ان پر پیار آ گیا۔

''بھابی آپ بہت اچھی ہیں۔'' کہے بغیر رہا نہ گیا۔

''اچھا، وہ کیوں بھئی.....'' وہ بے ساختہ ہنسیں۔

''آپ ہمارا اتنا خیال جو رکھ رہی ہیں۔'' ابھی ہم نے کہا ہی تھا کہ ایک اور آواز ابھری۔

''اور امی جان کے ساتھ تقریبات میں بھی تو جا رہی ہیں۔'' آنکھوں میں شرارت تھی۔

''عارب.....!'' ہم نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا تو وہ مسکرا دیا۔ یہ سچ تھا کہ ہاتھوں پیروں گھٹنوں کی تکلیف اپنی جگہ مگر ہم جیسی آدم بیزار کے لیے گھر پر رہ کر اتنے دن گزارنا ایک بہت بڑی اور پُرسکون تفریح تھی..... درحقیقت چکن گونیا جیسی بیماری کی آمد پر ہم بہت خوش تھے، ویسے بھی سیانے کہہ گئے ہیں کہ کسی بیماری کے آنے پر اسے برا نہیں کہنا چاہیے بلکہ ہمت کے ساتھ ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے..... اور جناب ہم نے کیا مقابلہ کرنا تھا ہمارے لیے تو یہ موسم بہار تھا۔

یہی وجہ تھی کہ رات جب سیاں جی پریشان اور فکر مند انداز میں کمرے میں داخل ہو کر بے قراری سے ہماری طرف بڑھے تو ہم بڑے مگن اور بے فکرانہ انداز میں ہولے، ہولے گنگنا رہے تھے۔

''تھا یقیں کہ آئیں گی یہ بہاراں کبھی
کسی سے نہ ہوں گی..... کسی سے نہ ہوں گی
ملاقاتاں کبھی.....''

اور وہ دم بخود سے ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہمارے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

اگلے ہی لمحے وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے ساختہ مسکرا دیے۔

وہ کیا کہتے ہیں.....

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے
باغ تو سارا جانے ہے

سلسلے وار ناول

قسط نمبر 5

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت... اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے... کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں... غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہونِ منت ہے... لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے... اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے
کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے

ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے

وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے

عمامہ کے خلاف تب ہی گھر میں دبا، دبا سا محاذ کھل گیا تھا۔ اگر طابہ نہ بھی بتاتی تب بھی فیقہ اندر سے بہت پہلے کھٹک گئی تھی، اسے عمامہ کا شام کی طرف جھکاؤ بہت پہلے سے ہی نظر آ گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے ماں کے کانوں تک بھنک پڑنے نہیں دی تھی۔ مبادا اپوتی کی "خواہش" پر دادی کا دل ہی پسیج جاتا۔

اور سچ تو یہ تھا کہ دادی اور فیقہ کی دبی، دبی نفرت، طنز و تشنیع اور آنکھوں کی حقارت نے عمامہ کو ایک کمرے تک محصور کر دیا تھا۔ دادی اور فیقہ اس کے فرخ سے شادی پر انکار کی وجہ سے تلملا رہی تھیں...... اور سب سے زیادہ نزلہ طاہرہ پر گر رہا تھا۔ پھر جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تب انہیں خیال گزرا کہ طاہرہ ماں ہونے کے ناتے سب سے زیادہ ان کے "عتاب" کی حق دار ہیں۔ ان کے کٹیلے جملے اور حقارت میں لتھڑے الفاظ بہوؤں کے سامنے طاہرہ کو عرق، عرق کر دیتے تھے۔

"یہ کیسی ہے تربیت؟ شروع سے خود سر اور حاسد تھی۔ پہلے بھابیوں سے جلتی تھی اب میری معصوم بچی کی خوشیوں سے جل اٹھی۔ اس کو سمجھا دو طاہرہ! فیقہ کی خوشی میں دیوار نہ بنے۔" اماں کے الفاظ، طعنے، طنز سن، سن کر طاہرہ کا دل چھ جاتا تھا۔ جانے عمامہ کا گناہ بڑا تھا؟ یا اس گھر کی عورتیں ہی بڑھا چڑھا رہی تھیں...... ایسے نازک حالات میں طاہرہ کی دونوں چھوٹی بہویں فیقہ اور دادی کو حق بجانب سمجھ کر ان کے برابر جا کھڑی ہوئی تھیں جبکہ بڑی دونوں فطرتاً نیک طینت تھیں۔ وہ اپنی ساس کو تسلی تو دے سکتی تھیں تاہم دادی ساس کو روکنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔

گھر کی فضا کتنی مکدر ہے؟ گھر کے مردوں کو کچھ خبر نہیں تھی۔ پھر بھی طابہ کے توسل سے تقی اور طاہر کچھ نہ کچھ جان گئے تھے۔ اور سچ تو یہ تھا سب کچھ جان کر بھی انہیں طابہ کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اگرچہ وہ دونوں بھائی باقی دونوں سے زیادہ جذباتی، بھڑ کیلے اور جوشیلے تھے پھر بھی عمامہ کا معاملہ ایسا تھا کہ دونوں نے ہی طابہ کی خوب کھنچائی کر دی۔

"عمامہ ابھی بچی ہے۔ او پھر شام کو ہماری طرح سمجھتی ہے۔ اس کی نادانی کو اور نظر سے مت دیکھو...... خبردار، جو لگائی بجھائی کی۔ ورنہ زبان کاٹ دوں گا...... عمامہ ہماری لاڈلی بہن اور عزت ہے...... اس کی طرف انگلی اٹھانے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا...... اور چار بچوں کا بھی دھیان رکھنا......" تقی نے جس طرح طابہ کا منہ بند کروایا تھا۔ وہ مارے اہانت کے بھڑ، بھڑ جلنے لگی تھی۔

عمامہ کی وجہ سے وہ ہمیشہ بے عزت ہوتی تھی۔ کبھی تقی سے ڈانٹ پڑ جاتی، کبھی دادی ساس سے تو کبھی اپنی ساس سے خیر اب تو دادی! اسے اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھ کر ہر بات شیئر کرنے لگی تھیں اور انہوں نے طابہ کو سخت تاکید کی تھی کہ وہ شام اور عمامہ پر کڑی نگاہ رکھے۔ اور انہیں منٹ، منٹ کی رپورٹ دے۔ یہی وجہ تھی کہ اگلی تین چار دفعہ کی ملاقاتوں میں جب عمامہ رات کو چھپ، چھپ کر شام کی طرف جاتی رہی تھی، طابہ نے دادی اور فیقہ کو بذاتِ خود پوری فلم دکھا دی۔ اب تو جیسے شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ فیقہ اور دادی کے دل میں عمامہ کے لیے نفرت کا جوار بھاٹا پک رہا تھا۔ اور اسی حساب سے انہوں نے طاہرہ کو بلوا کر اتنا بے عزت کیا کہ وہ اپنی ہی نگاہ سے گر گئی تھیں۔

"بیٹی کو لگام ڈال لو طاہرہ! فیقہ اور شام کے دن مقرر ہو چکے ہیں۔ وہ راتوں کو چھپ چھپا کر شام کو ورغلانے اور اکسانے جاتی ہے۔ مرد ذات کا کیا بھروسا؟ تمہاری بیٹی کی عقل کہاں گئی؟ میں تو کہتی ہوں، پہلے اس کے دو بول پڑھا کر فارغ کرو۔ دل کو عجیب سا کھٹکا ہے۔ کہیں لڑکی چین ہی نہ چرا لے۔ آخر اچھی شکل کا مان کیا کم ہے؟" دادی۔۔۔ زہر خند سی بول رہی تھیں۔ یہ عمامہ پر جان چھڑکنے والی دادی کا حال تھا...... اب عمامہ کی "کمزوریاں" دکھائی کیا دی تھیں...... وہ طاہرہ کی تربیت کو دن رات کچوکے لگاتی تھیں۔ اور اس وقت اپنے عمامہ سے لاڈ اور بگاڑ کو بھول جاتیں۔ آخر عمامہ کی ہر خواہش پوری کر کے اسے ضدی اور خود سر بھی تو انہی دادی نے بنایا تھا۔ طاہرہ کا سر شرم سے جھک گیا اور پھر ایک اشتعال میں......

بھوؤں کے طنز انہیں شرمسار کرتے تھے۔ وہ جیسے اندر سے گھٹ گھٹ کر ختم ہو رہی تھیں۔ پھر یوں ہوا کہ انہوں نے عمامہ کو بہت سمجھایا اور وہ چپ چاپ سمجھتی رہی۔ اس کے چپ چاپ سمجھنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ بغیر بتائے صوفی صاحب بھی اوپر آ گئے تھے۔ اور انہیں اچانک اپنے کمرے میں دیکھ کر عمامہ اندر سے بہت مضطرب ہو گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، اماں اور بابا دونوں آپس میں عمامہ کو سمجھانے کی صلاح کر کے آئے تھے۔ بابا کو اس کے اندر ہونے والی بڑی، بڑی تبدیلیوں کی خبر نہیں تھی۔ وہ وصرف فرخ سے شادی نہ کرنے کی وجہ معلوم کرنے آ گئے تھے اب جو وجہ عمامہ کو پتا تھی وہ بھلا بابا کو کیسے بتاتی؟ شرم، حیا اور لاج آڑے آ رہی تھی۔ پھر اتنے باعزت، باوقار اور درویش صفت باپ کے سامنے اعتراف محبت کا جرم کیسے کر لیتی؟

بابا اس کی کیفیت سے انجان تھے۔ بس فرخ کی تعریفیں کرتے رہے۔ وہ اتنا تعلیم یافتہ ہے۔ وہ اتنا خوب صورت ہے۔ پھر بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا...... بابا کو فرخ بہت پسند تھا۔ انہوں نے جاتے سے عمامہ سے کہا۔

"فرخ اپنی ماں کے ساتھ آئے گا۔ تم بھی دیکھ لینا بیٹی! بات چیت بھی کر سکتی ہو۔ یہ تمہارا شرعی حق ہے۔" وہ اس کی خاموشی کو نیم رضامندی سمجھ کر بہت خوش، خوش کمرے سے نکلے تھے۔ سب نے خواہ مخواہ عمامہ کے "انکار" سے ڈرا رکھا تھا۔ ان کی فرمانبردار بیٹی تو ان کے ساتھ کیا ان کے سامنے بولی ہی نہیں تھی۔ کوئی اعتراض کوئی انکار اس کے لبوں تک آ ہی نہیں سکا تھا۔ رحیم اور شفیق ترین باپ کے وجود کا رعب اور جلال ہی بہت تھا۔ حالانکہ وہ تو بڑے حلیم باپ تھے۔ نہ بیٹوں پہ زور چلاتے نہ بیٹی سے زبردستی کرنا چاہتے تھے۔ عمامہ نے اتنا اہم ترین موقع گنوا دیا تھا۔ اور اب اگر وہ بولتی بھی تو کیا کہلاتی؟

خودسر، ضدی، نافرمان، بے حیا، باپ کی بات اور عزت کو رولنے والی؟ آخر بابا نے فرخ کی ماں کو زبان دے رکھی تھی۔ بابا چلے گئے تو گم صم عمامہ بے خیالی میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اب وہ کسی روبوٹ کی طرح کمرے سے باہر جانا چاہتی تھی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر شام سے مل کے نئی صورت حال کے متعلق باخبر کرنا چاہتی تھی...... تاہم طاہرہ نے غیر محسوس انداز میں عمامہ کا بازو پکڑ کر روک لیا تھا۔

"تم اب شام کے سامنے نہیں جاؤ گی...... اگر ذرا بھی میری عزت کا خیال ہے تو مجھے اپنی دادی اور پھوپی کے سامنے شرمسار مت کرنا...... سن رہی ہو ناں عمامہ! یہ جو دبی، دبی چنگاری بھڑک رہی ہے اسے اپنے ہاتھ سے بجھا ڈالو...... اس میں نسلوں کی بقا پوشیدہ ہے میری بیٹی! تمہاری دادی تمہارے حق کے لیے اپنی بیٹی کا حق نہیں ماریں گی۔ بہرحال انہیں اپنی بیٹی عزیز ہے۔ اور مجھے اپنی بیٹی...... میں تمہیں خوار ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ تم اب شام کے سامنے نہیں جاؤ گی۔" انہوں نے عمامہ کے پھڑ پھڑاتے ہونٹ دیکھ کر بڑے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

حالانکہ ان کا دل تو عمامہ کی حالت زار پر پھٹ رہا تھا۔ کاش وہ اپنی عمامہ کی خوشی پوری کرنے کا اختیار رکھتیں؟

"میں شام کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ میں شام کے ساتھ بھاگ جاؤں گی، سنا آپ نے۔" اس کی چنگھاڑ نے طاہرہ کو ہلا ڈالا تھا۔

☆☆☆

عمامہ کی چنگھاڑ سے صوفی صالح کے گھر کی بنیادیں تک ہل گئی تھیں۔ عمامہ کی چنگھاڑ اب کمرے تک محدود نہیں رہی تھی۔ کمرے سے باہر تک بھی گئی تھی۔ دادی کے تخت تک بھی گئی تھی۔ بھابیوں کے شبستان تک بھی گئی تھی۔ فیقہ کے دل تک بھی گئی تھی۔

طاہرہ نے اس کو بپھرتا دیکھا تھا...... وہ اندر اور باہر سے ڈھے گئی تھیں۔ یہ عمامہ ان کی عمامہ نہیں تھی...... یہ تو کوئی اور ہی عمامہ تھی۔ ان کے اندر بہت خوف اتر رہا تھا۔ جیسے کوئی ناگ دھیرے، دھیرے ان سے لپٹ رہا تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے عمامہ کو تھپڑ مارا تھا۔ اور زندگی میں پہلی [illegible]

انہوں نے عمامہ کو آخری وارننگ دی اور کمرے میں بند کر دیا تھا۔ انہیں یہ قدم اٹھانا ہی تھا۔ حالانکہ کمرا لاک نہیں تھا۔ پھر بھی عمامہ کو باہر نکلنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ماں سے ڈرتی تھی۔ ماں کی مار سے بھی ڈرتی تھی۔ ماں کی جھاڑ سے بھی ڈرتی تھی۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی اور اسی خوف نے اسے باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔

شام کو عمامہ آتے جاتے نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ حالات سے سمجھوتا کر کے اپنی محبت کی قبر بنا کر صبر کا قرینہ سیکھ رہی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ عمامہ کی ہونے والی ساس اپنا اکلوتا لختِ جگر لے آئیں۔ اگر عمامہ کے دل پر شام کی محبت کا موٹا غلاف نہ چڑھا ہوتا تو وہ فرخ کو دیکھ کر اپنے نصیب پر رشک کرتی..... وہ بہت خوب صورت، شریف اور کم گو انسان تھا..... مٹی کا جیسے مادھو..... پھر وہ وکیل جاتے کیسے بنا؟ بابا کے بلوانے پر عمامہ نیچے آ گئی تھی۔ پھر اس نے فرخ کو دیکھ بھی لیا تھا..... وہ ایسا نہیں تھا جسے دیکھ کر ریجیکٹ کیا جاتا، وہ بہت شاندار تھا..... جھکی نگاہوں والا..... دل میں اتر جانے والے نقوش اور سحر انگیز آنکھیں..... عمامہ کی ساس بھی کم گو اور سنجیدہ عورت تھیں۔ عمامہ کو تو بلا کی ''پُراسرار'' لگی تھیں..... اگر وہ ذہنی طور پر اتنی بدحال نہ ہوتی تو اپنی ساس قدسیہ کے انداز ملاحظہ کر کے ضرور چونکتی۔ قدسیہ شرعی پردہ کرتی تھی سو بابا اور بھائیوں کی موجودگی میں منہ ڈھانپ کر بیٹھی رہیں۔ ان کی بس آنکھیں دکھائی دیتی تھیں اور یہ آنکھیں کوئی معمولی آنکھیں نہیں تھیں۔ عمامہ کچھ دیر بیٹھ کر اٹھ گئی تھی۔ پھر جب گول زینہ چڑھنے لگی تب طاہرہ نے اسے اشارے سے روک کر کچھ سمجھایا تھا..... دھیرے سے کچھ بتایا تھا۔ عمامہ سمجھ کر جیسے نہال ہو گئی..... اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

پھر دن بھر عمامہ مسکراتی ہی رہی..... طاہرہ کو پھر سے دھڑکے لگ گئے۔ عمامہ کی خاموشی بھی طوفان تھی اور مسکراہٹ بھی۔

پھر صوفی صالح کی کوٹھی میں رات اتر آئی..... گہری کالی اور بھیانک رات..... ہر طرف مہیب سناٹا بکھر رہا تھا..... حالانکہ دن بھر بڑی چہل پہل تھی۔ فیقہ اور عمامہ کا ایک ساتھ جہیز تیار ہو رہا تھا۔ شادی کے دن مقرر ہو چکے تھے..... ایک ہی تاریخ میں دونوں کی رخصتی تھی۔

بڑا کربناک وہ دن تھا۔ جس دن گھر کی ایک بیٹی کی ڈولی اٹھتی اور دوسری بیٹی کا جنازہ.....

سیاہ آسمان پر بکھرے ستارے دیکھتی وہ دبے قدموں پچھلے صحن میں آ گئی تھی۔ یہاں منال اپنے سنگیوں کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ وہ بے خودی منال کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم منال زور، زور سے پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ جیسے اسے کوئی زبردست جھٹکا لگا ہو..... عمامہ جیسے گھبرا گئی تھی۔ تاہم کچھ دیر بعد منال پھر سے ٹھیک ہو کر ٹہلیں کرنے لگا۔ معاً گھاس پر کسی کے قدموں کی سرسراہٹ ابھری تھی۔

عمامہ نے مڑ کر دیکھا..... وہ نگاہ جھکائے آ گیا تھا۔ عمامہ کے لبوں پر مسکراہٹ امڈ آئی۔

''تمہیں تو اپنی جان کی ذرا پروا نہیں..... ایسی دھمکیاں طاہ بھابی کے ہاتھ کیوں بھجواتی ہو؟ کل کو یہی طاہ بھابی طعنوں پر اتر آئیں گی۔'' وہ آتے ساتھ خفگی سے بولا تھا۔ یقیناً طاہ بھابی نے اسے عمامہ کے حوالے سے کوئی بڑی دھمکی دی تھی۔ تبھی وہ پچھلے صحن میں عمامہ سے ملنے آ گیا تھا۔ شاید پہلی اور آخری بار.....

''صد شکر، میرے مرنے کی خبر کے خوف سے تم اپنے حجرے سے تو نکلے.....'' عمامہ مسکراتی رہی اور شام کی شام جیسی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

''مجھے لگتا ہے..... شام کی شام تمہارے ہاتھوں ہونی ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ الجھے، بکھرے بالوں کے ساتھ وہ بڑا دلفریب لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں ناگواری، چہرے پر بیزاری..... وہ دل پر چکی کا پاٹ رکھ کر آیا تھا۔

''کیوں بلایا ہے؟'' اس کے دیکھنے پر وہ جز بز ہو گیا۔
''تمہیں دیکھنا تھا.....'' وہ دلربائی سے مسکرائی۔
''دیکھ لیا ہے..... اب جاؤں.....؟'' شام فرمانبرداری سے بولا۔ عمامہ کی ہنسی ابل پڑی تھی۔
اتنی نازک صورتِ حال میں بھی وہ ہنستی رہی تھی۔ جانے کتنے دنوں بعد اس حبس کا توڑ ہوا تھا۔ اسے ہنستا دیکھ کر وہ پلٹنے لگا تھا جب عمامہ نے از خود اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شام کو جیسے ڈنک لگا تھا۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹا۔
''تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گی۔'' عمامہ خفا ہوئی۔
''کھا جاؤ تو بہتر ہے۔ خون آشام بلا.....'' شام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکی تھی جسے اس نے چھپا لیا تھا۔ پھر الٹے قدموں پلٹنے لگا جب عمامہ کے الفاظ نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی..... وہ دم بخود رہ گیا تھا۔
''جانتے ہو کل کیا تاریخ ہے؟'' وہ گھوم کر شام کے سامنے آ گئی..... اس نے نگاہ چرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔
''کل تمہارا نکاح ہے۔'' عمامہ جیسے پل صراط پر چلتے ہوئے دھیرے سے جھٹکا کھا کر بولی۔ یہ الفاظ بڑے اذیت ناک جو تھے۔
''کل تمہارا ابھی نکاح ہے۔'' شام نے جیسے اسے یاد کرایا۔
''سو تو ہے.....'' وہ پُراسرار انداز میں بولی۔ پھر اس کے اردگرد گول، گول چکر کاٹنے لگی تھی۔
''یہ کیا کر رہی ہو؟'' اسے چکر کاٹتے دیکھ کر شام الجھ گیا۔ پریشان ہو گیا۔
''کل نکاح ہے..... دیکھ لینا نہیں ہو گا..... اگر ہو گیا تو نام بدل دینا۔'' عمامہ زیرِ لب بڑبڑا رہی تھی۔ ''تم فیقہ کو پسند نہیں کرتے..... کر ہی نہیں سکتے۔ دادی کے احسانات کے سامنے ہار گئے ہو یا پھر میری محبت سے خوف کھاتے ہو۔ جو بھی ہے فیقہ سے نکاح پر کبھی خوش نہیں ہو سکتے۔ یہ مان ہی نہیں سکتی میں..... سو تمہیں خوش کرنے کے لیے میں نے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔'' وہ اسی طرح چکر کاٹتی رہی اور شام کے ہوش اڑاتی رہی۔
''تم..... تم کیا کرو گی.....؟'' وہ بے قرار ہوا۔
''شادی روکوں گی؟'' عمامہ بے خوف تھی۔
''کیسے؟'' شام جیسے دیوانہ ہوا۔ یہ عمامہ کیا پاگل تھی؟ یا پھر ہو رہی تھی؟ یا اسے کر رہی تھی؟
''خود کو مار کر، خود کو آگ لگا کر..... پھر فیقہ کی ڈولی نہیں اٹھے گی، بس میرا جنازہ اٹھے گا..... گھر سے بھاگوں گی نہیں کہ یہ دنیا نہیں چھوڑے گی۔ بس خود کو مار ڈالوں گی تاکہ دنیا والوں کو مجھ جیسی بے بس لڑکیوں پر ''رحم'' آئے، کہو کیا کہتے ہو۔'' وہ آنکھوں میں تلوار جیسا سوال لیے کھڑی تھی۔ شام کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔
''خودکشی حرام ہے۔'' شام نے بے قراری سے کہا..... یہ چہرہ دکھنے کے لیے نہیں تھا۔ مرنے کے لیے نہیں تھا، مٹی کے نیچے دبنے کے لیے نہیں تھا۔ اسے تو بے حساب جینا تھا..... پھر مرنے کی باتیں کیوں کر رہی تھی؟ شام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ضبط، ضبط، درد کے وار سہتے، سہتے وہ ہارنے لگا تھا۔ ہار رہا تھا، ہار گیا تھا۔
''محبت حلال ہے۔'' وہ مطمئن تھی۔
''حلال کے لیے حرام کو اپناؤ گی۔'' شام بے بس سا بول رہا تھا۔ عمامہ کے لفظوں نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ وہ خود کو مضبوط کر کر کے ہار رہا تھا۔
''تم مرو گی تو لوگ پھر سوال اٹھائیں گے۔ انگلیاں اٹھائیں گے۔ اپنے پیچھے اتنے عظیم رشتوں کو سوالیہ نشان بنا جاؤ گی؟ تم پاگل تو نہیں تھیں عمامہ.....'' شام کے اندر کرلاہٹ بڑھنے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ بھی عمامہ کی طرح اونچی آواز میں رو لے..... یا اپنی بھڑاس ہی نکال لے یا کچھ نہیں تو عمامہ کو جب ہی کرا دے۔

''تمہیں تب بھی لوگوں کی فکر ہوگی میری نہیں..... تمہیں اب بھی لوگوں کی فکر ہے میری نہیں..... کتنی بدقسمت ہے عمامہ.....!'' وہ رونے لگی تھی..... اسے رونا ہی تو آتا تھا۔

''تمہیں مجھ سے پیار نہیں..... میرے باپ کی دستار سے پیار ہے..... یہ تو میں ہی بس..... جاؤ شام جاؤ..... میری پروا نہ کرو..... تم تو ہو ہی بزدل.....'' وہ چیخی، چیخی پھر چلائی۔

''پر میں بزدل نہیں..... کل کا سورج دیکھنا..... کس شان سے طلوع ہوتا ہے..... وہ ایڈووکیٹ بھی دیکھتا رہ جائے گا اور تم بھی.....'' عمامہ کی آج آنکھ ہی کوئی اور تھی۔ وہ ذرا بھی ڈری سہمی نہیں تھی۔ شام کا دل تھرتھراتا ہی رہا..... کپکپاتا ہی رہا۔

''محبت بزدل ہی کرتی ہے عمامہ..... تمہیں سمجھ کیوں نہیں آتی۔'' شام بے بس سا بولا۔

''تو چلو پھر..... آج آر یا پار کا فیصلہ کرو..... کہو کیا کہتے ہو، میں اپنا فیصلہ بدل لوں گی۔ تم اپنا ارادہ بدل لو..... نہ میں مرتی ہوں نہ تم فیقہ سے نکاح کر کے مرو..... ہم..... ہم سول میرج کر لیتے ہیں شام! تم ہمت پکڑو، اماں کو میں منالوں گی اور اماں، بابا کو منالیں گی۔ تم ساتھ تو دو..... پھر دیکھنا، کچھ بھی مشکل نہیں ہوگا۔'' اس کی آنکھوں میں آخری آس کا دیا جل رہا تھا۔

''آپا اور صوفی بھیا مان جائیں گے؟'' شام بے خود سا بولا تھا۔ پھر جھٹکا کھا کر رہ گیا۔

''خوابوں سے نکل کر آؤ عمامہ.....'' اس نے پلٹ کر دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ پیچھے کوئی پورے جلال سے کھڑا تھا۔

☆☆☆

اس کے پیچھے فیقہ کھڑی تھی۔ کسی بپھرے طوفان کی طرح..... اور اس کے پیچھے دادی..... خونخوار نظروں سے عمامہ کو دیکھتی ہوئی۔ جیسے لمحوں میں کچا چبا جائیں گی۔ ان کی نظروں میں ایسا تاثر تھا جسے دیکھ کر شام اپنی نظر میں کٹ کر رہ گیا تھا۔ فوری طور پر اسے صفائی کے لیے کوئی ''وجہ'' نہیں ملی تھی۔ پھر اچانک اس کی نگاہ پھڑ پھڑاتے منال پر پڑ گئی تھی۔

''میں منال کو دیکھنے آیا تھا۔ عمامہ نے بلوایا تھا جانے منال کو کیا ہوا..... بار، بار پھڑ پھڑا رہا ہے۔'' شام بولتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ پھر اس نے منال کو اٹھا لیا تھا۔ منال کو بیچ میں کوئی تکلیف تھی۔ وہ بار، بار کراہتا اور تکلیف سے پھڑ پھڑاتا تھا۔ شام نے غور کیا تو اسے منال کی ٹانگ پر زخم نظر آیا۔ منال کو شاید کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔ اس نے عمامہ کی طرف دیکھا، وہ بھی گھبرا کر منال کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ اس کی ساری حسیات دادی اور پھپھو کی طرف متوجہ تھیں۔ اس کی خواہش تھی دادی اور فیقہ ہنگامہ کھڑا کریں۔ اسے ماریں، پیٹیں کم از کم کچھ ایسا غیر معمولی ضرور ہو جو اس شادی کو رکوا دے۔ وہ شادی جس کی آج مہندی کی رسم بھی ہونا تھی۔ گھر میں مہمان بھی اکٹھے ہو رہے تھے..... اور دادی اتنی کم عقل نہیں تھیں جو بازی کو خود ہاتھ مار کر الٹا دیتیں۔ انہوں نے عمامہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا پھر شام کا بازو پکڑ کر اندر چلی گئی تھیں۔ عمامہ انہیں جاتا دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے کراہتے منال کو اٹھا کر چوما اور پھر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ منال وہیں گھاس پر لوٹنیاں لینے لگا تھا۔

وہ اندر آئی تو بھابیاں بچوں کو تیار کر رہی تھیں..... محلے کی بہت سی لڑکیاں بن سنور کر آ چکی تھیں..... گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔

وہ دھیرے، دھیرے چلتی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی..... پھر اس نے دائیں بائیں دیکھ کر فون سیٹ کو اٹھایا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں فون سیٹ اور تار پکڑ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ پھر دروازہ بند کر کے اس نے ایک نمبر ڈائل کیا تھا کچھ دیر بعد کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ عمامہ نے دھک، دھک کرتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''آپ فرخ علیم بات کر رہے ہیں؟'' اس نے محتاط انداز میں ''ہیلو'' کے جواب میں سوال کیا تھا۔ دوسری

طرف سے جواب ہاں میں آیا۔ اس نے ریسیور دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر بالآخر کہہ دیا۔ ''آپ کو ایک بری خبر دینا تھی۔ صوفی صاحب کی بیٹی عمامہ حادثاتی موت کا شکار ہو گئی ہے۔ آپ کل بارات مت لائیے گا۔'' اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔ پھر سامنے دیکھا تو آنکھیں پھٹ گئیں۔

☆☆☆

اس کا ذہن لمحے بھر کے لیے بند سا ہو گیا تھا۔

یہ ایسا شاک تھا جس سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی ہر سوچ قطعی طور پر بندی ہو رہی تھی۔ سیاہ تارکول ایک دھند میں لپٹی تھی۔ کہر نما غبار نے ہر منظر کو دھندلا دیا تھا۔ دھند کے نقطے کہیں، کہیں دبی، دبی بکھر جاتے تھے۔ بہت دیر بعد اسے محسوس ہوا تھا، سیاہ تارکول کسی دھند میں لپٹی نہیں تھی۔ باہر کہر کا غبار کہیں نہیں تھا۔ یہ اس کی آنکھ میں اترے آنسو تھے جو ہر چیز کو دھندلا رہے تھے۔ وہ بے آواز روتی رہی، اس کے گال نمکین پانیوں سے بھیگتے رہے......

گاڑی کے ٹائر سڑک پر پھسلتے رہے، یہاں تک کہ سامنے سفید ماربل سے بنی چمکتی دمکتی دودھیا عمارت کا انتہائی عظیم الشان گیٹ نظر آ گیا۔ گاڑی کے ٹائر لمحہ بھر کے لیے رک گئے تھے۔ عمائم کی سوچوں کو بھی بریک لگ گئے۔ وہ غائب دماغی سے سامنے دیکھتی رہی۔ دودھ کی سفید عمارت، انتہائی خوب صورت، بلند، عظیم اس کے خوابوں کی تعبیر...... اس کا جنون، اس کا عشق، اس کی دیوانگی کیا اس کے خراب ہاتھوں سے پھسلنے والے تھے؟ وہ بھیگی پلکوں سے دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی...... روتی رہی۔

وہ پنجابے کے اندر کا چبوترا تھا۔ جس کے قدمچے پر پاؤں رکھ کر اس نے آخری بلندی پر پہنچنا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا؟ پایا اس کے پیر تلے سے اچانک کھسک گیا، وہ لڑکھڑا گئی تھی۔

جانے کتنا وقت گزر گیا۔ ڈرائیور نے گردن موڑ کر حیرت سے پیچھے دیکھا۔ عمائم گاڑی کی پشت سے ٹیک لگائے بے آواز رو رہی تھی۔ ادھیڑ عمر ڈرائیور متفکر ہو گیا۔

''عمائم بی بی! اتریں گی نہیں......؟'' وہ جامعہ کی عمارت کو دیکھ کر حیرت سے کہہ رہا تھا۔ آج عمائم کا رویہ بڑا عجیب تھا۔ وہ خاموش تھی اور رو رہی تھی۔ جانے کیا ہوا تھا؟ وہ گاڑی سے اتر بھی نہیں رہی تھی۔ اور عمائم سوچ رہی تھی۔ وہ کیا بہانہ کر کے ڈرائیور سے واپسی کا کہے؟ کتنی شرمناک حقیقت تھی۔ عمائم جیسی لائق فائق، ذمے دار، قابل طالبہ کو بغیر کسی ٹھوس غلطی کے جامعہ سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کا دل بھر، بھر آیا۔ اور ابھی تو گھر بھی جانا تھا۔ سب کا سامنا بھی کرنا تھا۔ اور انہیں جامعہ سے نکالے جانے کی کوئی ''وجہ'' بھی بتانا تھی۔ پھر ماما اور ماہم کے طنز برداشت کرنے تھے۔ اور تائی امی کی دل گرفتگی کو بھی سہنا تھا۔ وہ کس قدر شرمسار ہوتی...... اور تائی امی، بابا صاحب کے سامنے کس طرح ندامت کا ''بار'' اٹھاتیں۔ کیا عمائم بھول گئی تھی کس طرح تائی امی نے اسے جامعہ جانے کی بابا صاحب سے اجازت لے کر دی تھی۔ ایک پل صراط کا سفر طے کیا تھا۔

عمائم کی آنکھوں میں ریت بھرنے لگی۔

''اس سے کہہ دینا، غلطی کی کوئی گنجائش نہیں......'' عمائم کو بابا صاحب کے الفاظ یاد آئے تھے اس کی آنکھیں بھر، بھر بہتی رہیں۔ ادھیڑ عمر ڈرائیور سخت پریشان ہو گیا تھا۔

''عمائم بی بی! طبیعت خراب ہے تو واپس چلیں......'' ڈرائیور نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ عمائم نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی واپس موڑ لی تھی۔ جامعہ کی عمارت لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی گئی۔ اس کا خواب، اس کا جنون اس کی دیوانگی ریت کے مانند ہاتھوں سے پھسل گئی۔ اپنے دکھ میں مبتلا اسے خبر نہیں ہو سکی تھی کہ دو آنکھیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔

وہ سہمے، سہمے قدم اٹھاتی گھر پہنچی تو ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ عائشہ کے سسرالی عزیز آئے تھے۔ ماما بڑی پُرجوش دکھائی دے رہی تھیں۔ بیٹیوں کے سسرالیوں کے سامنے وہ ایسی ہی خوش اخلاق نظر آتی تھیں۔ عائم نے محتاط انداز میں لاؤنج کا دروازہ کھولا تھا اور چھپ چھپا کر گیلری کی طرف بڑھنے لگی۔ اندھیرے میں ڈوبی ٹھنڈی گیلری کی صفائی چل رہی تھی۔ شموں پوچا لگا رہی تھی۔ عائم کو دیکھ کر چونکی۔

''آپ آ بھی گئیں.....'' اس نے سادگی سے پوچھا تھا۔ عائم کو پھر بھی طنز ہی لگا۔ اس نے جواب دیے بغیر آگے جانا چاہا تھا۔ جب حریم دروازہ کھولے باہر نکل آئی۔ کالی بلی نے رستہ کاٹ ہی لیا تھا۔ ابھی کچھ دیر میں پورے گھر میں خبر نشر ہو جاتی۔ اب بھی وہ خاصی حیران ہوئی تھی۔

''تم واپس آ گئیں عائم.....؟'' حریم کی آنکھوں میں حیرت تھی، عائم نے چڑ کر کہا۔

''کیا دکھائی نہیں دے رہا۔'' وہ بھاری آواز میں بولی تھی۔ حریم نے آنکھیں پھاڑ کر کہا تھا۔

''دکھائی تو دے رہا ہے، آج میں نے بھی چھٹی کی..... گھر میں مہمان آنے تھے۔'' اب وہ مزے سے بتا رہی تھی، گھر میں کوئی بھی مہمان آتا، حریم کی چھٹی تو لازمی بنتی تھی۔ وہ تو مہمانوں کے آنے کی دعائیں کرتی تھی۔ اور اس کی دعائیں اکثر قبول ہوتی رہتی تھیں۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں.....'' عائم نے جیسے جان چھڑوائی تھی اور کمرا بند کر کے بیٹھ گئی۔ حالانکہ یہ کوئی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ وہ بزدلی کا عظیم مظاہرہ کر رہی تھی..... کم از کم ایک مرتبہ نورس سے ملتی تو سہی..... کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے خطرے ٹلتے نہیں۔

''اتنی معمولی بات پر جامعہ سے نکال دیا۔ آخر نورس مجھے وضاحت کا موقع تو دیتی۔'' وہ شام تک روتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ تائی امی کو بھی خبر ہو گئی۔ وہ تو اس کی خیریت معلوم کرنے آئی تھیں۔ تب عائم کچھ بتا نہیں سکی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ تائی امی کو اپنے نکالے جانے کا بتا سکتی۔ پھر کھانے کے بعد تائی امی دوبارہ آ گئیں۔ ان کے انداز ٹٹولنے والے تھے۔ عائم اندر ہی اندر خائف ہو گئی۔

''تم جامعہ نہیں گئیں کیا.....؟'' انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ عائم سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' ان کے اگلے سوال نے اسے دھک سے کر دیا تھا۔

''اندر ہی اندر گھلتی رہا کرو.....'' وہ بے چینی سے بولی تھیں۔ پھر اس کا لرزتا کانپتا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہنے لگیں۔

''کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں.....؟'' ان کا انداز خود کلامی سا تھا۔ عائم کا سر کچھ اور جھک گیا۔

''میرا کوئی قصور نہیں تھا امی.....'' وہ بھرائی آواز میں بولی تھی۔ اس کے ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے۔ وہ سخت پریشان تھی۔ بھلا کس طرح اپنے نکالے جانے کا بتا دیتی؟ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔

''قصور نہ بھی ہو تو سزا مل جاتی ہے۔ بابا صاحب تمہارے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں، انہیں کیا بتاؤں گی؟ آخر کیوں جامعہ سے نکالا گیا؟'' تائی امی کی آواز میں پریشانی تھی، عائم کا سر کچھ اور جھک گیا۔ جھکتے، جھکتے ٹھوڑی سے لگ گیا..... تو تائی امی کو خبر ہو گئی تھی۔ اس نے ایسے ہی سر اٹھا کر دیکھا تھا، کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ دروازے کے سامنے پردہ لگا تھا جو ہل رہا تھا۔ نیچے دو پیر نظر آ رہے تھے۔ ناخنوں پہ کیوٹکس لگی تھی۔ گورے، گورے خوب صورت پیر..... عائم سمجھ گئی۔ کالی بلی کن سوئیاں لے چکی تھی۔

اب بھلا کیا ہو گا؟ وہ سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

''نورس سے میں خود بات کر لوں گی۔ اتنی معمولی بات پر کیسے نکال سکتی ہے۔'' تائی امی نے جیسے تسلی دینی

چاہی تھی۔ تب عمائم خالی، خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس کے اندر بہت سا خالی پن اتر آیا تھا۔

''جب وہ ڈاکومنٹس بھجوائے گی تو سڑک آف کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ بھی لکھے گی۔ وہ ''وجہ'' کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ کم از کم پیکٹ چوری ہونا نہیں..... مجھے خوف ہے وہ کچھ غلط نہ لکھ دے۔ جس سے میری پچھلی ڈگریز بھی منسوخ ہو جائیں۔'' عمائم نے جھکے سر کے ساتھ آہستگی سے کہا تھا..... پردے کے نیچے دو پاؤں اچانک غائب ہو گئے تھے۔ عمائم کی تسلی ہوئی۔ وہ ان کی کھسر پھسر سن نہیں سکی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں، وہ کیا کرتی ہے..... تم پریشان مت ہو.....'' تائی امی نے نرمی سے اسے دلاسا دیا۔

''میرے گھر پر رہنے سے سب لوگ باخبر ہو جائیں گے۔'' اس نے بھیگی آواز میں کہا..... اس صدمے نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ کسی کی کاٹ دار نگاہ کو سہہ نہیں سکتی تھی۔

''میں بتا دوں گی..... عائشہ کی شادی کے لیے تم چھٹیوں پر ہو.....'' انہوں نے اس کے رخسار اپنے دوپٹے سے صاف کر دیے۔

''اب فکر مت کرو..... اور عائشہ کی شادی کے دن قریب ہیں، میں نے تمہارے کپڑے بنوا دیے ہیں۔ میرے کمرے میں رکھے ہیں، تم دیکھ لینا۔ خود سے تو دلچسپی نہیں لیتیں تم..... پرسوں مایوں کا فنکشن ہے۔ خود کو فریش رکھو..... ماہم وغیرہ کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ عمائم کو تسلی دے کر اٹھ گئی تھیں۔ انہیں کچن میں بہت سا کام تھا۔ پھر جاتے ساتھ انہوں نے عمائم کے لیے کھانا بھجوایا۔ اس کو ذرا بھی بھوک نہیں تھی..... پھر بھی زہر مار کر لیا۔ جب وہ خالی برتن اٹھا رہی تھی تب کھٹکے پر چونک گئی۔

سامنے ماہم کھڑی تھی۔ وہ حیران رہ گئی۔ اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ ماہم نے اس کے کمرے کو رونق بخشی تھی۔ عمائم کیوں نہ حیران ہوتی۔ اس کے کمرے میں آنا ان ماں بیٹیوں کی توہین کے سوا کچھ نہ تھا۔

عمائم اپنی اوقات اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ وہ ماہم، عائشہ اور حریم کے برابر کبھی کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ ماہم اسے گم صم دیکھ کر اندر چلی آئی۔ اب اک طائرانہ نظر کمرے پر ڈال رہی تھی۔ کمرے کی سجاوٹ دیدہ زیب تھی۔ تاہم ماہم بڑی حقارت سے دیکھتی رہی۔

''کیسے آنا ہوا؟'' عمائم کو پہل کرنا پڑی تھی۔ وہ خاصی خائف نظر آ رہی تھی۔ ماہم نے ترچھی نظر سے اسے دیکھا تھا۔ عجیب کاٹتی سی نظر تھی۔ وہ سن سی ہو گئی۔

''افسوس کرنا تو بنتا ہے، افسوس کرنے آئی ہوں۔'' ماہم نے ویسے ہی عجیب انداز میں کہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر سُن رہ گئی تھی تو گویا سب کو اطلاع مل گئی۔ کالی بلی کن سوئیاں لے چکی تھی پھر کیسے ہلکے پیٹ میں بات رکھ لیتی..... اسے حریم پر بے طرح تاؤ آیا تھا۔

''ویسے کیوں نکالی گئی ہو؟ وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔'' ماہم نے اندر ہی اندر حظ اٹھاتے ہوئے پوچھا تھا۔ عمائم کا دل چاہا اس کا منہ ہی نوچ لے یا پھر کوئی ٹیپ وغیرہ اس کے ہونٹوں پر چپکا دے۔

''کوئی معمولی بات تو نہیں ہو سکتی۔ تم جیسی پوزیشن ہولڈر کو معمولی بات پر نکالنا ہضم نہیں ہو رہا۔'' ماہم مسلسل گل افشانی کرتی رہی تھی۔ عمائم نے سوچا، وہ اسے جواب ہی نہیں دے گی۔ مگر اس کی اگلی بات نے عمائم کو اندر تک لرزا دیا تھا۔ وہ ہق دق کھڑی رہ گئی تھی۔

''کسی لڑکے کا چکر تو نہیں.....'' اس کا انداز بلا کا معنی خیز اور دوستانہ ہو گیا تھا۔ عمائم کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئی تھیں۔

''بات تو یہی لگتی ہے۔ مجھے اپنا دوست ہی سمجھو..... اپنا دکھ یا پرابلم مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ یقین مانو، میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔'' ماہم نے کچھ اور ہمدردی جتلائی تھی۔ ''کسی لڑکے کا کیس لگتا ہے۔ کیا اس سے محبت کرتی ہو.....

نورس نے پکڑ لیا ہوگا..... تمہارا جامعہ عام مدرسوں سے الگ ہے۔ وہاں سخت سیکورٹی اور کیمرے وغیرہ جو لگے ہیں۔ نورس کو رپورٹ مل گئی ہوگی۔ ویسے کتنی شرمندگی کی بات ہے۔ جامعہ کا لحاظ تو کرنا چاہیے تھا۔ ایسے کام..... یونیورسٹیوں میں سنے تھے۔'' ماہم مسلسل ٹسک پاٹی کرتی رہی تھی۔ اس کی زبان فراٹے بھرتی رہی۔ یہاں تک کہ عائم کو چیخنا پڑا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس شدت سے چلائی تھی۔ اسے اپنی ہی بازگشت اجنبی سی لگی۔ جبکہ ماہم کی چلتی زبان کو بریک لگ گئے تھے۔

''جسٹ شٹ اپ ماہم..... اپنی زبان بند رکھو..... ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔'' عائم کے اندر نہ جانے کہاں سے اتنا بارود بھر گیا تھا۔ وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ اسے جارحانہ انداز میں چیختے دیکھ کر ماہم کی بتی گم ہوگئی تھی۔ اسے تائی امی سے بھی خطرہ لاحق ہوا تھا۔ اگر انہیں خبر ہو جاتی.....؟ وہ اندر ہی اندر خائف ہونے لگی تھی۔

''اپنی گندی زبان سے بکواس کی تو کاٹ کے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ تم کون ہوتی ہو میرے کریکٹر پر انگلی اٹھانے والی۔ اب ایسی بکواس کی تو تایا ابا کو بتا دوں گی۔ میں جو ہوں، جیسی ہوں سب کو پتا ہے میرا۔'' وہ چیخ رہی تھی۔ سرخ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ ماہم خائف سی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''تمہیں برا لگا.....'' میں تو ہمدردی میں آ گئی۔ سوچا، تمہاری مدد کروں گی۔'' ماہم ہونٹ بھینچ کر بولی تھی۔

''بہت شکریہ تمہارا..... مجھے کسی کی مدد نہیں چاہیے۔'' غصیلی نگاہ سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ آنکھوں سے گرم سیال بہہ رہا تھا۔ حالانکہ وہ ماہم کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

''تمہارے منہ نہیں لگنا چاہیے..... خود ہی بھگتو..... نہ جانے کیا چکر چلا ہے، جامعہ سے نکالی گئی ہو..... ابھی تو گھر کی خواتین تک بات محدود ہے۔ مردوں کو پتا چلا تو دیکھنا پھر..... کیا حشر ہوتا ہے تمہارا۔'' وہ اسے دھمکا کر تن فن کرتی باہر نکل گئی تھی۔

عائم دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ آخر اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ یہ کس گناہ کی سزا تھی؟ وہ کسی کو بھی مطمئن کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ اگر گھر کے مردوں اور بزرگوں تک خبر پہنچتی اسے پیشی بھگتنا پڑتی۔ سب کو وضاحت دینا پڑتی۔ پھر یہ بھی عین ممکن تھا کہ کوئی اس کی بات کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ آخر نورس ایک ادارے کی سربراہ تھی، اس کا پلڑا بھاری تھا۔ عائم کی دلیل کمزور تھی۔ اسے رونا ہی آتا گیا۔ وہ تھک ہار کر رونے لگی تھی۔ اس شغل میں نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ وہ چونکی تو تب جب موبائل کی میسج ٹیون بجی تھی۔ اس نے بھیگی آنکھوں سے موبائل اسکرین کو دیکھا تھا۔ پھر اٹھا کر پڑھنے لگی۔

''پریشان ہونا مسئلے کا حل نہیں..... رونا تو بالکل نہیں.....'' اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ میسج طویل تھا۔ وہ پھر پڑھنے لگی..... ناک کو خوب رگڑ، رگڑ کر صاف کیا..... پلکیں ہاتھوں سے مسلیں۔

''تمہارا ایک مین پرابلم ہے، مصیبت سے پہلے ہاتھ پیر چھوڑ دیتی ہو..... ذرا بھی مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں۔ یہ مسئلہ چٹکیوں میں حل ہوگا۔ تم دیکھتی رہو بس..... اب رونا نہیں..... پریشان تو بالکل نہ ہونا۔'' عائم اختتام تک بالکل بے دم ہوگئی تھی۔ یہ کون تھا؟ ہر وقت تسلی دیتا، سائے کی طرح پیچھا کرتا۔ اس کے معمولات پر نظر رکھتا، اس کو خبردار کرتا، وقت سے پہلے خطروں سے آگاہ کرتا؟ آخر یہ چھپا ہوا ہمدرد کون تھا؟

☆☆☆

اور پھر وہی ہوا جس کا خوف اسے لاحق تھا۔ ماہم نے مرچ مسالا لگا کر اپنے والدِ محترم کو پوری رپورٹ دی تھی۔ جس کے نتیجے میں عائم کی فوراً طلبی ہوگئی تھی۔ اسے ماہم سے ہر قسم کی امید تھی۔ پھر بھی اسے لگتا تھا وہ گھر کے

جب وہ ہال کی طرف آئی تو پہلا ٹاکرا ماہم سے ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں سخت چبھن تھی۔ عنائم اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھی تو ماہم کی دھیمی آواز سنائی دی تھی۔

"میں اپنی انسلٹ کا بدلہ ضرور لیتی ہوں۔" وہ کاٹ دار لہجے میں کہہ رہی تھی۔ عنائم کے دل میں پھانس سی چبھی تھی۔ کیا تھا اگر پاپا تک بات نہ پہنچتی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔ لاؤنج سے ہال تک کا سفر بڑا پر اذیت تھا۔ پھر بھی وہ چلتی رہی تھی۔ ہال میں پاپا، تایا ابا اور بڑے ابا بھی تھے۔ عنائم کی جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے پاپا کی آنکھوں میں شدید غصہ اور ناگواری دیکھی تھی۔ وہ عنائم کو سخت نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ جانے ان کی بیٹی نے کس انداز میں انہیں بھڑکایا تھا۔ عنائم کو چکر سے آنے لگے تھے۔

"جامعہ نہیں جا رہی ہو تم؟ خیریت ہے کیا؟" بڑے ابا نے بڑے ہی رسان سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ عنائم کی آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ پھر اس کی نگاہ تائی امی کی نگاہ میں اٹکی۔ وہ اسے کچھ اشارہ کر رہی تھیں۔ عنائم کچھ سمجھی اور کچھ سر سے اوپر بات گزر گئی تھی۔ اس کی خاموشی پر پاپا کڑے تیوروں سے گویا ہوئے۔

"جامعہ سے فارغ کر دی گئی ہے۔ نکالا گیا ہے اسے؟ پوچھیں، کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟ بات بڑی نکلی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر دبی آواز میں غرائے تھے۔ عنائم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ پاپا کا غصہ اور جلال بڑا مشہور تھا۔ عنائم کی جان نکلنے لگی تھی۔ ایک مرتبہ پھر گیلی آنکھوں سے تائی امی کو دیکھا تھا۔ وہ پھر اسے اشارے سے کچھ سمجھا رہی تھیں۔ عنائم کو ذرا بھر سمجھ نہیں آئی تھی۔ پھر اس نے بڑے ابا کی حلیم آواز سنی تھی۔ وہ پاپا سے مخاطب تھے۔

"غصہ مت کرو، آرام سے بات کرو...... ہم پوچھ تو رہے ہیں، بات بڑی نہیں ہو گی۔" ان کی آواز میں نرمی کے ساتھ یقین تھا۔ ایسا یقین جو تائی امی نے اپنے شوہر کے اندر عنائم کے لیے بھر دیا تھا۔ وہ اس یقین سے ایک انچ نہیں ہٹ سکتے تھے۔

"اس سے بڑی ذلت کیا ہو گی؟ پوچھیں اس سے نکالی گئی ہے۔" پاپا آگ بگولا تھے۔ لگتا تھا بیوی اور بیٹی نے خوب بھڑکا رکھا تھا۔ عنائم نے پھر سے مدد طلب نظروں سے تائی امی کو دیکھا تھا۔ انہوں نے پھر اسے اشارہ کیا تھا...... اب کہ عنائم کے پلے کچھ بات پڑ گئی تھی۔

"بولتی کیوں نہیں اب......" ماما نے زہر بھرے لہجے میں کہا تھا۔ جیسے اس کی خاموشی پر غیظ چڑھ رہا تھا۔

"جواب ہو گا تو بولے گی۔" پاپا نے تنفر سے اسے دیکھا تھا۔ عنائم کے دل میں شدید درد سا اٹھا۔ آنکھیں پھر سے بھیگنے لگی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے ہمتیں مجتمع کر کے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"میں چھٹی پر ہوں...... عائشہ کی شادی کے لیے چھٹی اپلائی کی تھی۔" اس نے بہ مشکل جھکے سر کے ساتھ جواب دیا تھا...... اس کی نم آواز اور بھیگے لہجے میں بولتے یقین نے بڑے ابا اور تایا ابا کو چونکا دیا تھا۔ چونک تو پاپا بھی گئے تھے۔ کم از کم اس جواب کی توقع جو نہیں تھی۔ بڑے ابا اور تایا ابا جیسے مطمئن ہو گئے تھے۔ پاپا بھی چپ سے کر گئے تھے پھر انہوں نے گھور کر زوجہ محترمہ کو گھورا تھا۔ وہ بھی جز بز سی ہو گئی تھیں۔ یہ جواب سب کی توقع کے برخلاف تھا۔ ماہم تک اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔ تائی امی کے چہرے پر سکون بکھر گیا تھا۔ جیسے ان کی جان میں جان آئی تھی۔ عنائم کی جان بخشی ہو گئی تھی۔ فی الوقت سر پر لٹکی تلوار ہٹ گئی تھی مگر یہ کوئی پائیدار حل نہیں تھا۔ عائشہ کی شادی کے بعد پھر سے سوالات اٹھ سکتے تھے۔ عنائم کے پاس مزید کوئی بہانہ نہیں تھا۔ عائشہ کی شادی کے بعد ہر بہانہ اپنی موت آپ ہی مر جاتا۔ اور تب تک اسے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ یہ مہلت ملنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا سکتی تھی۔

اپنے کمرے سے موبائل اٹھا کر وہ اوپر چھت پر چلی آئی تھی۔ اس وقت ہوا چل رہی تھی۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ وہ کونے سے کرسی اٹھا کر منڈیر کے قریب آ گئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے نورین کو کال کی تھی۔ اس کی توقع

کے عین مطابق نورس نے اس کی کال پک نہیں کی۔ عائم بار بار کوشش کرتی رہی تھی۔ پھر اس نے نورس کو میسج سینڈ کیا۔ اپنی غلطی تسلیم کی اور معافی مانگی۔ نورس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسے عائم پر غصہ ہی بہت تھا۔ وہ کافی دیر لڑائی کرتی رہی تھی۔ پھر تنگ آ کر برابر والے گھر کی طرف دیکھنے لگی۔ ریلنگ کے اس پار کوئی تھا؟ عائم کو شک سا گزرا تھا پھر اس نے سر جھٹک کر نورس کو ایک اور میسج لکھا۔ کچھ دیر بعد نورس کی کال آ گئی تھی۔ اس نے عائم کی معذرت قبول نہیں کی تھی بلکہ اس کا انداز بھی بڑا غصیلا اور ہتک آمیز تھا۔

''مجھے ہر صورت وہ پیکٹ چاہیے عائم! ورنہ تم جانتی نہیں..... میں کس طرح تمہارے ساتھ پیش آؤں گی۔''

اس نے عائم کی ایک بات بھی سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ عائم جیسے دھک سے رہ گئی تھی۔ یعنی اس کی خلاصی ہونے والی نہیں تھی۔ اسے ہر صورت پیکٹ تلاش کرنا تھا۔ اور پیکٹ بھلا کہاں تھا؟ کون اٹھا کر لے گیا؟ وہ تھک ہار کر وہیں گر گئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ عائم نے چونک کر دیکھا تھا۔ آنے والے نے چھپنے کی بہت کوشش کی تھی پھر بھی عائم نے دیکھ ہی لیا۔

''شاباش آ جاؤ سامنے چھپنے کی ضرورت نہیں.....'' عائم نے نرمی سے پچکارا تو حریم جھینپی، جھینپی سامنے آ گئی تھی۔

''میں تمہاری باتیں نہیں سن رہی تھی۔ یقین کرو..... مجھے شام بھائی نے بلایا تھا۔'' حریم نے فوراً وضاحت دی تھی۔ مبادا عائم ناراض نہ ہو جائے۔

''اچھا..... شام بھائی کا گھر تو برابر والا ہے۔'' اس نے طنزیہ کہا تھا۔ حریم نے فوراً وضاحت کی۔

''میں نیچے سے نہیں، ہمیشہ اوپر سے جاتی ہوں۔'' وہ مسکرا، مسکرا کر بولی تھی۔ عائم گہری نظر سے اسے دیکھنے لگی۔

''اپنے گھر کی باتیں دوسروں کو نہیں بتاتے حریم!'' اس نے اچانک حریم کو گھبرا دیا تھا۔ وہ لمحوں میں گھبرا گئی تھی۔ کیوٹکس لگے ہاتھوں کو چٹخانے لگی تھی۔

''میں نہیں بتاتی..... شام بھائی کو کچھ نہیں بتاتی.....'' حریم فوراً گڑبڑائی تھی۔ عائم اسے گہری نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔

حریم بری طرح پھنس گئی۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بھاگے کیسے؟

''شام کو نہیں، ماہم کو تو بتاتی ہو ناں.....؟'' عائم نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا تھا۔ حریم حواس باختہ ہو گئی۔

''نہیں، نہیں، میں نے کچھ نہیں بتایا۔ تمہاری اور تائی امی کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ تم دونوں کھسر پھسر جو کر رہے تھے۔'' حریم کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی تھی۔ عائم سنجیدگی سے اسے دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی۔

''پھر ماہم کو کس نے بتایا۔'' عائم نے اسے آج گھیر ہی لیا تھا۔ بڑے کڑے تیوروں سے تفتیش کر رہی تھی۔ حریم کی جان پر بن آئی۔ وہ آئیں بائیں کرنے لگی تھی۔ عائم نے اسے پھر سے جھڑکا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں منمنا کر رو گئی۔

''میں نے کچھ نہیں بتایا۔ ماہم، احتشام بھائی کے پاس کھڑی تھی۔ انہوں نے کچھ بتایا ہوگا۔'' حریم رونے والی ہو گئی۔

''اور احتشام کو الہام ہوا تھا کیا؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کیا پتا..... ؟'' حریم نے گردن پر انگلی رکھ لی۔ جیسے سانس رواں کرنا چاہ رہی تھی۔ ''تم شام بھائی سے پوچھ لو.....'' اس نے اپنی جان چھڑوانے کے لیے کہا تھا۔ پھر عائم کا اشارہ پا کر بھاگ گئی۔ عائم کچھ دیر وہیں کھڑی سوچتی رہی تھی۔ پھر چلتے ہوئے اس گرل اور بالکونی میں آ گئی جو دونوں گھروں کی چھتوں کو جوڑتی تھی۔ وہیں ان ڈور کے قریب کرسی پر احتشام بیٹھا تھا۔ بظاہر اخبار پڑھ رہا تھا۔ تاہم عائم کو صاف لگ رہا تھا وہ حریم اور اس کی ایک، ایک بات سے فیض یاب ہو چکا تھا۔ عائم اسے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ جب الٹے قدموں پلٹنے لگی تو دوپٹا گملے کے

اسٹینڈ سے الجھ گیا تھا۔ وہ دھڑام سے نیچے گر پڑی۔ کہنی اور گھٹنا زبردست چھلا تھا۔ کہنی سے تو خون بھی نکلنے لگا تھا۔ وہ بہ مشکل اٹھی تو چونک گئی۔ احتشام کرسی سے اٹھ کر بالکونی کی طرف آ گیا تھا۔ اب دونوں کہنیاں ریلنگ پر ٹکا کر چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں سجا کر بہت غور سے عائم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جو تکلیف کی شدت سے رونے لگی تھی احتشام کو دیکھ کر گم سم رہ گئی۔ آنکھ کے آنسو بھی منجمد ہو گئے تھے پھر وہ بہ مشکل گھٹنے کی ٹیس دباتی اٹھی تھی۔

''ہر دفعہ گرنے کے بعد اٹھنا محال ہوتا ہے۔'' اس کے کانوں سے احتشام کی سنجیدہ آواز ٹکرائی تھی۔ وہ اب بھی کہنیاں ریلنگ پر ٹکائے ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ سجائے کھڑا تھا۔ عائم کو سرد نگاہوں سے گھورتا ہوا، برف نظروں سے دیکھتا ہوا، وہ خوفزدہ رہ گئی تھی۔

''حریم کو ہراساں مت کرو..... وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتی۔ جو بتاتی ہے، عادتاً بتاتی ہے۔'' اسے احتشام کی پھر آواز سنائی دی تھی۔ کاش زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتی۔ اس سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا تو گویا وہ سب کچھ سن چکا تھا۔ عائم کچھ دیر کے لیے سوچتی رہی تھی۔ پھر اس نے غور کیا۔ وہ کیوں احتشام سے ڈر رہی تھی۔ کیوں شرمندہ ہو رہی تھی؟ اس سوچ نے اسے ڈھارس پہنچائی تھی۔ وہ تھوڑی نڈر ہو گی۔ اب وہ احتشام کے سامنے تن کر کھڑی تھی۔ کہنی اور گھٹنے کی تکلیف بھلا کر۔

''میں حریم کو ہراساں کیوں کروں گی؟ اس الزام کا مقصد پوچھ سکتی ہوں۔'' عائم نے غصے سے پوچھا تھا۔ وہ اس کے رویے کی تبدیلی پر حیران ہوا تھا یا نہیں..... تاہم اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

''الزام جو لگ چکا ہے۔ اس کی تو وضاحت کر دو.....'' اس نے معنی خیزی سے سرد آواز میں کہا تھا۔ عائم اس کا اشارہ سمجھ کر اندر تک کٹ گئی تھی۔ مارے اہانت کے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''وہ میرا ذاتی مسئلہ ہے، تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا میرے ذاتی معاملات میں گھسنے کا۔'' عائم سخت بدلحاظی سے بولی تھی۔ احتشام گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا..... کچھ سوچتا رہا۔ عائم اس کی نگاہوں سے خائف ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ وہ یہاں سے کھسک جاتی ہے۔ مگر پھر مجبور ہو گئی۔ گھٹنے کا درد آگے بڑھنے نہیں دے رہا تھا۔ اور وہ کم از کم احتشام کے سامنے لنگڑا کر چلنا نہیں چاہتی تھی۔

احتشام اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات بغور دیکھ رہا تھا۔

''کام سے غلطی، غلطی سے تجربہ، تجربے سے عقل، عقل سے خیال اور خیال سے نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔'' کچھ دیر بعد اسے احتشام کی ٹھوس آواز سنائی دی تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی۔ آخر اس کی بات کا کیا مطلب تھا؟

''بے شک بہت دیر تک سوچو لیکن سوچنے کے بعد تمہارا ارادہ اٹل ہونا چاہیے۔'' وہ اب دور بہت دور کسی غیر مرئی نکتے پر غور کر رہا تھا۔ عائم نے الجھی نگاہ سے اسے دیکھا تھا پھر تنک کر بولی۔

''مطلب.....؟'' اس کا انداز خاصا توہین آمیز تھا۔ احتشام آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر منجمد کر دینے والے لہجے میں چبا، چبا کر بولا۔

''اذان کے نام پر فیور لینے کا مطلب سمجھتی ہو؟'' وہ ایک دم غرایا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک معروف آفس کا منظر تھا۔ ایک شاندار اور جدید دفتر..... وسیع و عریض ہال نما اس دفتر میں تین گلاس ٹیبلز تھیں۔ خوب صورت، آرام دہ ریوالونگ چیئرز تھیں..... ایک طرف فولادی الماری تھی۔ جس میں بے شمار جدید لاک لگے تھے۔ یہ لاک کمپیوٹرائزڈ تھے۔ اور مخصوص بٹنوں کے دبانے سے کھلتے تھے۔ فولادی الماری میں ہر آفیسر اور ٹارگٹ کا ریکارڈ محفوظ تھا۔ ایک طرف مضبوط لکڑی کی دیوار گیر شیلف تھی۔ جس میں سیکڑوں کیسز تھے۔ ہر کیبن

کے اندر ایک جدید کمپیوٹر رکھا تھا۔ اس وقت کئی کمپیوٹر آن تھے۔ اور بغیر کسی انسانی وجود کے اپنا کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آفیسر کنٹرول کر رہا تھا۔ وہ ان کمپیوٹرز سے اپنی مرضی کا کام لے رہا تھا۔

یہ ایک سراغ رساں ادارے کا صدر دفتر تھا۔ ٹیکنالوجی کے دھماکے کے ساتھ اس شعبے نے بھی بہت ترقی کی۔ جدید آلات اور مشینوں سے گھنٹوں کے کام منٹوں میں ہونے لگے تھے۔ جیسے فوٹو اتارنے والے مصنوعی سیارے اور دور کے علاقوں تک رسائی کے لیے الیکٹرانک نظام کے ذریعے سنسر کرنے والے آلات اور مواصلات سے درمیان میں سے پکڑنے والے اسٹیشن۔

کچھ دیر بعد چمکتی آنکھوں والا ایک آفیسر اندر آیا۔ اس نے سامنے موجود لیپ ٹاپ پر بڑی آفیسر کو سیلوٹ کیا تھا۔ پھر ایک فلیش چمکتی ٹیبل پر کھسکا دی۔ جو لمحوں میں لیپ ٹاپ سے ٹکرائی۔ آفیسر کی آنکھوں میں تیزی چمک اتر آئی۔ اس نے دو انگلیوں میں فلیش کو اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دیا۔

''گڈ..... تم نے کر دکھایا۔'' وہ اسی طرح مسکراتا رہا۔

''نیکسٹ.....؟'' آنے والے نے تابعداری سے سوال کیا۔ وہ مزید ٹاسک کی تفصیلات چاہتا تھا۔

''ڈیٹا تمہیں فارورڈ کر دوں گا۔'' اس نے فلیش کو لیپ ٹاپ میں لگایا۔ کچھ ہی دیر میں لوڈنگ شروع ہوئی۔ پھر کلک کے ساتھ کچھ روشن ہوا۔ آفیسر کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔ اسکرین کے چوکھٹے میں ایک چہرہ جگمگا رہا تھا۔ آفیسر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ پھر سیکورٹی کی تہوں میں فائل سیف کی اور آفیسر کی طرف متوجہ ہوا۔

''کنٹرول آفس سے کوئی نئی ہدایت.....؟'' اس کی سرد آنکھوں میں سوال تھا۔ آنے والے نے ایک چرمی والٹ سے چمکتی سلپ نکال کر ٹیبل پر کھسکا دی تھی۔ سرد آنکھوں والا آفیسر کچھ دیر سلپ کو دیکھتا رہا۔ ایک خاص پنسل سے لکھے الفاظ تھے۔ ایسی خاص پنسل اس کی جیب میں بھی لگی تھی۔ بظاہر دیکھنے میں عام سی تھی لیکن خاص کاغذ پر ایسا بھی لکھتی جو نظر نہیں آتا تھا۔

اس نے سلپ پر لکھی ہدایت پڑھ لی تھی۔ اب وہ غور سے آنے والے کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھا رہا تھا۔

''کیٹیگری نمبر فور۔ ڈی یعنی مشکوک بچ۔'' اس نے آنکھوں کی زبان سے مقابل کو سمجھا دیا۔ ''عمومی ناقابلِ اعتبار خبر۔'' اب وہ پیپر ویٹ گھما رہا تھا۔ ''اور کسی مشکوک بچ پر ایکشن لینا ہمارا اصول نہیں۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔ آفیسر اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں ایک، ایک بات فیڈ کر رہا تھا۔

''یعنی ہمارا موٹو ہے..... دھوکے اور فریب سے ہمیں ہر ''جنگ جیتنی ہے۔'' اس نے آنکھوں کی تیز لپک سے آنے والے کو بریفنگ دی تھی۔

''تم کیس آفیسر ہو..... کڑی نگاہ رکھو..... رپورٹ کرتے رہو..... اینڈ گڈ بائے۔'' اس نے لیپ ٹاپ پر نگاہ جما دی تھی۔ چمکتی آنکھوں والا آفیسر سر ہلا کر سمجھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے آواز آئی۔

''روشان.....! تم ایک ہفتے کے ریسٹ پر ہو۔'' سمجھ گیا اور سر ہلا باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ''ریڈ الرٹ'' کال آئی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ سے نگاہ ہٹا کر فون کان سے لگایا۔

''یس سر! اوکے سر، گڈ بائے سر۔'' فون ہاتھ سے رکھ کر وہ الرٹ ہو گیا تھا۔ بڑی تیز فہم نگاہ سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر کچھ ضروری سامان اٹھا کر باہر نکل آیا..... اب وہ جیپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک غیر معروف علاقے کی طرف گیا۔ یہ ایک چھوٹی کالونی تھی۔ وہ مین بلڈنگ میں جانے سے پہلے ہال میں آیا۔ وہاں ایک کسرتی جسم کا چاق و چوبند جوان کھڑا تھا۔ اس نے مسکرا کر آنے والے کے نام کا اندراج ایک فائل میں کیا۔ اس کی تصاویر بنائیں۔ ہاتھوں، پیروں کے نشان محفوظ کیے پھر ایک طرح دار لڑکی کے ہمراہ مین بلڈنگ کی طرف بھیج دیا۔ یہاں پر

بھی اس کے ہاتھوں اور پیروں کے نشانات میں کمپیوٹر کو فیڈ کیے گئے تھے۔

پھر وہ کنٹرول آفس تک چلا گیا۔ یہاں دیواروں پر حساس آلے نصب تھے۔ وائٹ بورڈ پر نقشہ جات چسپاں تھے۔ ملک کے حساس علاقوں کی تصاویر نصب تھیں۔ کچھ دیر بعد چیف ڈائریکٹر تشریف لے آئے۔

''ینگ مین...... خوش آمدید۔'' انہوں نے مسکرا کر ویلکم کہا۔ پھر دو ٹوک کام کی بات پر آ گئے۔

''ایک کہانی سنو، خاصی دلچسپ ہے۔'' انہوں نے تیز نگاہ سے اسے الرٹ کیا۔ یہ مخصوص کوڈ تھا۔ اس کی تمام حسیات میں بجلیاں بھر گئیں۔

''ایک بوڑھی عورت ہوا کرتی تھی۔ خاصی امیر اور خدا ترس عورت تھی۔ اس کا ایک مکان تھا۔ خاصا نادر و نایاب تھا۔ بیچ میں کچھ حالات بگڑے۔ بوڑھی عورت کسی حادثے کا شکار ہو گئی۔ مکان پر کسی نے قبضہ کر لیا۔ قابض بہت رسوخ والا تھا۔ کوئی اس سے سوال جواب کر ہی نہ سکا۔ بوڑھی عورت کے اصل حق دار منہ دیکھتے رہ گئے۔ مدد کے لیے کسی کو پکار ہی نہیں سکے۔ اس مکان کو قبضے سے چھڑوانا ہے۔'' انہوں نے پیپر ویٹ گھما کر اتنے عام لہجے میں کہا تھا جیسے یہ کام بہت ہی معمولی تھا۔

''کیسی لگی؟'' اب وہ مسکرا کے پوچھ رہے تھے۔

''انٹرسٹنگ ـــــ'' اس نے سر ہلا کر مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ بھی مسکرا دیے تھے۔ پھر کچھ سوچتے رہے۔

''ایک اور کہانی سنو ـــــ'' ان کا انداز پُراسرار قسم کا تھا۔ وہ الرٹ ہو گیا ـــــ ٹاسک وہ دے چکے تھے۔ اب بریفنگ کی باری تھی۔ اس کا ایک، ایک عضو کان بن گیا تھا۔

''سیٹ لائٹ ہائی وے پر ایک خوب صورت بلڈنگ ہے، سمجھ لو، خوب صورت فلیٹس ہیں...... فلیٹ نمبر سیون، سیون میں ایک بوڑھی عورت کی رہائش ہے۔ خاصی اکھڑ، تیز اور چالاک عورت ہے۔ اس کی بالکونی میں دو منٹ

رکنا ہے۔ وہاں ایک گلدان ہوگا۔ مصنوعی پھولوں سے بھرا..... وہاں سے ایک پھول توڑ لانا۔ ٹاسک مکمل....." انہوں نے عقابی نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ وہ سر ہلا گیا۔

"یعنی پھر بوڑھی عورت، کوئی جوان نہیں۔" وہ پہلی مرتبہ مسکرایا تھا، بریفنگ مکمل ہو چکی تھی۔ اب وہ مسکرا سکتا تھا۔

"تمہاری قسمت ہی یہی ہے۔" انہوں نے بے نیازی سے کہا تھا۔ پھر کندھے اچکا دیے۔ وہ اس اسٹائل پر مسکرا دیا۔

"میری قسمت ایسی خراب نہیں..... یہ میری ماں کا فرمان ہے....." وہ اشارہ پا کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ چیف نے ایک سبز لکڑی کا ڈبا اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"یاد رہے، عورت بہت چالاک ہے۔" ان کے لہجے میں واضح تنبیہ تھی۔

"مجھ سے زیادہ نہیں....." وہ بہت اعتماد سے کھڑا ہوا۔ جیسے اس ٹاسک کو چٹکیوں سے مسل دے گا۔

"اس کور اسٹوری کے بیک گراؤنڈ میں بلیک شیٹ ہے۔ سمجھ گئے؟" انہوں نے نظروں کا زاویہ بدل کر کہا۔ اس نے اس انداز میں سر ہلایا تھا جیسے سب سمجھ گیا تھا۔

"ٹارگٹ آسان نہیں....." وہ اسے محتاط کر رہے تھے۔

"جانتا ہوں....." اس نے لکڑی کا باکس پھرتی سے اٹھا لیا۔ "اور میں شک کی بنا پر ایکٹ نہیں کرتا۔" اس نے اپنے اصول واضح کیے۔

"ہوں....." انہوں نے ہنکارا بھرا۔ "مجھے دو دن میں رپورٹ چاہیے۔" وہ اسے باور کروا رہے تھے۔

"میں چوبیس گھنٹوں میں رپورٹ کر دوں گا۔" اس کا اعتماد قابل دید تھا۔ وہ اسے سراہتی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ ہمیشہ مشکل ٹاسک کے لیے چنا گیا تھا۔ وہ خطرات کی طرف دھکیلا جاتا تھا۔ خطروں سے اسے عشق تھا۔

"تم ایک غیر جذباتی انسان ہو بلکہ انسان کم مشین ہو۔" انہوں نے اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا ان کو سیلوٹ کرنے کے بعد باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی لکڑی کا باکس موجود تھا۔

☆☆☆

وہ اس توہین کے لیے قطعی طور پر تیار نہیں تھی۔ تبھی اگلے دو دن تک بھی اسی احساس میں جلتی رہی۔

کتنے کٹھور اور ہتک آمیز انداز میں اس نے عمائم کو جتایا تھا۔ جیسے اذان کے عہدے کی فیور لے کر اس سے بڑا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ وہ ابھی اسی نکتے پر غور کر رہی تھی۔ اس نے سوچا ہی نہیں کہ اذان تو قطعاً فیور والی بات سے ناواقف تھا پھر احتشام کو کس نے بتایا؟

پھر یوں ہوا کہ اسے مزید کڑھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ عائشہ کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ چونکہ ماما کی بیٹی کے فنکشنز تھے سو دھوم دھڑکا لازم سی بات تھی۔ بابا صاحب نے بھی روکا نہیں، ویسے بھی وہ عمر کے اس حصے میں تھے جب انسان اپنا تخت و تاج آل اولاد کے حوالے کر کے ہر اچھائی برائی سے بری ہو جاتا ہے۔ گھر کی بیٹی کا فنکشن تھا۔ سبھی کا جوش و خروش دیکھنے کے لائق تھا۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، لڑکے بھی سب بہت ایکسائٹڈ تھے۔ حتیٰ کہ اذان، احتشام بھی اپنی بے پناہ مصروفیت کو ایک طرف رکھ کر فنکشن کے لیے ٹائم نکال رہے تھے۔

عمائم نے ایک چیز بہت شدت سے نوٹ کی تھی۔ دادی، پھپھو اور امو دونوں نے کسی فنکشن کو اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح منظر سے غائب تھیں۔ وہ کسی بھی خوشی، غمی میں شریک نہیں ہوتی تھیں۔ گویا یہ بات ازل سے طے تھی۔ کوئی بھی سوال یا نکتے نہیں اٹھاتا تھا۔

عائشہ کی شادی میں اس نے عالی کو بھی بلایا تھا۔ اس نے مہندی والے روز شرکت کی تھی۔ مایوں پر آ نہیں سکی۔

"ماما نے پھپھو کی طرف جانا تھا۔ ان کی بہو کے والد بیمار تھے۔ میں نے کہا، کل چلیں گے، آج نہ آتی تو میری

خبر کہاں تھی۔" عالی اس کے کان میں گھسی احسان جتا رہی تھی۔

"نہ آ کے بھی دیکھ لیتیں تم......" عائم نے گھور کر کہا۔ وہ بھی جتا رہی تھی۔ "خبردار، کل کا فنکشن بھی مس کیا۔" اس نے دھونس بھرے لہجے میں کہا تھا۔ عالی آئیں بائیں کرنے لگی تھی۔

"کل کے لیے معذرت یار....." اس نے کان کھجائے۔ عائم نے اسے پھر سے گھورا تھا۔

"میں تمہاری ناک توڑ دوں گی۔ اور تمہاری شادی کے کسی فنکشن میں نہیں آؤں گی۔" اس نے خوب دھمکایا تھا۔ عالی "ہے، ہے" کرتی رہ گئی تھی۔

"یہ تمہاری شادی کے فنکشن نہیں...... جس پر میں نہ آئی تو تم بدلے چکاؤ گی۔" اس نے گھور کر عائم کو دیکھا تھا۔ عائم گردن موڑ کر مسکرا دی تھی۔ تبھی دائیں جانب اسے احتشام کھڑا دکھائی دیا تھا۔ وہ جز بز سی ہو گئی۔ "ایک تو یہ بندہ بھی ناں......" اس نے سر جھٹک کر سوچا..... اس آخری "بے عزتی" کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ حالانکہ وہ عائم کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ پھر بھی اسے لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اسی کو گھور رہا ہے۔ گو کہ یہ عائم کی خام خیالی تھی۔

کچھ دیر بعد عالی چیخ پڑی۔ عائم کو بھی اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس کا انداز ہی دہلانے والا تھا۔

"یہ...... یہ یہاں......!" اس کی زبان میں لکنت آ گئی تھی۔ عالی پر جیسے شادیٔ مرگ طاری تھی۔ وہ جیسے دم بخود رہ گئی۔ حتیٰ کہ منہ بھی کھل گیا۔

"احتشام ہے، کوئی اپالو نہیں..... ایسے مر رہی ہو۔" عائم نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور بازو میں چٹکی بھر کے ڈپٹ کر بولی۔ وہ بری طرح بھنائی تھی۔

"اپالو سے کم بھی نہیں......" عالی خواب آگیں لہجے میں بولی۔ عائم نے جیسے ماتھا پیٹ لیا تھا۔ پھر تائی امی کی آواز پر اسٹیج تک چلی گئی۔ وہ اسے رسم کے لیے بلا رہی تھیں۔ عائم کو بادلِ ناخواستہ اٹھنا پڑا تھا۔ حالانکہ ہاشم کی موجودگی میں وہ اسٹیج پر جانا نہیں چاہتی تھیں۔ پھر اسٹیج پر ایمان بھی نظر آیا تھا۔ ہنستا مسکراتا، عائم کے قدم ہلکے پڑنے لگے تھے۔ جب وہ اسٹیج پر آ کر مہندی لگانے لگی تب ایمان قریب آ گیا تھا۔ اس کے حسین، دلفریب مہکتے روپ کو دیکھ کر مسکرایا۔

"عاشی! اس کے سر پر بھی چپیٹر (تھپڑ) مارو، میں نے سنا ہے، یہ عمل بہت جلدی شادی خانہ آبادی کے لیے نسخۂ اکسیر ہے۔" وہ عائم کو دیکھ کر چہکا تھا۔ عائشہ نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اٹھا کے اسے تھپڑ دے مارا۔ عائم اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ درد کی شدت سے کراہ اٹھی۔ اس کا لال انگارہ ماتھا دیکھ کر ایمان چیخ پڑا۔

"اتنی زور کی چپیٹر؟ کس جنم کا بدلہ لیا ہے ظالم....." وہ دہائی دے رہا تھا۔ عائم اس عزت افزائی پر رو دینے والی تھی تاہم ینگ پارٹی نے ہنس، ہنس کر طوفان اٹھا لیا۔ اب ہر لڑکا بھاگ، بھاگ کر عائشہ کے پاس چپیٹر کھانے جا رہا تھا۔ عائم کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے تھے۔ وہ جان بچا کر اسٹیج سے نیچے آ گئی۔ ایمان بھی اس کے پیچھے تھا۔

"رکو تو...... زور کی لگی کیا......؟" وہ تیزی سے اس کے سامنے آ گیا تھا۔ عائم نے بھنا کر اسے دیکھا۔ پھر جل کر بولی۔

"تم تو مجھ سے کلام ہی نہیں کرو......" اسے ایمان پر شدید غصہ تھا۔ آخر اسی کے بوگس مشورے پر عائشہ نے بہت زور کی چپیڑ ماری تھی۔ ایمان ذرا سنبھل گیا۔

"سوری عائم......" اس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔ "آج تو غصہ نہ کرو...... کیا قیامت لگ رہی ہو، ہر روز ایسی دکھائی دو تو کیا کہنے......" وہ اس کے حسین روپ کو آنکھوں میں بسا کر بولا۔ عائم نے خونخوار نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔

"میں نے چوتھی کی دعوتیں اٹینڈ نہیں کرنی۔ جو ہر روز ولیمے کی دلہن بنی پھروں......" وہ جیسے دبی آواز میں غرائی تھی۔ ایمان نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی پھر ذرا دلربائی سے بولا۔

"تم موقع تو دو...... ایک "ہاں" تو کرو...... میں آج ہی ولیمہ کر لیتا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں جگنو سے

چمکنے لگے تھے۔ عمائم کو جی بھر کر تاؤ آیا تھا۔

"جاؤ، اپنا رستہ ناپو۔" وہ بھنائی۔ "میری جان چھوڑو۔"

"جان تو چھوٹتے ہی بنے گی۔ ورنہ میرا حال بگاڑ دو گی۔" ایمان نے ہونٹ لٹکا لیے۔ "کیسی کٹھور ہو، میرے جذبوں کی پروا نہیں۔" وہ اداس نظر آنے لگا تھا۔ عمائم کو تو پورا ایکٹر لگا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ کر گئی تھی۔ سچ تو یہ تھا۔ اس نے ایمان کے "جذبوں" کو کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ناممکن کو چھوڑ دیتی تھی۔ نسبتاً آسان ہدف اپناتی..... اسے مشکل چیلنجز سے خوف آتا تھا۔

"چڑیا گھونسلے سے گرا بچہ نہیں اٹھا سکتی۔ کیسی ناممکن سی بات کرتے ہو..... ماؤنٹ ایورسٹ جیسی۔" اس نے ایک جملے میں ایمان کو بہت کچھ "جتا" دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ سا رہ گیا تھا۔

"اگر تم وہی دیکھتی ہو جسے روشنی ظاہر کرتی ہے۔ اور وہی سنتی ہو، جس کا اعلان آواز کرتی ہے۔ تو درحقیقت نہ تم دیکھتی ہو نہ سنتی ہو۔" ایمان نے بھی آواز میں کہا تھا۔ اور خاموش نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ سبز دوپٹے کے ہالے میں جگمگاتا چاند..... ہر جھوٹ ہر فریب سے بہت دور، ایک ٹھوس حقیقت کی طرح روشنیاں بکھیرتا سراپا۔ وہ کسی بھی مرد کا پہلا خواب، پہلی ترجیح، پہلا آئیڈیل ہو سکتی تھی۔ وہ کسی بھی شخص کی زیست کا حاصل ہو سکتی تھی۔

"کچھ ے راستوں کو خرگوش سے زیادہ سمجھتے ہیں۔" اس کے پاس بہت دلائل تھے۔ بس سننے والے میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ جوتے کی نوک سے گھاس کھرچنے لگا۔ یہ اس کے اضطراب کی طرف اشارہ تھا۔

"میرا ارادہ تمہیں پریشان کرنا نہیں....." عمائم نے ذرا نرمی سے کہا تھا۔ "تم فنکشن انجوائے کرو، میری باتیں بے معنی ہیں۔"

"سنا تھا جب روح میں اتر جائے تو رونقیں متاثر نہیں کرتیں۔" وہ جوتے کی نوک سے گھاس کھرچتا رہا۔

وہ مضطرب تھا۔ یہ اضطراب لمحوں میں ختم ہونے والا نہیں تھا۔

"زندگی ہر شخص کو عزیز ہوتی ہے مگر بہادر انسان کو عزت، زندگی سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔" وہ اسے "جتا" رہی تھی کچھ سمجھا رہی تھی۔ وہ بہت کچھ سمجھتا بھی تھا۔ پھر بھی انجان بن جاتا۔ یہ مقام بے بسی تھا۔ ایمان نے ایسے ہی گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا تحیر ابھرا تھا۔ عمائم نے بھی اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تھا۔ وہ بھی متحیر رہ گئی تھی۔

"اس..... اپنی سہیلی کو تو سنبھالو..... یہ تو شام کو لے اڑی۔" ایمان کے تبصرے پر عمائم بھی لان کے اس تنہا گوشے کو دیکھنے لگی تھی جہاں عالی اور احتشام کھڑے تھے اور احتشام کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ یہ مقام حیرت تھا۔

☆☆☆

فنکشن اپنے جوبن پر تھا۔ چونکہ پہلے نکاح ہو چکا تھا سو لڑکے والے بھی "رسم" کرنے پہنچ گئے تھے۔ اسلام میں ان خود ساختہ رسموں کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر بھی لوگ سمجھتے نہیں تھے۔ ہندوانہ رسموں کی تقلید کرتے۔ مہندی تیل، گانا بجانا، عمائم کی طبیعت اوب گئی تھی۔ وہ اک الگ گوشے میں رکھی ٹیبل تک پہنچ گئی۔ اب وہ یہاں سے سب پر نظر رکھ سکتی تھی۔ مگر کسی کی نگاہ میں آ نہیں سکتی تھی۔

مہمانوں سے بھرا لان، لہراتے آنچل، خوشبو اور رنگ و بو کا سیلاب، ماڈرن، طرح دار، چنچل سی لڑکیاں، ساڑیاں لہراتی آنٹیاں، بھاگتے دوڑتے بچے..... ان میں تتلی کی طرح اڑتی پھرتی ماہم..... کچھ فاصلے پر ڈھولک بجاتی حریم..... تالیاں پیٹتی مریم اور حرم..... اس سارے بھرپور منظر میں پھر بھی ایک خالی پن ضرور تھا۔ اس کے دل میں چٹکیاں بھرتا ایک احساس..... وہ دانستہ نگاہ کو موڑ کر اس خالی گوشے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ جہاں عالی اور احتشام کھڑے تھے۔ دنیا جہاں سے غافل ایک دوسرے میں گم..... کیا یہ پہلی ملاقات کی بے تکلفی تھی؟ عمائم کا رواں، رواں

سلگ رہا تھا۔ یہ جلن، یہ سلگتا سا احساس کیوں تھا؟ وہ سمجھ نہیں پائی۔ پھر بھی اسے عالی کا احتشام سے ہنسنا بولنا بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ جو عید کے عید بھی مسکراتا نہیں تھا۔ عالی کے لیے فیاض بنا کھڑا تھا۔ بات بے بات ہنستا ہوا۔ عائم کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ کڑھن کے مارے برا حال تھا۔ پھر اس نے اپنی توجہ دانستہ بسمہ کی طرف موڑی۔ وہ جیا ای کے ساتھ بیٹھی تھی۔ عام دنوں سے ہٹ کر بہت دلفریب اور جگمگاتے روپ میں...... گوری چٹی بہت نفیس اور انتہائی سوز و گداز کا پیکر...... وہ یک ٹک بسمہ کو دیکھتی رہی۔ نہ جانے اس پیاری سی لڑکی کو کیا دکھ تھا؟ کیسا ملال تھا؟ کس کرب سے گزرتی تھی۔ بتیس سال میں بھی پچیس کی لگتی۔ عائم کی نگاہ کے گرم تاثر نے بسمہ کو چونکا دیا تھا۔ وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر اٹھ کر عائم کے قریب آ گئی۔ عائم بھی قدرے گڑبڑا گئی تھی۔ پھر خیر مقدمی مسکراہٹ سجا کر بولی۔

''آج آپ بہت منفرد لگ رہی ہیں بسمہ چاچی......'' اس کے تعریفی انداز نے بسمہ کو جھینپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تھوڑا شرما گئی تھی۔

''تم بھی بہت خوب صورت لگ رہی ہو، کبھی اتنا اہتمام نہیں کیا ناں......'' بسمہ نے جواباً تعریف لوٹا دی تھی۔ عائم احتجاجاً دبی آواز میں چیخی۔

''میں نے اپنی تعریف کے لیے تعریف نہیں کی۔'' وہ خفا ہوئی تھی۔

''میری تو خواہش نہیں تھی۔ بڑی بھابی نے مجبور کیا۔'' بسمہ نے قدرے بجھے انداز میں بتایا تھا۔ جیسے اسے اپنی تیاری سے الجھن ہو رہی تھی۔

''تو اچھا کیا ناں...... کاش ہمارے چاچو یہاں ہوتے۔'' عائم نے شوخی سے ایک غیر مناسب حوالہ چھیڑ دیا تھا۔ بسمہ کا چہرہ یک لخت سپید پڑ گیا۔ وہ اضطراری انداز میں ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ عائم کے اندر کچھ غلط ہونے کی گھنٹی سی بجی تھی۔ اسے اپنے الفاظ واپس لینے مشکل ہو گئے۔

''ان کا آنا ممکن نہیں......'' بسمہ کی آنکھ سے ضبط کے باوجود ایک ستارہ ٹوٹ گیا تھا۔ عائم سخت شرمندہ ہوئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا موضوع کیسے بدلے۔ اندر ہی اندر پھڑ پھڑاتے ''کیوں؟'' کا گلا گھونٹ کر وہ غیر ارادتاً عالی اور احتشام کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ عالی نے آج سر پر دوپٹا نہیں لے رکھا تھا۔ اس کے کٹے ہوئے بال چہرے کے اطراف میں بکھر رہے تھے۔ جامعہ میں وہ سر پر دوپٹا رکھتی تھی۔ تب عائم دیکھ نہیں سکی تھی۔ عالی بہت ماڈرن تھی۔ عائم کو آج پتا چلا۔ اس نے جینز پر ستاروں والی ٹاپ پہن رکھی تھی۔ گلے میں ہلکا سا اسکارف لیا تھا۔ اونچی ہیل کی سینڈل میں بہت شاندار لگ رہی تھی۔ عائم کے اندر پھر سے وہی احساس بیدار ہو گیا...... اب کہ بسمہ نے بھی اس کی نگاہوں کا پیچھا کیا تھا۔ پھر ذرا حیرانی سے بولی۔

''یہ تمہاری دوست ہے ناں......؟'' بسمہ کو اچنبھا سا ہوا۔ عائم نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''تم سے خاصی مختلف ہے۔'' اس نے تبصرہ کیا تھا۔ عائم کیا جواب دیتی۔ وہ تو اب بھی عالی کو دیکھ رہی تھی۔ گھونٹ گھونٹ کولڈ ڈرنک پیتی وہ احتشام سے باتوں میں مگن تھی۔ اسے شاید عائم بھی یاد نہیں تھی۔

''احتشام سے دوستی بھی کر لی؟ حیرت ہے احتشام کسی سے بے تکلف نہیں ہوتا۔'' بسمہ کے لیے یہ ایک حیران کن امر تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔ عائم نے سر جھٹک کر کہا۔

''مجھے کیا......'' اس نے بے خیالی میں جیسے خود کو باور کروایا تھا۔ پھر ذرا چونک گئی۔ ''مطلب ہمیں کیا...... عالی ایسی ہی بے تکلف ہے۔'' عائم کو بات سنبھالنا مشکل ہو گئی تھی۔ بسمہ اسے بغور دیکھتی رہی۔ جیسے کچھ سوچ رہی ہو...... پھر سر جھٹک کر رہ گئی۔

''عالی کچھ عجیب بھی ہے۔'' بسمہ نے پھر سے کہا تھا۔ جانے اسے عالی میں کیا عجیب لگا تھا۔ عائم نے تفصیل

نہیں پوچھی تھی۔ شاید عالی کی بے تکلفی...... کچھ دیر بعد بسمہ وہاں سے اٹھ گئی تھی اور عالی کو بھی عمائم کا خیال آ گیا۔ شاید اس لیے کہ احتشام اب منظر میں کہیں نہیں تھا۔

''تمہارا کزن تو کمال چیز ہے۔ دیکھو تو دیکھتے رہو...... بات کرو تو بس کرتے رہو......'' عالی نے عمائم کو بتایا۔ وہ احتشام کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ اب عمائم کا سر چاٹتی رہی۔

''اللہ...... تمہارے گھر کیسے، کیسے اعلیٰ نمونے ہیں ظالم تبھی تو کہیں دیکھتی نہیں تم......'' عالی نے عامیانہ پن کی انتہا کر دی تھی۔ عمائم کے رخسار سرخ ہو گئے۔

''شرم کرو......'' عمائم نے اسے ڈپٹا۔

''مشکل کام بتا رہی ہو۔'' وہ مسکرائی تھی۔ پھر دوبارہ سے احتشام نامہ سنانے لگی۔ اس کے پاس سنانے کو بہت کچھ تھا۔ باتوں، باتوں میں اس نے عمائم کے چودہ طبق بھی روشن کر دیے تھے۔ عمائم جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اسے عالی کی بات پر یقین ہی نہیں آیا۔

''تم نے کہہ دیا؟'' وہ صدمے سے مرنے کے قریب ہو گئی تھی۔ عالی نے اثبات میں سر ہلایا اور سابقہ جوش و خروش سے بولی۔

''ہاں...... کہہ دیا، تم تو نری بدھو ہو۔ خبر ہی نہیں تمہیں...... احتشام کی اپروچ بہت اوپر تک ہے۔ وہ معاملہ سنبھال لے گا۔ اس نے مجھ سے پرامس کر لیا۔'' عالی نے دبی آواز میں جوشیلے پن سے کہا تھا۔ عمائم کے سر پر ضرب سی لگی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اپنی کسیبلی کو دیکھنے لگی۔

''تم نے کیوں کہا...... احتشام سے کیوں کہا......'' عمائم جیسے رو دینے کو تھی۔ اب کہ عالی کو بھی کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ کر گئی تھی۔ پھر فراٹے سے بولتی رہی۔

''تمہارے لیے...... تمہاری ''عزت'' کے خیال سے، تمہارے وقار کے لیے، وہ نورس کشور تمہیں اسٹرک آف کر رہی ہے۔ بات بڑھ گئی تو معاملہ ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ نورس بہت غصے میں ہے۔ آسانی سے تمہیں نہیں چھوڑے گی۔ تمہاری عزت کا سوال تھا۔'' عالی اسے سمجھانے لگی تھی۔ عمائم کچھ بھی سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں۔

''احتشام آخری آپشن بھی ہوتا تو میں کبھی بھی اس کی فیور نہ لیتی۔ قیامت تک نہیں...... چاہے کچھ بھی ہو جاتا۔ تم نے مجھے دو کوڑی کا کر دیا۔'' عمائم بھل، بھل رونے لگی تھی۔ بے آواز رونا بھی بہت مشکل کام تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب مووی والوں کے کیمروں سے بچنا محال ہو...... وہ دیر تک روتی رہی۔ عالی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

''بہت چپ ہو تم...... ایک تو تمہارا خیال کیا اور تم......'' وہ جیسے دہاڑی تھی۔

''مجھے احتشام سے فیور نہیں چاہیے، تم نہیں جانتی۔ اف، عالی تم نے میرا حشر کروا دیا۔'' اس نے بہ مشکل بھیگے چہرے کو صاف کیا۔ گردن موڑ کر کیمرے والوں سے بچ بچا کر ناک زور، زور سے رگڑی تھی۔

''اوکے...... میں کل بارات کے فنکشن میں آؤں گی۔ احتشام کو منع کر دوں گی، تم بچوں کی طرح رونا تو بند کرو......'' عالی دھیمی آواز میں غرائی تھی۔

''خود ہی مرنا...... خود ہی بھگتنا۔'' اسے غصہ آ رہا تھا۔ اب وہ اسے لتاڑ رہی تھی جبکہ عمائم کا ذہن بس ایک نکتے پر اٹک گیا۔ ''میں کل بارات کے فنکشن میں آؤں گی۔'' وہ بہت دق رہ گئی تھی۔

''تم نے تو کل اپنی ماما کے ساتھ جانا ہے...... پھپھو کی طرف، ان کی بہو کے والد بیمار ہیں...... عیادت نہیں کرنی کیا؟'' عمائم کو اپنا ہی لہجہ اجنبی سا لگا تھا۔ عالی نے جیسے کان سے مکھی اڑائی۔ جبکہ عمائم پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے لیے پروگرام بدل رہی ہوں...... ان کی عیادت پھر سہی...... احتشام کو منع بھی تو کرنا ہے۔'' اس

نے مسکرا کر بے پروائی سے کہا۔

☆☆☆

رات بھیگ رہی تھی۔ فنکشن اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ مہمان گھروں کو چلے گئے تھے۔ نوکروں نے لان کا سامان اٹھانا شروع کر دیا۔ شامیانے ہٹ گئے۔ برقی قمقمے بجھ گئے۔ کرسیاں اٹھالی گئی تھیں...... اسٹیج اب ویران لگ رہا تھا۔ اداس اور ادھورا سا...... پھول جا بجا بکھرے تھے۔ ہاتھوں کے ٹوٹے گجرے، ہار، پتیاں سب بے وقعت پڑی تھیں۔ عائم بھی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ کچھ دیر بعد تائی امی بھی آگئیں...... عائم جھمکے اتار رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر چونکی...... پھر مسکرا کر آہستگی سے بولی۔

''عائشہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔'' اس نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ تائی امی نے پیار سے اسے دیکھا۔

''میری بیٹی زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔'' انہوں نے بے ساختہ اسے چوم لیا تھا۔ پھر مٹھی میں دبائے چند سو روپے اس کے سر پر سے وارے...... وہ اس کا صدقہ اتار رہی تھی۔

''اللہ قسمت اچھی کرے۔'' انہوں نے صدقِ دل سے دعا کی تھی۔ پھر اچانک اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر بولیں۔ ''آنکھیں کیوں سرخ ہیں تمہاری؟'' ان کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

''مسکارا لگایا تھا...... شاید الرجی ہوگئی۔'' وہ آنکھیں دھونے واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ واپس آئی تو تائی امی اس کا سامان سمیٹ چکی تھیں۔ چوڑیاں، کپڑے، سینڈل اور جھمکے...... سب کچھ سمٹا پڑا تھا۔

''اب کچھ بہتر ہے......'' انہوں نے اس کا بھیگا چہرہ اور بھیگی آنکھیں ملاحظہ کیں...... عائم نگاہ چرا گئی تھی۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

''آپ کو عالی کیسی لگی؟'' اس کا انداز سادہ سا تھا۔ وہ تائی امی کی رائے معلوم کرنا چاہتی تھی کیونکہ باقاعدہ طور پر عالی پہلی مرتبہ تائی امی سے ملی تھی۔

''مجھے تو بچی پوچھو، ذرا نہیں بھائی......'' انہوں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ''خاصی بے باک لڑکی ہے۔ دیکھا نہیں تم نے...... سارا وقت احتشام کے ساتھ چپکی رہی۔ اور احتشام کو دیکھو، گھر کی لڑکیوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ ان محترمہ سے ہنس ہنس کر مخاطب تھا۔ جاتے ہوئے گیٹ تک بھی چھوڑ کر آیا۔'' تائی امی کو نہ جانے کس بات پر غصہ تھا۔ عالی کی بے تکلفی پر یا پھر احتشام کے عالی کو پروٹوکول دینے پر...... یا پھر گھر کی لڑکیوں کو نظر انداز کرنے پر؟ عائم سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ جس پر واضح ناگواری تھی۔

''عالی بہت نائس ہے امی...... بس تھوڑی بے تکلف ہے۔'' عائم نے عالی کی حمایت کرنا چاہی تھی۔ جو بے سود رہی۔ تائی امی کے اگلے الفاظ نے اسے اندر تک جھنجوڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔ پھر اتنی جلن سی بھر گئی جیسے سرخ گیلی مرچوں کا گودا اندر گھس گیا ہو...... وہ آنکھوں کو زور زور سے مسلنے لگی۔ جبکہ تائی امی کہہ رہی تھیں۔

''خاک اچھی ہے، پہلی ملاقات میں موبائل کے تبادلے ہو گئے۔'' ان کا انداز بہت روکھا سا تھا۔ جیسے انہیں عالی پر بہت غصہ تھا۔ اس کی بے تکلفی پر غصہ تھا۔ عائم حیران رہ گئی۔

''موبائل کے تبادلے؟'' اس کے ہونٹ بے آواز کھل گئے تھے۔ وہ اتنی حیران تھی کہ حد نہیں...... اس سے کچھ لمحے بولا ہی نہیں گیا تھا۔

''تو اور کیا...... حریم نے خود دیکھا اپنی آنکھوں سے، وہ ماہم کو بتا رہی تھی میں نے بھی سن لیا۔'' تائی امی نے ناگواری سے تفصیل بتائی تھی۔ عائم ہکا بکا رہ گئی۔ اگر حریم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا تو یقیناً ٹھیک دیکھا تھا۔ حریم کی کوئی خبر غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ عائم کے اندر پھانس سی گڑ گئی تھی...... بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ احتشام نے پہلی ملاقات میں

موبائل کا تحفہ دے دیا..... وہ جتنا حیران ہوتی کم تھا۔ عالی میں کون سی ایسی خاص بات تھی جس نے احتشام جیسے پتھر کو پگھلا دیا؟ دھندلی دھند بکھر رہی تھی۔ عائم کو رونا سا آ گیا۔ پھر بھی ضبط سے بیٹھی رہی تھی۔ تائی امی چلی گئیں تو عائم بھی اٹھ کر باہر آ گئی۔ ارادہ تھا حریم سے تفصیل پوچھنے کا..... حرم اور حریم کے کمرے میں جھانکا تو دونوں بے سدھ سوئی تھیں۔ وہ دل مسوس کر باہر آ گئی تھی۔ پھر چلتے، چلتے پچھلے برآمدے میں آ گئی۔ دماغ خالی سا ہو گیا تھا۔ جیسے اس انکشاف نے اندر تک اسے نچوڑ دیا تھا۔ وہ بے دم سی بید کی کرسی پر ڈھے گئی تھی۔ باہر رات کی رانی کا سحر بول رہا تھا۔ تھکے ہارے افراد خانہ سب نیند میں دھت تھے۔ ایک اسی کو چین نہیں تھا۔ جلتی آنکھیں نیند سے بے حال تھیں مگر پھر بھی بستر پر لیٹنا محال تھا۔

وہ برآمدے سے پار دیکھنے لگی۔ گھور اندھیرا بکھر رہا تھا۔ ہر طرف مہیب سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اچانک کھٹکے کی آواز ابھری تھی۔ برابر والے گھر کا منقش دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ عائم گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ وہ احتشام ہی تھا۔ جانے کیوں رات کو بے قدموں اوپر نیچے گھومتا رہتا تھا۔ اسے تھکاوٹ سے نیند بھی نہیں آتی تھی۔ عائم کو بہت کچھ یاد آ گیا۔ عالی اور احتشام کی بے تکلفی، موبائل کے تبادلے اور پھر عالی کا عائم کی ہر بات احتشام کو بتا کر فیور لینا..... اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ پچھلی ہر بات بھلا کر وہ لمحہ بھر کی دیر میں اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلی تھی۔ پھر آگے بڑھتے احتشام کے پیچھے چلنے لگی۔ وہ کاریڈور میں گم ہوتا دائیں طرف مڑا تھا۔ پھر وہ کچن میں گھس گیا۔ اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سن کر بھی انجان بنا رہا..... عائم اس کے پیچھے کچن میں آ گئی تھی۔ وہ چائے بناتا دکھائی دیا تھا۔ جیسے اپنے گھر میں کچن ہی نہیں تھا۔ عائم کو جی بھر کر تاؤ آیا۔ اس نے سلیب سے گلاس اٹھا کر ذرا زور سے پٹخا تھا۔ خاموش ماحول میں گونج سی پیدا ہوئی تھی۔ پھر بھی احتشام نے گردن موڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ عائم کو سخت ہتک محسوس ہوئی۔ پھر بھی وہ بات کیے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے از خود احتشام کو مخاطب کیا تھا۔

''عالی نے جو کہا..... اپنے پاس سے کہا۔'' اس نے بہ مشکل لفظوں کا جوڑ توڑ کیا تھا۔ اتنی سی کوشش میں اس کی پیشانی بھیگ گئی تھی۔ ہتھیلیاں نم ہونے لگیں۔

''میں نے فیور نہیں مانگی۔ نہ تم سے نہ کسی اور سے..... عالی کو میری اجازت کے بغیر کوئی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' اس نے بھیگی ہتھیلیوں کو کھول کر دیکھا۔ وہاں اب بھی بوندیں ابھر رہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا۔ اس کا لہجہ بھی رواں نہیں تھا۔ وہ کچھ بے ربط ہو رہی تھی۔

''اس نے مجھے موضوعِ گفتگو بنا کر تعلقات استوار کرنا چاہے ہیں جو کہ سخت نازیبا حرکت ہے۔'' عائم کچھ اور بھی بولتی مگر احتشام نے یک لخت اپنا رخ بدل لیا تھا۔ اب وہ بالکل عائم کے سامنے تھا۔ سرد برفیلی نگاہوں سے دیکھتا ہوا۔ آنکھوں میں شدید غصہ اور ناگواری تھی۔ عائم کچھ خائف سی ہو گئی۔ وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ پھر دھیمی آواز میں غرا کر بولا۔

''اس بکواس کا مقصد؟'' اس نے گرم نگاہوں کی سلاخیں عائم کی آنکھوں میں گھسا دی تھیں۔ عائم سے سانس لینا محال ہو گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''ہم..... میں نے تم سے فیور نہیں مانگی.....'' اس نے بہ مشکل رک، رک کر کہا۔

''پھر.....؟'' اس نے بگڑتے تیوروں سے آگ برساتے لہجے میں پوچھا۔ وہ کسی گلیشیئر کی طرح اس کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ عائم کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

''وہ عالی نے.....'' عائم کا سر جھک گیا۔ وہ یقین کر چکی تھی۔ کم از کم احتشام کے سامنے بولنے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ اسے عالی پر رشک سا آیا تھا جو اتنے گھنٹے احتشام سے باتیں کرتی رہی۔ اور پھر موبائل کے تبادلے.....

''تمہیں میری فیور کی ضرورت نہیں..... بات ختم..... آئندہ کچھ بولتے ہوئے ہزار مرتبہ سوچنا.....'' وہ غیظ

بھرے لہجے میں بولا۔ ’’اور میرے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے کسی بھی فرد کو کم از کم تمہارے ’’حوالے‘‘ کی ضرورت نہیں......‘‘ احتشام اسے بھگو، بھگو کر جوتے مارتا رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پانی، پانی ہو گئی۔ جی چاہ رہا تھا۔ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ لیکن کچھ خواہشات ہمیشہ ادھوری ہی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی طے تھا کہ احتشام کے سامنے اس نے ہمیشہ شرمندہ ہی ہونا تھا۔ وہ ضبط سے کھڑی تھی۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا۔ دھاڑیں مار، مار کر وہیں کھڑے رونا شروع کر دے۔ اس کے تاثرات بھی کچھ ایسے تھے۔ احتشام نے پیچھے ہاتھ کر کے بغیر مڑے بونر بند کیا تھا۔ پھر عائم کی طرف متوجہ ہوا۔

’’رونے کے لیے اپنا کمرا بہترین ٹھکانا ہے۔ لان میں بیٹھ کر رونا، انتہائی معیوب حرکت ہے۔ وہ بھی کسی کی شادی کے فنکشن میں...... تمہیں شاید مرکزِ نگاہ بننے کا شوق ہے۔‘‘ احتشام نے گہرے کاٹ دار لہجے میں جتایا پھر کچن سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ کر شرمندگی کے گرداب میں پھنس گئی تھی۔ ’’اس نے بھی مجھے روتا دیکھ لیا؟‘‘

☆☆☆

اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ بارات کے فنکشن میں نہیں جائے گی۔ اس میں احتشام اور عالی کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ پھر اسے سو فیصد یقین تھا کہ عالی ضرور آئے گی۔ اس کا بس چلتا تو وہ یہاں سے جاتی ہی نہیں...... اس گھر سے عالی کو کچھ ایسی ہی انسیت ہو گئی تھی۔ عائم رات بھر جاگتی رہی اور سوچتی رہی تھی۔ اوپر سے احتشام کی باتوں نے رات بھر جلائے رکھا تھا۔ وہ شرمندگی سے کٹ رہی تھی۔

صبح بھی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔ کیونکہ وہ سوئی ہی فجر کے بعد تھی۔ دوپہر کے قریب وہ پھر سو گئی۔ عصر کے وقت آنکھ کھلی تو فریش ہو کر نماز ادا کی..... اندر کہیں سکون سا اتر آیا تھا۔ مگر یہ لمحاتی کیفیات تھیں۔ رات کا منظر پھر سے تر و تازہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ کچھ دیر بعد موبائل کی بیپ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ ایسے ہی سسکتے ہوئے موبائل دیکھنے لگی۔ اسی رانگ نمبر کا میسج تھا۔ عائم بھیگی آنکھوں سے پڑھنے لگی۔

’’روتی کیوں ہو؟ رونا مسئلے کا حل نہیں......‘‘ جیسے دو آنکھوں نے فوراً اس کا تعاقب کر لیا تھا۔ عائم پگھل سی گئی۔

’’اداس ہو......؟‘‘ پھر سے میسج چلا آیا۔ عائم بہت زود رنج تھی۔ کسی اپنے کی متلاشی تھی۔ جس سے کہہ سن کر بوجھ ہلکا کر لیتی۔ تبھی اس نے ’’ہاں‘‘ ریپلائی میں لکھ دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں جواب آ گیا تھا۔

’’دل دکھانے والوں کو سزا مل جائے گی۔ تم پریشان مت ہو۔‘‘ نرم سے لفظوں کی پھوار سی۔ عائم کے دل کو ڈھارس سی پہنچی تھی۔

’’میرا دل کسی نے نہیں دکھایا۔‘‘ اس نے فوراً جواب لکھ دیا تھا۔

’’تو پھر روتی کیوں ہو؟‘‘ میسج اسکرین پر چمکنے لگا۔

’’تمہیں کس نے کہا؟‘‘ اس نے پھر سے ٹائپ کیا۔ جواب تڑنت آیا تھا۔

’’میرے دل نے......‘‘ اسکرین پھر سے چمکدار ہوئی تھی۔ عائم کی ہتھیلیوں میں پسینہ آ گیا۔

’’تمہارا دل غلط اطلاع دیتا ہے۔‘‘ اس نے جلدی سے ٹائپ کیا تھا۔ جواب کچھ توقف سے آیا تھا۔

’’ہرگز نہیں...... میرا دل مجھے ٹھیک اطلاع دیتا ہے۔‘‘ وہ بحث کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ عائم کو کچھ خیال گزرا۔ آخر وہ کیوں کسی اجنبی سے بات کر رہی تھی؟ جانے یہ کون تھا؟ عائم کو ندامت سی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا، اب ریپلائی نہیں کرے گی...... کچھ دیر بعد اس کا ٹیکسٹ چمکنے لگا۔

’’کیوں پریشان ہو...... مجھ پر بھروسا کرو...... میں تمہاری فکر کو تقسیم کر لوں گا آدھی تمہاری آدھی میری۔‘‘ اس کے جواب نے عائم کو پھر کشمکش و پیچ میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ کیا کرے، کیا جواب دے یا نہ دے۔ وہ عجیب مصیبت میں

گرفتار تھی۔ دل پر بوجھ سا لد گیا تھا۔ وہ جو کر رہی تھی ٹھیک نہیں تھا۔ اور جو ہو رہا تھا وہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اسے خبر تھی، جو کام غلط ہے وہ کبھی درست نہیں ہو سکتا۔ نہ لوگ اسے درست سمجھتے ہیں نہ سوسائٹی نہ اپنا ضمیر..... اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔

''آج کا فنکشن کیسا رہا؟'' میسج نے ایک مرتبہ پھر اسے چونکا دیا تھا۔ عائم نے اب حیران ہونا ترک کر دیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کے بارے میں پوری معلومات رکھتا تھا۔ اس کی معلومات کبھی غلط نہیں ہوتی تھیں۔

''میں نے تمہارا ایک الگ سا روپ دیکھا۔ سی گرین سوٹ جیسے بنا ہی تمہارے لیے تھا۔'' اگلے میسج نے عائم کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔ وہ اسی طرح عائم کو چونکاتا تھا۔ وہ اسی طرح عائم کو ٹھٹکاتا تھا۔ عائم جیسے ششدر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے کانپتی انگلیوں سے ایک میسج ٹائپ کیا۔

''کیا تم بھی فنکشن میں موجود تھے؟'' اس نے بڑے خوفزدہ انداز میں پوچھا تھا۔ پھر پورے فنکشن کو ذہن میں ریورس کیا۔ کوئی ایک بھی مشتبہ بندہ پردۂ اسکرین پر دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ سوچ، سوچ کے تھکنے لگی تھی۔

''نہیں تو.....'' جواب فوراً آیا۔ عائم کو پھر سے لکھنا پڑا۔

''تم نے مجھے پھر کہاں دیکھا؟'' وہ ماتھا پونچھ کر بہ مشکل لکھ پائی۔

''میری چار آنکھیں ہیں..... دو تمہارے ساتھ، دو میرے ساتھ۔ ان دو آنکھوں سے میں تمہیں ہر لمحہ دیکھتا ہوں۔'' جواب پھر سے ترنت آیا تھا۔ عائم کا دل گھبرا گیا۔ اس نے آج تک کبھی ایسی گفتگو نہیں سنی تھی۔ حتیٰ کہ ایمان بھی لحاظ ہی برتتا تھا۔ پھر یہ بے باک شخص کون تھا؟ ہر بات دھڑلے سے کہہ دیتا۔

''تم جتنا بھی چھپو گے، میں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گی۔'' اس نے خاصی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔ جیسے اسے دھمکایا تھا۔ اور وہ اس دھمکی کو بڑی دیر تک انجوائے کرتا رہا۔ کیونکہ ریپلائی خاصی دیر سے آیا تھا۔

''بہت خوب.....'' اس نے جیسے لطف لیا تھا۔ ''آپ اور ایسی بہادر.....؟ ذرا میرا نمبر نکلوانے کی کوشش تو کر بیٹے۔'' عائم کو لگا اس نے جیسے مذاق اڑایا تھا۔ وہ اندر تک بھنائی تھی۔ پھر غصے میں اس نے موبائل رکھ دیا تھا۔ بہت دیر بعد دوبارہ اٹھایا تو کئی میسج ایک ساتھ ملے۔ وہ پڑھنے نہ پڑھنے کے چکر میں رہی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر پڑھ ہی لیے۔ پہلے میسج نے ہی میٹر گھما دیا تھا۔

''احتشام کی فیور نہ سہی..... میری فیور تو لوگی ناں..... دیکھو، تم الجھن میں گرفتار ہو..... تمہیں ایک گائڈ لائن کی ضرورت ہے۔ میں تمہاری مدد کے لیے تیار ہوں۔'' میسج خاصا طویل تھا۔ عائم نے جلدی سے دوسرا کھول کر پڑھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ رہے تھے۔

''اچھا، ایک بات بتاؤ؟'' پھر سے نیا میسج ملا۔ ''تم پریشان کیوں ہو؟'' میسج پر میسج آتے رہے۔

''احتشام اور عالی کے ڈرامائی ''ملاپ'' نے پریشان کر رکھا ہے؟'' وہ اس کے دماغ کی چولیں ہلاتا غائب ہو گیا تھا۔ کیونکہ اگلے دو گھنٹے تک بھی اس کا دوبارہ میسج نہیں آیا تھا۔ عائم لاشعوری طور پر منتظر ہی رہی تھی۔ کیونکہ آخری میسج نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ کون تھا جو اس کے اندر پنپتے راز تک کو پا گیا تھا۔ آخر اسے عائم کے اندر کے حال کی خبر کیسے ہوئی تھی؟ وہ جیسے بھونچکی رہ گئی تھی۔ یہ رانگ نمبر وبالِ جان بنتا جا رہا تھا۔ جوتوں سمیت آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ عائم نے اس کا نمبر بلاک کرنے کا سوچا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے عمل بھی کر دیا۔ لیکن یہ کوئی ٹھوس حل نہیں تھا۔ اب وہ کسی اور نمبر سے میسج کیا کرتا تھا۔ اس کے پاس کئی حل اور کئی سوراستے تھے۔ اس کا دماغ خاصا زرخیز تھا۔ عائم بند باندھنے کی کوشش میں تھک سی گئی تھی۔

نیہا کی انگلی تھامے میں نے اسکول کی عمارت کے قدم اندر رکھا ہی تھا کہ اِک غیر معمولی سا احساس جاگا......کلاس روم میں جھانکا۔وہاں گھپ اندھیرا، دبیز خاموشی ......دو قدم پیچھے جا کر ہال کی جانب قدم بڑھائے تو ہال میں بھی وہی نیم تاریکی مگر دھیمی سی بھنبھناہٹ تھی۔یک لخت اِک ہلکا سا پٹاخا پھوٹا اور اگلے ہی پل اِک ہاؤ ہو کے ساتھ روشنیاں جلنے بجھنے لگیں......تالیوں کے شور میں کیک کاٹا جانے لگا۔

''اوہ......میرے ذہن سے محو ہو گیا آج نئے ایڈمنسٹریٹر کو ویلکم دیا جا رہا تھا۔اتفاقاً اس کی برتھ ڈے بھی تھی۔''بلند قامت، مضبوط جسامت لیے اس کی بھرپور شخصیت میں اِک خاص کشش و جاذبیت تھی......پچھلے ہی ہفتے میں تو اس نے جوائننگ دی تھی مگر اس کی شخصیت پر میں نے آج غور کیا......مجھے وش کرنا پڑا۔

''کون سی برتھ ڈے ہے؟''پھر پوچھا۔

''پچیسویں ......''اس کی مسکراہٹ جان دار تھی......مجھ سے ایک نہ دو کئی سالوں کا تفاوت تھا......شاید اسی لیے کھل گئی۔

''واہ......عمر چوری کے معاملے میں تو آپ نے عورتوں کو بھی مات کر دیا۔''

''اچھا......تو آپ کے خیال میں کیا ایج ہو گی میری؟''

شاید اپنی اسی بلند قامت، مضبوط جسامت کی وجہ

کیسی لاگی یاری

سیما بنت عاصم

سے مجھے بتیس سے اوپر کا ہی لگا تھا۔ مگر میں اڑا گئی۔ کہیں برا ہی نہ مان جائے۔

"سویٹ سکسٹین....."

"واہ..... آپ نے تو مجھے بے بی بنا دیا۔" وہ ہنسا۔

مجھے اس کا بولنا اچھا لگا..... انگریزی ملی اردو میں پختون لہجے کا تڑکا۔ سر جھٹک کر میں ایک طرف ہو گئی۔

یہ اسی رات کی بات تھی..... سب کاموں سے فارغ ہو کر اپنی بہترین دوست عافیہ سے messaging چلتی..... ان دنوں اس کا موبائل خراب تھا۔ نہ جانے کیسے ذہن کے پردے پر اک سراپا ابھرا..... اک بھرپور چھا جانے والی شخصیت..... میں نے آج پہلی بار اسے غور سے دیکھا تھا۔ بس یونہی اک میسج جڑ دیا۔

"سالگرہ کے گفٹ کیسے رہے..... سب سے اچھا گفٹ کیا تھا؟"

"پرفیوم....." کھٹ سے جواب بھی آ گیا۔ اُدھر وہ بھی شاید فری ہی تھا۔

"گڈ..... کس نے دیا تھا؟"

"سوری..... یاد نہیں....."

"اوکے..... ادھار..... کس کا رہا؟"

"آپ کا....." میں ہنس دی پھر خیال آیا۔

"آپ بکس پڑھتے ہیں؟"

"بہت کم کم..... بڑے بھائی عالم ہیں ان کی اسلامک بکس کبھی، کبھی پڑھتا ہوں۔"

"بڑے بھائی عالم ہیں تو چھوٹے کو تو پھر مفتی ہونا چاہیے..... یا پھر مسجد کا پیش امام....." مجھے پھر شوخی سوجھی۔

جواباً اس کا بھرپور قہقہے کا آئی کون۔

"کتابیں تو شخصیت کو نکھار دیتی ہیں۔ کتابیں پڑھا کریں....." میں نے مزید کہا تھا۔

میرا فیورٹ رائٹر خلیل جبران تھا اگلے روز میں نے خاموشی سے اسے "زرد پتے" بھیجا دی۔ مجھے حیرت ہی رہی کہ میں نے اسے ہی کیوں ایس ایم ایس کیا تھا..... کہ اسی شام پھر اسی وقت اس کا تھینکس کا ایس ایم ایس آ گیا۔

"میرا نام اعجاز محمد ہے..... اور آپ کا؟" اس نے ایسے نام بتایا جیسے آج ہی تعارف ہوا ہو۔

"میرا نام صباحت ہے، صباحت کرن..... مجھے اچھا لگتا ہے جب کوئی صبا کہتا ہے۔" میں نے ہنس کے نام بتایا۔ "آپ کو پتا ہے اعجاز کا مطلب یعنی معجزہ....."

"جی ہاں..... اور صبا کا مطلب..... ہوا..... ٹھنڈی میٹھی ہوا..... جو کہ آپ ہو لالے....."

"لالے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

"ویسے ہی پیار میں کہتے ہیں۔"

"اچھا..... لالا بھائی کو کہتے ہیں، میں سمجھی لالے بہن کو..... ویسے تم مجھے آپی کہہ سکتے ہو....." میں نے جتاتے ہوئے کہا۔

"نو..... آپی نہیں کہہ سکتا..... اور نہ آپی والی فیلنگز ہیں آپ کے لیے۔"

"تو کیا فیلنگز ہیں.....؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"تعلق کو کوئی نام دینا ضروری تو نہیں ہوتا۔ دوستی بذاتِ خود اک رشتہ ہے۔"

"دوستی.....!" میں دنگ رہ گئی..... "دوستی کا لفظ بہت بڑا ہے۔ اور رشتہ بہت وسیع..... تمہیں پتا ہے، دوستی کا مفہوم.....؟"

"جی نہیں..... صرف آپ ایوارڈ یافتہ ہیں..... آپ ہی بتائیں؟"

میرے پاس اس کا مفصل جواب تھا..... مگر رہنے دیا۔

"میرے لیے فرینڈشپ کا مطلب ہے شیئرنگ..... (sharing) شیئرنگ انسان کو ہلکا پھلکا کر دیتی ہے۔ اور یہ صرف دوست سے ہی کی جا سکتی ہے۔"

"گڈ..... مگر ایک چیز اور ہوتی ہے کہ always yes دوست کے لیے..... دوست کی لغت میں انکار کا لفظ نہیں ہوتا۔" مگر مرد حضرات سے میں بس سلام دعا ہی رکھتی..... دوستی کا سوال ہی نہیں تھا۔

"مجھے اپنی ساکھ عزیز ہے، لوگ اچھی لڑکیوں سے فرینڈشپ show off کرتے ہیں..... آدمی کی فیلنگز چینج ہو جاتی ہیں، وہ کسی لڑکی سے بات کرتا رہے تو....."

''تو کیا لڑکی کی فیلنگز نہیں چینج ہوتیں؟'' اس نے مجھے لاجواب کر دیا۔

اگلی بار علی الصباح اس کا صبح بخیر کا ایس ایم ایس آیا۔

''صبح بخیر راغلے.....'' میں نے شرارتاً لکھا۔

''واہ.....پشتو.....!'' اس نے سراہا۔

''جیسی.....ذات ویسی بات.....'' میرا جواب بے ساختہ تھا۔

اور شاید یہیں آ کر کہا جاتا ہے کہ بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی.....ہر بار اس texting میں گھڑیوں کا شمار ہاتھوں سے نکل جاتا۔ اس کی سوئی کل پر اٹکی تھی۔

''مجھے انکار سننے کی عادت نہیں ہے۔ آپ کیوں میری فرینڈ شپ ایکسیپٹ نہیں کر رہے؟''

میں نے سوچا کہیں وہ عادی ہی نہ ہو.....ہر اک در پہ جھکاتا ہوں جبیں.....سو کریدنا پڑا۔

''کیا تمہاری اور بھی فرینڈز ہیں؟ past مت بتانا.....صرف ابھی کا بتاؤ.....؟''

''لڑکیوں سے دوستی کرنا میری بھی عادت نہیں..... It's specially for you''۔

''یہی تو پوچھا ہے، کیا فیلنگز ہیں.....اور کیوں؟''

''آپ اچھی لگ رہی ہو.....'' میرا دل چاہا یہ میسج بار، بار پڑھوں، کٹ ڈرافٹ میں ڈالا..... ''آئی لائک یو۔'' مجھے لگا میرا دل اپنی رفتار بھولنے لگا مگر اس کا انداز.....کھولنے کے لیے مزید ہوا دینی پڑی۔

''کیوں تمہیں میرے لیے جسٹ فرینڈ شپ کا ہی خیال آیا؟''

''اس دن میری برتھ ڈے تھی، آپ نے وش کیا۔ بار، بار وہ لمحہ میری نظر میں گھومتا ہے.....مجھے بہت اچھا لگا۔ بہت اپنائیت ہے آپ کے لہجے و انداز میں.....''

''ارے.....تم نے غور سے نہیں دیکھا ہوگا..... کالا گلاب ہوں میں.....''

''جی نہیں.....اک خاص کشش و جاذبیت ہے آپ میں..... آخر یہ بات مجھے کہنی ہی پڑی۔''

age distance کتنا ہے؟''

''ہاں.....وہ تو ہے.....آپ کہاں رہتی ہیں اور میں کہاں.....'' وہ ہنس کے اڑا گیا۔

''چلو.....تمہیں چیلنج ہے.....تم پکا میری age بتاؤ؟''

''ستائیس.....اٹھائیس ہوگی۔'' اس نے بہت سوچ کے جو جواب دیا وہ بھی درست نہ تھا۔ میں ہنس دی۔ مگر جانے کیوں کچھ کھو دینے کا خوف مجھے سچ اگلنے سے روک گیا۔ ایک نہ دو.....دس سال کی ڈنڈی ماری گئی۔

''آپ کے لیے دوستی کا مطلب sharing؟ تو کیا آپ کو اس شیئرنگ کی ضرورت نہیں ہے؟''

میں سوچ میں پڑ گئی.....مجھے بھی اس سے بات کرنا اچھا لگتا.....اس کی شخصیت چھا جانے والی پُراثر تھی۔ کچھ تو میری بھی تنہائی کا مداوا ہو۔

''اگر میں اوکے کروں تو یہ بات شو تو نہیں کرو گے؟ مجھے اپنی ریپو بہت عزیز ہے، تم اچھے لڑکے ہو.....اور مجھے تم سے اچھی ہی امید ہے۔''

''تھینک یو.....آپ بھی اچھی ہو.....یو ڈونٹ وری۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تمہیں بھی شیئرنگ کی ضرورت ہے.....میں اس لیے اوکے کر سکتی ہوں.....مگر میری کچھ limits ہیں۔ ہاں.....تم جو چاہے مجھ سے شیئر کر سکتے ہو۔''

''اپنی limits بھی بتا دیں تاکہ پھسلنے سے بچوں.....'' اس نے شرارتاً کہا۔

''میری limits ہیں کہ فیلنگز فیئر رہیں.....تم یہ دھیان ہی ذہن سے نکال دینا کہ میں لڑکی ہوں..... اس سے فیلنگز فیئر رہیں گی.....اور ایج ڈس ٹینس بھی یاد رکھنا.....میں صاف سیدھی بات کرتی ہوں، جھوٹ یا فریب کا الجھاؤ، گھماؤ مجھے پسند نہیں.....تم مجھے سمجھ جاؤ گے بات کرتے رہو گے تو۔''

اگلے روز میں نے اسے اوکے کا سگنل دے دیا۔

" if you want you can share everything with me, as a companian and the best

"I was expecting you like this"

میں نے بھی مسکراہٹ بھیجی۔

"تم مجھے ایک اچھا دوست کہہ سکتے ہو مگر تم سے جو امید ہے اسے قائم رکھنا۔"

"زہے نصیب....." وہ کھل اٹھا تھا۔

وہ تنہا تھا..... میں نے اس کی تنہائی بانٹ لی تھی..... خود میرا وقت اچھا گزرنے لگا۔ فارغ وقتوں میں اچھا ساتھی مل گیا۔ اور جب بات sharing تک آئی تو ذاتیات بھی کھلنی ہی تھیں۔

میری گزرتی عمر سے خائف ہو کر امی، ابا نے ایک دوہاجو سے مجھے بیاہ دیا تھا۔ آذر کی اپنی اِک الگ دنیا تھی۔ جس میں ان کی فیملی وہ اس میں مگن رہتے..... میری یاد کم، کم ہی آتی..... ہوا کے جھونکے کے مانند آتے چلے جاتے۔

تیرے نزدیک آکر سوچتا ہوں
میں تنہا تھا کہ اب تنہا ہوا ہوں

میرا کام بس دنوں کا شمار تھا..... میں کس سے اپنے دکھ سکھ کہوں..... کس کے سامنے اپنا آپ کھولوں..... میری زندگی کا ادھورا پن..... ذات کا انتشار، یہاں میرے دکھوں پر نظر کرنے والا کون تھا۔

"یقیناً وہ آپ کی لاکھوں میں ایک صورت پر مرمٹے ہوں گے۔" اعجاز نے سنا تو کہا۔

"نہیں..... انہوں نے تو مجھے دیکھا تک نہیں تھا..... بس شادی کی ضرورت تھی کہ اپنی بیگم عرصے سے پیرالائزڈ ہیں۔"

"اوہ..... یہ زندگی تو بہت مشکل ہے..... انسان کی کچھ خواہشات، خواب ہوا کرتے ہیں۔"

"پتا نہیں..... اب تو عادی ہو گئی ہوں۔" میں ہنس دی۔ یہ بھی کوئی بتانے والی بات تھی۔ کبھی، کبھی اِک عجیب سی وحشت و بے قراری گھیر لیتی۔ میرا اضطراب بڑھ جاتا کبھی سوتے سے آنکھ کھل جاتی، یہ وحشت دُگنی پڑ جاتی..... زندگی نے میرے لیے برا نہ کیا تھا تو کچھ اچھا بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے تقدیر اور کاتب تقدیر سے شکوے کرنے آ گئے تھے۔

☆☆☆

میں نے اپنی ساری شرائط اسے کھول کر بتا دی تھیں۔ سو مطمئن تھی۔ وہ انہیں کہاں رکھتا..... یہ مجھے بھی معلوم نہ تھا۔ اس سب سے ہٹ کر عمر کا تفاوت، دوستی کا ہی رشتہ بنا سکتا تھا۔ سو بن گیا تھا مگر وہ اس ... ڈیفرنس کی خاک پروانہ کرتا۔ شاید اسی کو رد کرنے کے لیے وہ میرا نام لے کر "تم" پکارنے پر اتر آیا۔ اور بھلا کسے برا لگتا ہے سراہے جانا..... میں نے خود پر توجہ دی تو شخصیت کا نکھار سامنے آیا حد تو یہ کہ پل، پل کروٹیں لیتا..... زیست کی رائگانی خود کی ناقدری کا آزار کم پڑنے لگا، اس سے رات تا دیر..... یا دن میں گاہے بہ گاہے بات چیت مجھے اپنا آپ بھلا دیتی..... تو دوسرے تو پھر دوسرے تھے۔ نیہا کو اسکول لینے اور چھوڑنے جاتی..... تو اس کی نظروں کا حصار نہ ٹوٹتا..... وہ کبھی خاموشی سے یا بعد ازاں ایس ایم ایس کر کے کہتا..... "لکنگ نائس....."

اور میرا ناز..... بڑھ جاتا۔

"مجھے پتا ہے یہ تو میں بس لوگوں سے مزے لیتی ہوں کہ میں عام سی ہوں..... مجھے پتا ہے مجھ میں اٹریکشن ہے اور سب یہی کہتے ہیں۔"

"جی ہاں..... اور جب سب ہی ایک بات کہنے لگیں تو مان لینا چاہیے کہ وہ بات ٹھیک ہی ہے۔" وہ ہنسا تھا۔ اک روز اس نے کہا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ تم اِک سائے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہو؟" اب میں اسے کیا بتاتی کہ میری مجبوریوں کے طفیل سودا مہنگا نہ تھا..... امی، ابا کا میرے سوا تھا ہی کون..... ہم لوگ ایک اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ بھی کم نہ تھا..... مجھے گھر کا خرچ وقت پر ملتا..... رینٹ سے اٹھ کر ایک بہتر گھر میں آ گئے تھے..... اور جہاں اتنی آسانیاں ہوں وہاں میرے دل کے آزار کون گنتا..... بس ایک سمجھوتے کی تو بات تھی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری کرنے کا اک خاموش معاہدہ تھا۔

میں ایک پھول تھا وہ مجھ کو رکھ کے بھول گیا
تمام عمر اسی کی کتاب میں گزری

"شادی کے بعد زندگی میں تبدیلی آہی جاتی ہے۔" میں ہنس دی تھی۔ "میرے لیے تو شادی بھی اِک سراب بن کر رہی......"

"شاید اسی لیے تمہاری نظروں میں انتشار نظر آتا ہے بلکہ اضطراب......" وہ بولا۔

"جبران نے کیا خوب کہا ہے تم جسے چاہو، اسے آزاد چھوڑ دو......وہ اگر پلٹ آئے تو تمہارا اور نہ لوٹے تو سمجھو کبھی تمہارا تھا ہی نہیں......" میرا لہجہ ٹوٹتا ہوا سا تھا۔ اسے بدبختی نہیں تو اور کیا کہا جائے۔ جیون ساتھی کے نام پر اِک ہیولہ جو اپنی چھب دکھاتا، گم ہو جاتا، سنا تو یہی ہے کہ وقت کیسا بھی ہو بدلتا ضرور ہے۔ میری دنیا تیاپر ختم تھی......جو اِک جواز تھی۔ کبھی آذر کے لوٹنے کے لمحات میں میرے لیے زندگی تھی......مگر اب نہیں...... وہ تو یہ کہ پل، پل کروٹیں لیتے اس وحشت و اضطراب کو قرار نصیب ہو گیا تھا۔

کچھ دنوں میں اعجاز کی شخصیت کی اِک اور پرت کھل کر سامنے آئی۔ زرینہ اس کی محبت تھی۔ اس نے زرینہ کو پالیا تھا مگر اس کا پیار ایک سوالیہ نشان......ان دونوں میں اختلاف اور اب دوری تھی۔ میں نے سنا تو تھوڑا مزہ لے کر کہا۔

"اوہو......پھر کون اعجاز صاحب کے سرہانے بیڈ ٹی رکھ کر انہیں جگاتا ہوگا......کون ٹوٹے بٹن لگائے گا کون، شام کو منتظر ہوگا؟"

"ہر عورت تم جیسی کہاں......" وہ آزردہ ہو گیا۔

"سچ کہوں تو مجھے رشک آتا ہے......اس شخص پر جسے تمہاری ذات سے کم کم ہی سہی یہ سب سکھ نصیب تو ہیں......میں تو اس سب کے لیے ترستا رہا ہوں۔ وہ مجھے اولاد نہیں دے سکتی......مجھے پروا نہیں......مگر اس کے کمپلیکسز میری زندگی اجیرن کرکے رکھتے ہیں......مگر آئی ڈونٹ کیئر میں اکیلا ہوں......مگر خوش ہوں......"

"میں نے تم سے کہا تھا ناں مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ "ایسا ممکن ہے کیا......کوئی تنہا ہو مگر خوش ہو؟" میں نے جتایا۔

"ہاں......ایک کمی سی تو لگتی ہے۔" اس نے باور کیا۔

"گڈ بس یہی محبت ہے......اور محبت کبھی رائگاں نہیں جاتی۔"

"پتا نہیں بس وہ میری ضد تھی......اور اب خود ضد پر ہے۔"

"ضد، غصہ......ہٹ دھرمی اس سے حاصل کچھ نہیں......مگر نقصان بہت ہے، ویسے ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں......بس اِک معمولی سی تکرار......" وہ ہنسا۔ "جس تن لاگے وہ تن جانے......ہجر کے دن طویل ہوتے ہیں......اور راتیں کرب ناک......"

میں سمجھ گئی......نفس و محبت کی کشمکش بھی اس کی عقل ٹھکانے نہیں لگا رہی تھی۔ تو اس لیے کہ اس کی مردانہ انا آڑے آرہی تھی۔

"چلو کچھ دن گزریں گے سب ٹھیک ہو جائے گا......" اس نے بات اڑا دی تھی۔

☆☆☆

نعت رسول مقبولؐ

دنیا میں کوئی تجھ سا پیمبرؐ نہیں آیا
تاریخ میں اب تک ترا ہم سر نہیں آیا
کسریٰ ہو کہ قیصر ہو سکندر ہو کہ دارا
کوئی تیرےؐ قدموں کے برابر نہیں آیا
مدت سے تمنا ہے تیرےؐ روضے کو دیکھوں
لیکن مجھے وہ لمحہ میسر نہیں آیا
افواج عدو آج بھی شمشیر بکف ہیں
کیوں پھر وہ ابابیل کا لشکر نہیں آیا
خالق بھی ترے حسن کی تخلیق پہ نازاں
تجھ جیسا حسیں دنیا میں پیکر نہیں آیا
اخبار میں چھپ جائے کسی روز یہ سرخی
حسان تیرے در سے پلٹ کر نہیں آیا

کلام: ابراہیم حسان
انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاولنگر

وہ کئی روز سے گم تھا..... کال نہ میسج..... نہ ہی ریپلائی مجھے تھک کر ڈھیلا مارنا پڑا۔

"best feeling in the world is when, you think that your friend forgot you but suddenly you receive a massege from your friend saying haye I miss you yar"

جواباً اس کی کال ہی آ گئی۔

''لگتا ہے..... گھر والی آ گئی ہے۔ تبھی گھر میں دل لگ گیا ہے۔'' میں نے کھٹ سے کہا۔

''دل تو اب آپ کے پاس ہی پڑا رہتا ہے سویٹی جی.....''

''تم نے میٹھا کھایا ہے کیا..... لفظوں سے رس ٹپک رہا ہے۔''

''ہاں، مجھے میٹھا پسند ہے، اب کہنا کہ تمہیں بھی پسند ہے۔''

''بالکل، میں تو زندہ ہی میٹھا کھانے کے لیے ہوں.....''

''تم تو بس چمچ گھما دو..... تو مٹھاس گھل جائے..... ویسے مجھے کب میٹھا کھانے کو ملے گا؟''

''جب تمہیں میٹھا پکا کر کھلانے والی آ جائے گی۔'' میں نے بات کا رخ بدل دیا۔

''ویسے مجھے لگتا ہے تمہیں اس کی یاد اور محبت ہے..... اور جب تمہیں ہے تو اسے بھی ضرور ہو گی.....''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''کسی دانا سے سوال کیا گیا..... تیرے دل میں میری کتنی محبت ہے اس نے کہا اپنے دل میں جھانک کے دیکھ..... جتنی تیرے دل میں میرے لیے ہے۔''

''تم اتنی کتابی باتیں کیوں کرتی ہو؟'' وہ جھلایا۔

''کتابیں میرا عشق تھیں..... اور زندگی کتاب میں رکھا مرجھایا پھول.....'' میں ہنسی۔

''اگر کسی کو تم پر یہ مان ہو کہ تم بڑھ کر اسے تھام لو گے تو تمہیں چاہیے کہ اس کا یہ مان رکھ لو..... ممکن ہے وہ تمہاری منتظر ہو.....''

مگر اس کی الٹی کھوپڑی چلتی کم..... گھومتی زیادہ تھی۔

''تو..... وہ خود گئی ہے..... اسے خود ہی آنا ہو گا.....'' وہی مرد کے دماغ کا ٹیڑھا پن۔

''تم اسے منا لو گے تو کیا ہسبینڈ نہیں رہو گے؟''

''مجھے نہیں لگتا کہ اسے مجھ سے رتی بھر بھی محبت ہے..... اس کا بار، بار اکھڑنا میرے لیے اِک سوالیہ نشان ہے، میں کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔''

کاش میں اس پل ان لفظوں کی گہرائی جانچ لیتی۔

''عورت آبگینہ ہوتی ہے..... اسے سینت سنبھال کر رکھو گے تو کیسے بکھرے گی؟''

''کچھ وقت گزرے گا..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے پھر دُہرایا۔

''اگر تم سوچو کہ کسی دن جاگو گے تو وقت، حالات اور زندگی کو بدلا پاؤ گے تو ایسا نہیں ہوتا..... تبدیلی کے لیے قدم اٹھانا ہی پڑتا ہے۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ مگر اسے یہ ذکر ہی ناگوار تھا۔

☆☆☆

آج اسکول کی عمارت عبور کرتے ہوئے میرے اندر دھکڑ پکڑ مچی تھی۔ اعجاز کے کمرے تک کا فاصلہ عبور کرتے میرے قدموں میں لرزش تھی۔ لائٹ غائب تھی۔ راہداری میں جنریٹر کی پُرشور آواز اعجاز کے کمرے میں نیم تاریکی اور وجود میں اترتی جسم و جاں کو چھیدتی خاموشی..... میں دھوپ کا سفر کر کے آئی تھی..... اس کا ہیولہ کچھ دیر میں واضح ہوا..... آفس ٹیبل کے اس پار..... اس کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ، لبوں پر جامد چپ تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناں..... دوستی کا لفظ بہت بڑا اور..... رشتہ وسیع ہے..... تم نے..... تم نے وہ ایس ایم ایس کر کے ثابت کیا..... کہ تم اس کا بار نہیں اٹھا سکتے..... کیا سوچ کے تم نے تم نے مجھ پر وپوز کیا؟'' میرے لبوں سے ادا ہوتے لفظ ٹوٹ رہے تھے۔ اس کی نظروں کے تیور بدلے تھے۔ اسی جامد اور گہری سنجیدگی

کے ساتھ وہ اٹھ کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا...... میری سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔

"میں نے..... میں نے تمہیں پابند کیا تھا...... یہ فرینڈشپ صرف فرینڈشپ رہے گی۔ مگر..... مگر یہ بات کہہ کر تم نے میرا دوست کھو دیا ہزار بار کہا..... کہ اس رشتے کو شفاف رکھنا کتنی جلدی تم، ہر وعدے، ہر عہد سے پھر گئے۔ تمہاری نیت ونظر میں کھوٹ آ ہی گئی ناں......"

اس کے بھینچے لبوں کی خاموشی مجھے کھلی۔

"میں نے تمہیں پرپوز کیا ہے..... اس میں کھوٹ کا سوال ہی نہیں ہے۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"تم نے وہ ساری شرائط پیش کی تھیں میں نے انہیں منظور نہیں کیا تھا ورنہ اعجاز احمد....." اس نے اپنی مضبوط چوڑی چکلی چھاتی ٹھونکی۔ "زبان پر جان دینے والا آدمی ہے اور فیلنگز کے لیے کوئی وعدہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"تم..... تم بھول رہے ہو..... تم ایک شادی شدہ مرد ہو..... اور میں آذر کی....." مجھے تاؤ چڑھ گیا۔

"اوہ آذر....." اس کا لہجہ کاٹ دار ہو گیا۔ "کیا..... تمہیں نہیں لگتا کہ تم اک سراب کے پیچھے دوڑ رہی ہو۔"

بات تو سچ تھی مگر بات تھی رسوائی کی۔

"تو اس سے کیا..... ویسے بھی یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اس سے اچھی طرح نمٹنا جانتی ہوں۔ میری اور تمہاری عمر کا تفاوت میں نے تم سے کہا تھا..... ہمیشہ یاد رکھنا۔"

"اچھا..... یہ کس کتاب میں درج ہے؟ کیا تم جیسی کتابی لڑکی کو یہ بتانا پڑے گا کہ اس فرق کی کوئی حیثیت..... کہیں درج نہیں؟"

"یہ..... یہ ناممکن ہے؟" میں نے اپنا لہجہ ٹوٹتا ہوا محسوس کیا۔

"کیوں..... کیوں ناممکن ہے I am in love with you."

"شٹ اپ..... تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو..... میرا کردار میری ساکھ، میری زندگی بھر کی کمائی ہے۔ اس پر ذرا سی بھی آنچ....." مجھے یاد آیا میں اسے ستانے آئی تھی۔

"شٹ اپ....." اس کی آواز پہلی بار بلند ہوئی۔

"تم نے جن limits کی بات کی تھی۔ کیا ان میں سے ایک پر بھی تم خود پوری اتری ہو؟ کیا اس فرینڈشپ سے تمہاری فیلنگز، تمہاری لائف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی؟" میرے سامنے کھڑا اس کا بلند و مضبوط وجود..... میں نے خود کو کسی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح لرزاں و بے بس محسوس کیا۔

اس بار اس نے میرا لرزتا ہاتھ تھام کر اپنے سر پر دھر لیا۔

"کھاؤ میرے سر کی قسم..... اور کہو کہ تمہاری زندگی میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں..... میرے ہونے نہ ہونے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہیے صباحی..... کہ تمہارے دل میں میرے لیے کچھ نہیں ہے۔"

میرا دل لرزا ہوا کی زد پر دھرا کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپا تھا۔ کبھی، کبھی کوئی چیز ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے، ہمارے اندر پلتی، پنپتی ہے، یہاں تک کہ سانس لینے لگتی ہے مگر ہم اسے جھٹلاتے چلے جاتے ہیں..... جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو منوا نہ لے۔ اس کے سر پر دھرے میرے ہاتھ کی لرزش سوا تر ہو گئی..... میری نظروں کے سامنے..... اس کا بلند قامت وجود..... اس کا نقش دھندلا پڑتا چلا گیا تھا۔ اگلے ہی پل میں پلٹ کر دوڑتی ہوئی اسکول کی عمارت سے نکلتی چلی گئی تھی۔ مگر اپنا آپ جیسے وہیں کہیں بھول آئی۔

اسی شام اس کی کال آ گئی۔

"پہلے تو بس ایک گمان تھا..... مگر آج صدق صد یقین ہو گیا کہ چاہت کے اس سفر میں، میں تنہا نہیں ہوں۔"

"زرمینہ کو لے آؤ..... وہ تمہاری زندگی کا ایک سچ ہے۔" ایک سرد سانس لے کر میں نے اک مختلف بات کہی۔

"اور تم.....؟ کہہ دو کہ تم سراب ہو....." وہ ترنت بولا۔

"پتا نہیں..... مگر سراب کے تعاقب میں ضرور ہوں۔"

"تم ایک انسان کی salfishness کی نذر..... اپنی زندگی کر رہی ہو..... دوسروں پہ اپنی

زندگی وار کر اپنی خوشیوں کی قربانی دے کر...... تمہیں کتنے تحفے مل جائیں گے؟ جو تمہارے اپنے ہیں...... ان کا سکھ تمہارے سکھ میں ہے۔ دوسروں کے آزار سمیٹنے کو اپنا آپ وار دو...... مگر انجام پر خود کو تنہا پاؤ گی...... یہ رشتے تمہارے دم آخر تک نہیں چلیں گے...... اور رہا آذر...... تو یاد رکھو...... سالوں ساتھ چلنے سے کوئی اپنا نہیں بن جاتا۔ تم نے مجھے سچ کا پابند کیا ہے مگر یہ بھی یاد رکھو صبائی کہ سچ تلخ ہوتا ہے۔ اگر اس دوستی کی پاسداری عزیز ہے تو یاد رکھو...... دوست کے لیے، دوست کے پاس انکار کا لفظ نہیں ہوتا۔"

میں سر تھام کے بیٹھ گئی...... اس کا ایک، ایک لفظ دل میں اترتا تھا مگر...... سوال میری repu کا تھا، جو ہاتھ سلام کو اٹھتے تھے، طنزیہ تالیاں پیٹنے پر اتر آتے، مجھے یہ منظور نہ تھا۔

یونہی تو نہیں...... مرد و عورت کے تعلق کو آگ و پانی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کتنا ہی فاصلہ...... کیسی ہی تفریق کیوں نہ ہو...... احساسات میں تغیر آ ہی جاتا ہے، یہ تو طے تھا کہ میں زیر ہونے لگی تھی...... پسپا ہو جاتی تو بہت کچھ بکھر جاتا...... مجھے اس سب کو بکھرنے سے بچانا تھا۔

☆☆☆

"اور ایسا بھی ہوتا ہے کبھی کسی چھپے ہوئے خوابیدہ احساس کو جھنجوڑنے کے لیے اسے ہوا دینی پڑتی ہے...... زرینہ اسی ہفتہ لوٹ آئی تھی۔ تو اس میں کمال اسی خوابیدہ جذبے کے جاگ اٹھنے کا تھا۔

ہاں...... مجھے اعتراف ہے، دوست کے لیے، دوست کی لغت میں انکار کا لفظ نہیں ہوتا......اعجاز کے موبائل سے زرینہ کا نمبر کسی طرح اڑا کر میں نے ہی اسے کال کی تھی۔

"میں اعجاز سے شادی کر رہی ہوں اسی ہفتے۔ تم اگر لوٹنا چاہو تو صرف دو دن کی مہلت ہے ورنہ اعجاز صرف تمہارا نہیں رہے گا۔"

میرے لفظوں کی گھمبیرتا میرے اندر سانس لیتے احساسات کی سچائی وہ زیر دام آ گیا...... تو میں نے کر

رو دی...... میں نے نرمی سے کہا۔

"اگر اس سے محبت ہے تو اس محبت کا یقین بھی دو...... بے یقینی اسے بھٹکا بھی سکتی ہے۔" اس بے یقینی سے بات کہاں تک جا پہنچی تھی۔ اس کا گمان بھی نہیں چھو سکتا تھا۔ اگر اعجاز اسے منا لیتا تو شاید اتنا وقت نہ لگتا...... مگر اس گزرے وقت میں میرا جو کچھ کھو گیا اسے گمان تک نہ تھا۔ یہ اسٹرائیکر پر صرف ایک ضرب تھا۔ اور کوئین اعجاز کے خانے میں جا گری...... زرینہ لوٹ آئی۔

کبھی، کبھی کسی کی ایک ضرب سے بڑی توڑ پھوڑ...... بڑا انتشار پھیلتا ہے اور کبھی اسی معمولی سے ضرب سے بہت کچھ بنتا چلا جاتا ہے۔

اگلی بار اسکول گئی تو پہلا سامنا اعجاز ہی سے ہوا۔ وہ خوش تھا کہ نہیں...... مگر آسودہ نظر آیا۔

"تھینک یو مائی بیسٹ فرینڈ......" اس نے میرا ہاتھ تھاما تو اس کے مضبوط ہاتھ کی حدت سے میرا وجود دہکنے لگا۔

"سنو...... جبران کو میں نے بھی پڑھ لیا ہے...... اگر کسی نے تمہاری راہ میں کانٹا رکھ دیا تو تمہیں چاہیے کہ اس کانٹے کو اٹھا کر پھینک دو...... اگر تم نے بھی اس کی جگہ کانٹا رکھ دیا تو دنیا میں ہر جگہ کانٹے ہی کانٹے نظر آنے لگیں گے۔"

"بات یہ تھی کہ تعلق کوئی بھی ہو...... محبت کے بغیر ادھورا ہے، جب تم کسی کا ساتھ مانگو تو اس کا پیار بھی مانگو...... اور جب کسی کا ساتھ پالو تو اس کی ہمیشگی کی دعا کرو...... رشتوں کی پاسداری ان کی سالمیت میں ہی ہے۔"

اس کی نظریں شا کی نظر آنے لگیں تو میں دامن بچانے لگی...... میری نظروں میں اس کا وجود دھندلانے لگا تو پلٹ آئی...... مجھے معلوم تھا وہ بہل جائے گا، گزرتا وقت بہت کچھ دھندلا دیتا ہے۔ اس کی اجڑی بکھری زندگی سنبھل گئی...... اسے زرینے کی چاہت کا ادراک نصیب ہو گیا...... اگر کچھ بکھرا تھا تو میرے اندر مگر خیر تھی، مجھے میرا دوست واپس مل گیا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس سے بڑھ کر میری زندگی کے آزار کہاں ماننے......

❁❁❁

اولاد، زینت اور امتحان

وردہ بخاری

''شادی کو دوسرا سال چڑھ گیا اور ابھی تک کوئی بچہ نہیں ..... کیا بات ہے کوئی پلاننگ تو نہیں کر رہے ہو؟'' پہلی آواز۔

''ارے، یہ دوپٹا اتنا پھیلا کے کیوں اوڑھا ہوا ہے کہیں کوئی خوشخبری تو نہیں؟'' دوسری آواز .....

اب وہ کیا بتاتی کہ دوپٹا تو شروع سے امی نے ایسے ہی اوڑھنا سکھایا تھا اور بچے نہیں ہو رہے تھے تو اس کا کیا قصور کہ اسے تو خود بچے کی شدت سے خواہش تھی۔

اور ڈاکٹر کہتی تھی کہ ٹینشن سے بچیں لیکن کیسے؟ کیسے وہ لوگوں کی باتوں کو دل سے نہ لگائے۔ جب روز، روز سننا پڑیں اور اب تو اس کا شوہر بھی کچھ بددل سا لگنے لگا تھا۔ معلوم نہیں کیسے اسے غصہ آنے لگا تھا بات بے بات..... تب وہ اور سہم جاتی۔ ماں سے دکھ سکھ کرنا چاہتی مگر ماں تو پہلے ہی زندگی کی پریشانیاں نباہ رہی تھی۔ سو وہ میرا جو شادی سے پہلے چھوٹی سی بات پر باپ سے ڈھیروں شکایتیں کرتی اب ہر وقت سب ٹھیک ہونے کا سگنل دیتی اور ماں، باپ پُرسکون ہو جاتے۔

زندگی یوں ہی بے کیف گزر رہی تھی کہ ایک دن سورج خوشی کی نوید لے کر طلوع ہوا اور اس کی گود ہری ہونے کی خوشخبری دے گیا۔ سب بہت خوش تھے اور وہ ان کی خوشی میں خوش..... تخلیقی مراحل بخیر و خوبی گزرنے لگے اور اب ننھی پری کے گود میں آنے سے جہاں ذمے داریاں بڑھیں وہیں وہ خود کو مکمل سمجھنے لگی..... لیکن یہ کیا؟ پھر سے لوگوں کی زبانوں کا زہر.....

"اتنے عرصے بعد اولاد ہوئی اور وہ بھی بیٹی....."

"ہائے بچی کا رنگ بھی دبتا ہوا ہے۔"

"چلو اللہ بیٹا دے گا اگلی دفعہ....."

ایسی بہت سی ذو معنی باتیں اور دعائیں جنہوں نے اس کا پیچھا لے لیا اور وہ پھر سے منتیں مرادیں ماننے لگی بیٹے کے لیے..... اللہ نے پھر امید پیدا کی۔ اور جس دن ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ میں اسے بیٹے کی نوید دی اسے لگا دنیا اس کے قدموں میں آ گئی۔

"اب زندگی میں کبھی پریشانی نہیں آئے گی۔"

"اب میرا شوہر میری کوئی بات نہیں ٹالے گا۔"

"اب میری سسرال میری عزت کرنے لگے گی۔"

یہ اور ایسے بہت سے خوش کن خیالات اس کے آس پاس چکرانے لگے۔

مگر آہستہ، آہستہ اس کی خوش گمانیوں کے غبارے سے ہوا نکلنے لگی۔ بیٹا زندگی میں آ گیا تھا اور زندگی معمول کی طرف لوٹ آئی تھی۔ اس کا شوہر بھی خوشی منا کے نارمل ہو چکا تھا بلکہ اس دفعہ تو اسے باور کرایا گیا تھا کہ اولاد مرد کے نصیب سے ہوتی ہے سو بیٹے کے ہونے میں سب کمال بھی اسی کا ہے..... اور اس کا شوہر فخر سے راجا اندر بنا اپنے قصیدے سنتا۔

وہ حیرت زدہ سوچتی کہ یہ باتیں پہلے کیوں نہ دہرائی گئیں۔ پہلے تو اس کے شوہر کو دوسری شادی کے مشورے دیے جاتے تھے کہ پتا نہیں وہ اولاد پیدا کر سکے گی یا نہیں..... حالانکہ ابھی دو سال بھی شادی کو نہ ہوئے تھے۔ اور اب اللہ نے رحمت اور نعمت دونوں سے نواز دیا تھا لیکن پھر بھی اس کے ہاتھ نہیں دل خالی تھا۔

"ہاں اس نے کیا ہی کیا تھا..... کیا کمال کیا تھا کہ دنیا کی ساری عورتیں بچہ پیدا کرتی اور پالتی ہیں..... یہ تو اس کے شوہر کا نصیب تھا۔" اس نے خود کو بہت خالی، خالی محسوس کیا۔

شاید اس کی سوچ ہی غلط تھی۔ اگر اتنی محنت اور دعائیں وہ اللہ کو خوش کرنے کے لیے کرتی تو یقیناً اس کا دل سکون کی روشنی سے منور ہوتا..... لیکن وہ تو سب توقعات دنیا والوں سے منسلک کر کے بیٹھ گئی۔ بے اختیار وضو کرتے اور روتے ہوئے اس نے سچے دل سے رب کو منانے کی ٹھانی تھی..... کہ دلوں کا سکون تو صرف اللہ کی یاد میں ہی ہے اور اس کے بچوں کے چمکتے چہرے اس بات کا ثبوت تھے کہ اس کا رب اس سے ناراض نہیں.....

بے شک اولاد زینت ہے مگر یہی اولاد امتحان بھی ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور شکرانہ ادا کرنے کے ساتھ، ساتھ استغفار بھی کیا تھا، اور اب اپنے رب کے حضور ہاتھ پھیلائے اپنی اولاد کی بہترین تربیت کی دعائیں مانگا کرتی کہ اس امتحان میں وہ اپنے اللہ کے حضور سرخرو ہونا چاہتی تھی۔

++

کڑوا بادام

عائشہ خان

''اچھا امی جان..... میں اب چلوں گا، گھر پہنچتے، پہنچتے آٹھ ساڑھے آٹھ بج جائیں گے..... تیاری کے لیے دس منٹ بھی لوں تو بہ مشکل نو بجے پی سی پہنچوں گا..... ابا جان کہاں ہیں۔''

''لو بھئی نیک بخت..... آگئے تمہارے بادام.....'' اسی وقت ابا جان ہانپتے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔

''بادام.....!'' وہ حیران ہوا۔ اتنی افراتفری میں بادام لانے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔

''تمہارے لیے منگوائے ہیں، ایمن سے کہنا رات کو بھگو دیا کرے گی، صبح دودھ کے ساتھ کھا لینا..... ہر وقت تو آفس میں دماغ کھپاتے ہو..... بادام دماغ کو تقویت دیتے ہیں..... آنکھوں کو روشن رکھتے ہیں۔''

بے اختیار اس کا جی چاہا کہے۔

''میری پیاری امی جان..... میرے دماغ کو نہیں دل کو تقویت کی ضرورت ہے۔''

دل..... جو ہر گزرتے دن کے ساتھ ہر چیز سے بیزار ہوتا جا رہا ہے، دل جو چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑے اور کہیں دور نکل جائے..... جہاں اپنے زیاں کا احساس نہ ستائے..... دل کے رائگاں جانے کا دکھ نہ تڑپائے۔

''کیا بات ہے ثقلین بیٹے..... یار، یار کہاں کھو جاتے ہو تم؟''

''کہیں نہیں امی جان.....'' فوراً خود کو کمپوز کرتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

''ایمن اچھی لڑکی ہے ثقلین..... پھر کیا وجہ ہے کہ شادی کے بعد تم اتنے خوش نظر نہیں آتے..... جتنے شادی کے وقت تھے؟''

"ایسی کوئی بات نہیں امی جان...... بس کام کا برڈن ہے۔ نئی نئی جاب ہے...... آج محنت کروں گا تو کل کوئی مقام بنا پاؤں گا ناں......" اس نے فوراً مسکرا کر ان کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں انہیں یقین دلایا تھا۔

اب پتا نہیں انہیں یقین آیا تھا یا نہیں لیکن جواب میں بس وہ خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈپٹتے ہوئے آئندہ محتاط رہنے کا ارادہ کیا تھا...... وہ خود تو پریشان تھا انہیں کیوں پریشان کرتا۔

☆☆☆

"خدا حافظ......" آبادی کی حدود سے نکلتے ہوئے اس نے سڑک کے کنارے لگے بورڈ پر سرخ روشنائی سے لکھی اس عبارت کو پڑھا تھا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

آٹھ بجے تک وہ گھر پہنچ جانا چاہتا تھا کیونکہ نو بجے ایک آفیشل ڈنر میں اس کی شرکت بے حد ضروری تھی۔

وہ اس قدر ہنگامی حالت میں کھاریاں کبھی نہ آتا اگر شام کو فون پر امی جان سے بات کرتے ہوئے بار، بار ان کی طبیعت کی خرابی کا احساس نہ ستاتا۔

وہ جاب کے سلسلے میں آج کل سرگودھا میں مقیم تھا۔

شادی کے بعد جب امی جان نے ایمن کو اس کے ساتھ بھیجنے کا ارادہ کیا تھا تو اس نے بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ لوگ بھی اس کے ساتھ چل کر رہیں؟ لیکن وہ اپنا آبائی گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ وہاں ان کی شادی شدہ بیٹیاں بھی... عزیز و اقارب تھے، سنگی ساتھی تھے۔ ثقلین بھی جانتا تھا کہ وہ وہیں زیادہ خوش ہیں اس لیے اس نے انہیں زیادہ مجبور نہیں کیا تھا۔

مہینے میں دو، تین دن وہ اور ایمن ان کے پاس جا کر گزارتے تھے جبکہ وہ خود ہر ہفتے انہیں ملنے کے لیے نہ آتا تو اسے چین نہیں آتا تھا۔

آج بھی وہ فجر کی نماز ادا کرتے ہی نکل پڑا تھا اور چند گھنٹے ان کے ساتھ گزار کر اب وہ واپس جا رہا تھا۔

جمائے اپنی عادت کے برخلاف وہ خاصی ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا جب اس کی نگاہ سڑک کنارے لگے بورڈ پر پڑی تھی۔

"بسم اللہ ہوٹل......" زیر لب پڑھتے ہوئے مسکراہٹ نے اس کے سنجیدہ چہرے کا احاطہ کیا تھا۔

بے اختیار اس کا پاؤں بریک پر گیا تھا اور اس نے گاڑی کی اسپیڈ کم کر دی تھی۔

وقت کی کمی کی وجہ سے اس نے چاہا تھا کہ یہاں رکے بغیر چلا جائے لیکن جا نہیں سکا تھا۔

غمگساری، دلداری اور وفاداری کچھ لوگوں کی فطرت میں ہوتی ہے...... چیزیں انہیں جلدی بھاتی نہیں اور بھا جائیں تو دل سے جاتی نہیں......

ثقلین عباس شاہ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ تین سال ہو چکے تھے اسے اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے...... ہر مرتبہ آتے یا جاتے ہوئے وہ اس چھوٹے سے ہوٹل پر ضرور ٹھہرتا تھا۔ پتا نہیں چائے کی وجہ سے یا چائے بنانے والے کی وجہ سے......

فضل دین جس طرح "بسم اللہ" کہتا، بے حد خوشی اور جوش کے ساتھ اس کی طرف بڑھتا...... انکساری و تابعداری سے اس سے ملتا پھرتی سے خود اس کے لیے کرسی لاتا...... اپنے ہاتھوں سے دیگچی دھو کر اس کے لیے چائے بناتا۔ ثقلین کو اس کے اس خلوص پر بہت پیار آتا۔

پہلی مرتبہ اس نے سمجھا تھا کہ شاید یہ فضل دین کی عادت ہے یا اس کی پیشہ ورانہ مہارت ہے۔ لیکن دوسرے، تیسرے چکر میں اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ سب کسٹمرز سے اچھی طرح پیش آتا ہے...... مگر سب کو بٹھانے کو کام کرنے والے لڑکے ہیں...... سرو بھی وہی کرتے ہیں، یوں آگے بڑھ کر کسی کا استقبال خود نہیں کرتا جیسے اس کا کیا کرتا تھا۔ اس چیز نے اسے حیران کیا تھا اور جب اس نے اس سے پوچھ ہی لیا تھا اور اس کے جواب نے جہاں ثقلین کو حیران کیا تھا وہیں بری طرح پشیمان بھی کر دیا تھا۔

"بس صاب...... تہانوں دوروں آندیاں ویکھ

سے آتا دیکھ کر دل خود بخود آپ کی طرف کھنچنے لگتا ہے)

"یہ کیا بات ہوئی فضل دین..... دور سے دیکھ کر ہی بھلا کیوں دل کھنچنے لگا تمہارا..... کوئی وجہ بھی تو ہوگی ناں.....؟" اس نے یونہی ایک بات کی تھی۔ لیکن فضل دین کے جواب نے اسے پورا اس کی طرف گھما دیا تھا۔

"میرا ابا آکھدا سی صاب..... اللہ والے بل، وچ نگاہ نوں اسیر کرلیندے نے..... دل آپوں آپ اوہناں ول کھچن لگ چندا اے۔" (میرا ابا کہتا تھا اللہ والے ایک نگاہ میں اپنا اسیر کر لیتے ہیں دل خود بخود ہی ان کی طرف کھنچنے لگتا ہے) وہ چائے کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے سادگی سے کہہ رہا تھا۔

"اللہ والے.....!" اس کے دل پر جیسے کسی نے کاری ضرب لگائی۔ ایک گہری شرمندگی، شدید ندامت تھی جس میں اس نے خود کو گھرتے پایا تھا۔

وہ بھلا کہاں تھا اللہ والا..... پانچ نمازوں تک کا پابند تو ہو نہیں سکا تھا آج تک..... فجر کی نماز اکثر نیند کی نذر ہو جاتی تھی اور عشا کی کسی نہ کسی مصروفیت کی..... لیکن اس دن اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ آئندہ وہ یہ دونوں نمازیں بھی ضرور پڑھے گا کہ انسان اور کچھ نہ کرے کم از کم فرض نمازوں کی پابندی تو ضرور کرے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان اگر کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ تو اس کی نیت کرلے، اس عمل کو کرنے کی تمنا دل میں رکھ لے..... ارادہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اسے اس عمل کی توفیق بھی عطا فرما دیتے ہیں۔

اس دن اس نے بھی سچے دل سے ارادہ کیا تھا..... تمنا کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اسے توفیق عطا فرما دی تھی..... اس دن سے وہ پانچوں نمازوں کی پابندی کرنے لگا تھا۔

"سلام صاب..... بڑے دناں بعد صورت وکھائی تسی....." ہوٹل کی جانب بڑھتے ہی فضل دین لپک کر اس کے قریب آیا تھا۔

"ہاں پچھلے ماہ امی، ابا سرگودھا آگئے تھے..... اس لیے میرا چکر نہیں لگا۔" مصافحہ کرتے ہوئے اس نے حال احوال پوچھا نیم کے درخت کے پاس چلا آیا تھا جہاں اس کے پہنچنے سے پہلے ہی میز اور کرسی رکھی جا چکی تھی۔

"کیسے ہو چھوٹو.....؟"

"ٹھیک ہوں صاب..... آپ بوہت دنوں بعد آئے..... ابھی بھا فضل آپ کا ذکر کر رہے تھے۔"

ثقلین نے مڑ کر فضل دین کی جانب دیکھا۔

مٹیالے سے رنگ کے لیکن صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس، کندھے پر سرخ رومال ڈالے وہ تیز، تیز ہاتھوں سے کیتلی دھو رہا تھا۔

چند لمحے ثقلین مسکراتے ہوئے اس کو دیکھتا رہا پھر اچٹتی سی نگاہ اطراف میں دوڑائی تھی۔ ہر طرف لوگ کچھ نہ کچھ کھاتے پینے میں مصروف تھے۔ اچانک اس کی توجہ اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے دو بچوں کی جانب مبذول ہوئی اور پھر ان ہی پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔

دونوں بچے گدڑی میں لعل کی عملی مثال تھے، بدرنگ سے کپڑے اور خستہ حال جوتے پہنے وہ یوں توجہ کھینچ رہے تھے جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔

لڑکی کچھ توڑ رہی تھی اور لڑکا بے صبری سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اب میرا بادام توڑ دو ناں.....!" لڑکی چن، چن کر کچھ ہاتھ پر رکھنے لگی تو لڑکے نے بے تابی سے کہا۔

ثقلین کا اندازہ ٹھیک تھا کہ وہ بادام توڑ رہے تھے۔

لڑکی نے اس کی ہتھیلی پر رکھے بادام کو اٹھایا..... توڑا اور گری نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"میں کہہ رہا تھا ناں..... میرا بادام اچھا ہے..... دیکھا گری نہیں ٹوٹی ناں....."

خوشی سے کھلکھلاتے لہجے میں کہتے ہوئے لڑکے نے گری منہ میں رکھی تھی اور منہ چلاتے ہی خوشی سے جگمگاتا اس کا چہرہ یک دم عجیب، عجیب زاویے بنانے لگا تھا۔

"کیا ہوا..... بادام کڑوا نکلا.....؟"

لڑکی کا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ لڑکا برا سا منہ بناتا بھاگ کر ایک طرف گیا تھا۔ "آخ تھو" کی آواز کے

اور جانے کیا ہوا تھا کہ ثقلین کی نگاہوں کے سامنے ایک دم سے ایمن کا چہرہ آ گیا تھا۔ بے حد دلکش، بے حد خوب صورت لیکن...... بجھا، بجھا سا چہرہ...... اس کا دل اداسی کے گہرے گرداب میں ڈوبا تھا چہرے پر چھائی سنجیدگی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔

وہ بھی تو اس کے لیے ایسا ہی کڑوا بادام ثابت ہوئی تھی۔ کڑوا، کسیلا، اندر اور باہر کے سارے ذائقوں کو تلخ کر دینے والا......

☆☆☆

ایمن اس کی دور پرے کی خالہ کی بیٹی تھی۔ وہ لوگ لاہور میں رہتے تھے، ثقلین نے اسے دو چار رشتے داروں کے ہاں کسی نہ کسی کی شادی پر دیکھا تھا۔ وہ اسے اچھی لگی تھی۔ ایک بار اسے دیکھ کر بار، بار دیکھنے کو دل چاہتا تھا لیکن ثقلین نے اپنے دل کو ڈپٹ دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کسی سے منسوب تھی۔

لیکن پھر عجیب اتفاق ہوا۔

اس کے وہ جذبے رنگ لائے جنہیں وہ خود سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا یا پھر وہ ازل سے ہی اس کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔

شادی سے صرف چند روز قبل ایمن کے والد اور چچا کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ یہ رشتہ ختم ہو گیا۔

ثقلین کی جیسے مراد بر آئی۔

لیکن دلہن بنی ایمن پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ جیک اپ سے سجا سنورا لیکن بجھا، بجھا چہرہ...... شرمائی نہیں کترائی نگاہیں...... ثقلین کے دل میں جیسے کوئی کانٹا سا چبھا۔ جس کی چبھن نے اس کے پورے وجود کو بے کل کر دیا اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ چبھن اور بے کلی بڑھتی ہی گئی...... کم ہو کر نہ دی۔

اب تو کبھی، کبھی دل کی اس بے کلی سے تنگ آ کر وہ سوچتا تھا کہ اس نے آخر کیوں ایمن سے شادی کر لی۔ یہ کیوں نہیں سوچا کہ چار سال ایک لڑکے کے ساتھ اس کی منگنی رہی ہے اس نے اپنی زندگی کے سارے خواب تو اس کے ساتھ بُنے ہوں گے۔ اب وہ اس کے ساتھ کیسے خوش رہے گی۔

لیکن وہ تو یہ جان کر ہی مطمئن ہو گیا تھا کہ ایمن کا ہونے والا سسرال کراچی میں تھا اور چار سال منگنی کے دورانیے میں ان کی فیملی صرف ایک بار کسی شادی میں شرکت کرنے لاہور آئی تھی وہ بھی صرف دو دن کے لیے...... اس کی معلومات کے مطابق فون پر بھی دونوں کا رابطہ نہیں تھا...... لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جذبے رابطوں کے محتاج ہوتے ہیں نہ واسطوں کے...... نہ ہی فاصلے ان کے لیے کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔

اب جب یہ حقیقت اسے سمجھ میں آئی تھی تو اسے پانے کی ساری خوشی جاتی رہی تھی۔ دونوں ہی اپنی ہی سوچوں اور خیالات کی ناؤ پر بہتے پھیکی اور بے کیف زندگی گزار رہے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لی تھی اور پراگندہ سوچوں کو جھٹکتے ہوئے اپنی توجہ بچوں کی جانب مبذول کر دی۔

”تمہارا بادام تو میٹھا تھا...... میرا بادام کیوں کڑوا نکلا؟“ روہانسے لہجے میں کہتا قمیص کے دامن سے زبان صاف کرتا وہ بچہ جیسے رو دینے کو تھا۔

ثقلین کا دل ہی نہیں پورا وجود شدید اضطراب کا شکار ہوا تھا۔

وہ تیزی سے اٹھا اور بچوں کی جانب بڑھا۔

وہ اپنی رگوں میں سرایت کرتی اور زندگی کو بے کیف کرتی تلخی کو تو ختم کر دینے پر قادر نہیں تھا۔ مگر اس بچے کے حلق کی کڑواہٹ کو دور کر سکتا تھا اور اس نے یہی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

”قمیص سے منہ صاف نہیں کرتے بیٹا......“ پاس پہنچ کر اس نے نرمی سے بچے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے فوراً قمیص چھوڑ دی تھی۔

”میٹھے بادام کھاؤ گے؟“ اس نے نرمی سے بچے کے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

”ممی...... ابا مارے گا۔“ لڑکی نے جلدی سے کہتے ہوئے بھائی کا ہاتھ تھاما۔ ثقلین مسکرا دیا۔

"ابا کہاں ہیں؟ ان سے بات کر لیتے ہیں۔"

"وہ....." بچے نے تیزی سے انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مبادا وہ اپنا ارادہ بدل دے۔

"تم لوگ اپنے ابا کے پاس چلو، میں میٹھے بادام لے کر آتا ہوں۔" نرمی سے کہتے ہوئے شفقین نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔

پرانے لیکن صاف ستھرے کپڑے پہنے وہ ایک... سانولا سا آدمی تھا جس کے چہرے پر ایک عجیب سی بیچارگی نظر آ رہی تھی۔ شاید غربت و افلاس کی بھٹی میں جھلستے ہوئے چہرے یونہی مسکین سے نظر آنے لگتے ہیں۔

☆☆☆

گاڑی سے باداموں کا پیکٹ نکال کر ملائمت سے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے ماں، باپ کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ واپس پلٹتے ہوئے اس نے دیکھا کہ دونوں بچے منتظر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے..... ان کے چہرے پر چمکتی خوشی اتنی دور سے بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

ان باداموں نے اس کے دماغ اور آنکھوں کو تو روشن کرنا تھا یا نہیں لیکن یہ ان دونوں معصوم چہروں کو ضرور روشن کر رہے تھے اور ان کے چہروں کی جگر، جگر کرتی روشنی کو دیکھتے ہوئے بہت سارے دنوں کے بعد شفقین کے دل کو خوشی کے احساس نے چھوا تھا۔

☆☆☆

"یہ تمہارے میٹھے بادام....."

"اتنے سارے..... سب..... ہم..... میرے ہیں۔" کبھی شفقین کو اور کبھی باداموں کو دیکھتے ہوئے وہ ہکلایا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں دمک رہی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔

"ہاں..... سب تمہارے اور تمہاری بہن کے ہیں۔"

"سچ.....؟"

"سچ....." شفقت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے بچے کا رخسار تھپتھپایا تھا۔

"بہت، بہت مہربانی صاحب....." بچوں کے والد نے کہا۔ احسان مندی اور ممنونیت اس کے لہجے سے

ان تینوں کے چہرے سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہ فضل دین کے چہرے پر گئی تھی۔ اس کا چہرہ بھی خوشی سے جگمگا رہا تھا۔

☆☆☆

"شفقین صاب دل خوش کردتا اے تسی انہاں معصوماں دے کوڑے بادام مٹھے کر کے..... اللہ سوہنا تہاڈی حیاتی دے ہر کوڑے بادام نوں وی انج ای مٹھا کرے۔"

شفقین نے بری طرح چونک کر اس کی جانب دیکھا..... اس کی آنکھوں سے چھلکتی محبت و عقیدت اور لہجے سے عیاں خلوص و اپنائیت نے اسے نہیں چونکایا تھا بلکہ اسے چونکانے کا سبب اس کے الفاظ تھے۔

"تہاڈی حیاتی دے کوڑے بادام....." کیا وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی میں بھی کوئی کڑواہٹ تھی؟ وہ حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ تبھی اس کے موبائل کی میسج ٹیپ بجی تھی اور اس کی سوچ کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔

اس نے ہاتھ میں تھاما موبائل سیدھا کرتے ہوئے اسکرین پر نگاہ ڈالی تھی اور اس پھر اس کی نگاہیں لفظوں پر جم کر رہ گئی تھیں۔

"صبح سے کوئی ٹیکسٹ نہ کال..... مانا کہ زبردستی مسلط کر دی گئی ہوں آپ پر..... لیکن اب تو آپ کی بیوی ہوں..... اتنا تو حق رکھتی ہوں کہ خیریت کی اطلاع ہی دے دیں۔"

کیا واقعی اس ٹیکسٹ کا وہی مطلب تھا جو وہ سمجھا تھا اس نے جلدی سے دوبارہ ٹیکسٹ پڑھا تھا۔ اور دل نے ... بے یقینی سے یقین کا سفر پل میں طے کر لیا تھا۔ حیرت مسرت میں بدلی تو چہرے پر اتنے رنگ بکھرے کہ فضل دین کہہ اٹھا۔

"لگدا اے صاب کوئی خوشی دی خبر سنی اے تسی....."

"ہاں فضل دین..... بہت بڑی خوشی ملی ہے مجھے..... دیکھو ذرا ہمارا رب کتنا رحیم ہے..... اپنے بندوں سے بھلائی اسے اس قدر بھاتی ہے کہ اجر عطا فرمانے میں لمحہ بھی نہیں لگتا۔" تشکر سے لبریز لہجے میں کہتے ہوئے شفقین نے ایک انوکھی سی طمانیت کو رگ و پے میں اترتے محسوس کیا تھا۔

ناولٹ

بامِ مراد

نسرین اختر نینا

پانچ بچوں پر مشتمل اس بھرے پُرے کنبے میں دیا سب سے بڑی بچی تھی۔ یہ کنبہ اگر بہت زیادہ خوشحال نہیں تھا تو تنگ دست بھی نہیں تھا۔ والد ایک سرکاری محکمے میں اوسط درجے کی پوسٹ پر تھے۔ شکر ہے گھر سرکاری ملا ہوا تھا۔ تنخواہ اور اوور ٹائم لگا کر وہ اتنا کما لیتے تھے کہ گھر کے اور بچوں کی تعلیم کے اخراجات بخوبی پورے ہو جاتے تھے۔ چنانچہ کبھی انہیں کسی مالی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بچے سرکاری اسکولوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ خود ہی مل جل کر پڑھ لیتے تھے۔ کبھی ٹیوشن وغیرہ کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی۔

دیا سب سے بڑی تھی سو چھوٹی عمر میں ہی سمجھ دار ہو گئی تھی۔ ماں سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں وہ سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتیں۔

دیا کو اس بات کا احساس تھا اس لیے چھوٹی سی عمر ہی میں وہ ماں کا گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ پھر جوں، جوں بڑی ہوتی گئی بہن، بھائیوں کی چھوٹی، چھوٹی ذمے داریاں بھی نبھانا شروع کر دیں۔ جن میں ان کے کپڑے استری کرنا، انہیں ہوم ورک کروانا، صبح اسکول کے لیے تیار ہونے میں مدد دینا وغیرہ..... بہرحال دیا کی کوششوں سے سبھی بچے اس قابل ہو رہے تھے کہ امتحان آرام سے پاس کر لیتے تھے۔

والدین نے بھی جب یہ دیکھا کہ ان کی بیٹی نے بارہ سال کی عمر میں چھوٹے بہن، بھائیوں کی ذمے داریوں میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا ہے تو وہ بھی قدرے مطمئن ہو گئے..... اور یوں ہی وقت گزرتا گیا۔ دیا کو ایم اے کر کے لیکچرر بننے کا شوق تھا مگر گھر

کے حالات کی وجہ سے وہ یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے سکی۔ اس لیے انٹر کے بعد پرائیویٹ بی اے کیا اور ایک نزدیکی اسکول میں پڑھانا شروع کردیا۔ اور ساتھ، ساتھ پرائیویٹ طور پر ایم اے اردو کی تیاری بھی شروع کردی۔ دیا گھر اور ملازمت کی ذمے داریوں کے سلسلے میں گھن چکر بن کر رہ گئی تھی۔

وہ تو اپنی دانست میں اپنے والدین کا بیٹا ہی بنی ہوئی تھی..... اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک اس کی دونوں بہنوں کی شادیاں نہیں ہوجاتیں اور بھائی پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوجاتے وہ اپنے بارے میں سوچے گی بھی نہیں۔ اس کے بھائی، بہن والدین سے زیادہ اس سے بے تکلف تھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ دیا سے ہی فرمائشیں کرتے..... بھائی، بہنوں کی بڑھتی ہوئی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اس نے اسکول سے آکر گھر میں ٹیوشنز بھی دینی شروع کردی تھیں۔ اس طرح اس کا ایم اے کرنے اور لیکچرر بننے کا خواب بھی ادھورا رہ گیا کیونکہ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی پڑھائی کرپاتی۔ وہ والدین کو دیکھتی کہ وہ اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کی تگ ودو میں بہت جلد بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ چکے ہیں تو اسے اور زیادہ دکھ ہوتا..... والد پچاس سال کی عمر ہی میں انتہائی لاغر اور اپنی عمر سے بہت بڑے لگنے لگے تھے۔ شدید محنت کی وجہ سے انہیں شوگر اور بلڈ پریشر کے عارضے لاحق ہوگئے تھے۔ والدہ دمے کی مریضہ بن گئی تھیں۔ تھوڑا سا کام کرنے کے بعد ہانپ جاتیں..... سانس پھولنے لگتی تو پھر بیچاری دیا اسکول سے آکر گھر کے سارے کام کاج بھی خود ہی کرنے لگتی۔ ماں، دیا کو اتنی محنت کرتے دیکھ کر کڑھتی رہتیں اور اس کے اچھے نصیبوں کی دعائیں کرتی رہتیں۔

اس روز بھی اسے ٹیوشن پڑھا کر فارغ دیکھا تو اس کے پاس ہی آبیٹھیں۔

"ایک تو بیٹا میں پڑھی لکھی نہیں پھر سلائی، کڑھائی کا کام بھی خاص نہیں آتا۔ ورنہ تمہیں کبھی اتنی

چھوٹی عمر میں، میں ملازمت کے چکر میں نہ پڑنے دیتی۔ بی اے کے بعد تمہاری فوری شادی کر دیتی۔ تب کتنے ہی رشتے آرہے تھے اب تو جو کوئی رشتہ آتا ہے وہ چھوٹی لڑکیوں کو ہی پسند کر لیتا ہے۔'' امی نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔

''تو اچھا ہے ناں امی..... اب تو دعا کی عمر بھی شادی والی ہو گئی ہے۔ اس کے ایم کے فائنل میں چند ماہ ہی رہ گئے ہیں، اس کے لیے کوئی بھی مناسب رشتہ دیکھ کر منگنی کر دیں بس امتحان کے فوراً بعد اس کی شادی کر دیں گے۔'' دیا نے رسان سے ماں سے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، دیا بیٹی..... تم بڑی ہو پہلے تمہارا رشتہ ہوگا پھر کسی اور کا..... یہ تو مناسب نہیں ہے کہ بڑی بیٹھی رہے اور چھوٹی لڑکیوں کو بیاہ دیں..... میں تو کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتی۔ تمہارا یوں ہر وقت محنت مشقت کرنا تمہارے ابا کے لیے بھی بے حد اذیت ناک ہے..... وہ تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچ، سوچ کر پریشان رہتے ہیں۔ ستائیس سال تمہاری عمر ہو چکی ہے..... اور دو تین سال گزر گئے تو پھر تو کوئی بھی مناسب رشتہ نہیں ملے گا۔'' اتنی سی بات کرتے ہوئے ہی امی ہانپنے لگی تھیں..... اور انہیں کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ دیا نے انہیں پانی پلایا اور انہیں آرام سے بیڈ پر لٹا دیا۔ اور پھر ان کے بال سہلاتے ہوئے بولی۔

''امی میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ ایک تو آپ زیادہ فکرمند نہ ہوا کریں..... دوسرے اپنے آرام کا خیال رکھا کریں..... یہ سانس کی بیماری بہت خطرناک ہوتی ہے۔''

''خیال تو رکھتی ہوں بیٹا بہت..... مگر کیا کروں پریشان نہ ہونا اپنے بس میں تو نہیں ہے ناں.....'' امی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''مگر یوں فکریں پالنے سے بھی تو مسائل حل نہیں ہوا کرتے ہیں..... وقت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ انسان کو اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ وہ ہی سب کا پیدا کرنے والا ہے اور مصیبت اور دکھ سے نجات دینے والا ہے۔ انسان کا کام بس کوشش کرنا ہوتا ہے۔ نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے جو اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ وہ بھلا کیسے اپنے بندوں کو تنہا چھوڑ سکتا ہے۔'' دیا کسی بڑی بوڑھی کی طرح ماں کو سمجھا رہی تھی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو میری بچی..... اللہ تعالیٰ بہت عظیم ہے..... ہم انسان ہی کمزور اور ناشکرے ہیں اور اپنے ربِ کریم کی عنایات کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے ذرا سی مصیبت پر شکوے شکایت اور واویلا کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔''

''جی امی آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔'' اس نے ماں کے ماتھے کو چومتے ہوئے کہا۔

''بیٹا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' امی بولیں۔

''کس بات کا امی.....؟'' دیا نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ میں دعا اور ایمان سے پہلے تمہارا رشتہ کرنا چاہتی ہوں۔'' امی کی بات پر وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

''امی آپ اچھی طرح جانتی ہیں ناں کہ میرے اندر ایک ایسا میڈیکل پرابلم ہے کہ میں ماں بننے کا رسک نہیں لے سکتی اور جو بھی مجھ سے شادی کرے گا وہ تو یہی چاہے گا کہ میں اس کے بچوں کو جنم دوں..... اور جب اصل حقیقت بتا کر کسی سے شادی کرنا چاہوں گی تو ایک ادھوری عورت کو کون اپنانا چاہے گا۔'' آج اس نے..... برسوں بعد اپنی ایک جسمانی خامی کا تذکرہ کیا تھا کہ جس پر اس نے بات کرنا چھوڑ دیا تھی۔ جس وقت لیڈی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ یہ ماں کبھی نہیں بن سکے گی تو اس نے اپنی شادی کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ امی بھی کبھی بات کرتیں تو وہ انہیں خاموش کرا دیتی کہ اس موضوع پر اب کبھی بات نہیں ہو گی مگر آج اتنے سالوں بعد امی نے ہی یہی موضوع چھیڑ دیا تھا۔

''بیٹی ہم تو جانتے ہیں کہ تمہارے ساتھ یہ مسئلہ ہے پر دنیا والے تو نہیں جانتے ناں، کئی عورتیں بانجھ

ہوتی ہیں پھر بھی ان کی شادی ہو جاتی ہے اور ان کے شوہر انہیں طلاق بھی نہیں دیتے اور دونوں بنسی خوشی اپنے گھروں میں آباد رہتے ہیں۔ میری خالہ زاد عاطفہ کی مثال سامنے موجود ہے۔۔۔ ساس نندوں کے لاکھ طعنوں اور اکبر بھائی کو دوسری شادی پر مجبور کرنے کے باوجود انہوں نے عاطفہ کو چھوڑنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اگر ان کی قسمت میں اولاد ہوئی تو اللہ تعالیٰ عاطفہ ہی سے دے دے گا۔ اب میں اولاد کی خاطر اس قدر چاہنے والی خدمت گزار بیوی کو دکھ نہیں کر سکتا تو جواب میں ماں، بہنیں تھک ہار کر خاموش ہو گئی تھیں۔"

"مگر امی عاطفہ آنٹی کا کیس دوسرا تھا۔ انہیں پہلے سے تو یہ علم نہیں تھا ناں کہ وہ بانجھ ہیں۔۔۔ یہ تو شادی کے بعد پتا چلا تھا مگر مجھے تو اپنے نقص کے بارے میں معلوم ہے بلکہ ڈاکٹرنی نے تو یہ بھی کہا تھا کہ اگر کبھی میری شادی ہونے بھی لگی تو پہلے مجھے اپنے ہونے والے شوہر کو اعتماد میں لے کر پوری بات بتا کر اپنا آپریشن کروانا پڑے گا۔۔۔ تاکہ ماں بننے کی نوبت ہی نہ آئے۔۔۔ ورنہ میری جان کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ بلکہ بچے کی پیدائش میری موت کا سبب ہو گی۔" دیا کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے امی خاموش ہو گئیں اور پھر کچھ سوچ کر بولیں۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری شادی کسی ایسے شخص سے کر دیں۔۔۔ جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہو یا طلاق شدہ ہو اور اس کے اپنے بچے ہوں۔۔۔ پھر تو وہ تم سے بچے نہیں چاہے گا ناں۔۔۔"

"ٹھیک ہے امی اگر کوئی ایسا فرشتہ سیرت شخص مل گیا تو میں فوراً شادی کر لوں گی مگر فی الحال آپ دعا اور ایمان کے لیے آنے والے رشتوں کو میری وجہ سے مسترد نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے میری بچی جو تم کہو ایسا ہی ہو گا۔۔۔ واقعی ان دونوں لڑکیوں کو تو اپنے گھروں کا کر دیں۔۔۔ کہیں ان کی عمریں بھی نہ نکل جائیں۔ اور ان کے رشتوں کے لیے مسئلہ ہو جائے۔" امی نے کہا اور پھر کچھ دیر بعد دونوں ماں، بیٹیاں سکون سے سو گئیں۔

اور پھر جلد ہی پہلے ایمان اور دعا کی شادیاں طے ہو گئیں۔ ایمان کو تو اس کے بینک ہی میں ایک کولیگ پسند کرتا تھا۔ اس لیے دونوں خاندانوں کی باہمی رضامندی سے یہ رشتہ ہو گیا جبکہ دعا کے لیے اس کی خالہ کے بیٹے ارمان کا رشتہ آ گیا۔ اصل میں تو خالہ پہلے دیا کو بہو بنانا چاہتی تھیں مگر ارمان کو شوخ و چنچل سی انتہائی خوب صورت دعا پسند تھی۔ اس لیے ماں کو بیٹے کی پسند کو قبول کرنا پڑا کہ شادی بیاہ کے لیے لڑکی اور لڑکے کی پسند کو اہمیت دینی پڑتی ہے۔ ورنہ جو والدین انا کا مسئلہ بنا کر بچوں پر اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں۔ تو۔۔۔ ان کے فیصلے پر یا تو بچے باغی ہو کر اپنی مرضی کرتے ہیں یا پھر مجبوراً اس زبردستی کے رشتے کو نبھاتے تو رہتے ہیں مگر خوش نہیں ہوتے۔۔۔ اور زندگی بھر ایسے جیون ساتھی کو بوجھ ہی تصور کرتے ہیں۔

ایک دن دیا اسکول سے آئی تو امی نے بتایا کہ اس کی دوست ڈاکٹر رافیہ کئی فون کر چکی ہے۔ دعا اسکول میں موبائل استعمال نہیں کرتی تھی تو دوست نے لینڈ لائن پر کالز کی تھیں۔ دیا نے فون ملایا۔

"ہیلو رانی کیسے یاد کر لیا آج اتنے دنوں بعد؟"

"میں تو پھر بھی یاد کر ہی لیتی ہوں اکثر مگر تم تو اتنی کنجوس ہو کہ کبھی خود سے فون ہی نہیں کرتیں جیسے تم سے زیادہ مصروف کوئی نہیں۔" رافیہ نے مسکراتے ہوئے گلہ کیا۔

"بھئی تم تو ٹھہریں ڈاکٹر۔۔۔ صبح اسپتال شام کو کلینک، سو تمہاری پانچوں گھی میں جبکہ ہم تو غریب سے اسکول ٹیچر ہیں سو موبائل کا بیلنس اتنا افورڈ نہیں کر سکتے۔۔۔" دیا نے قدرے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"اوہو کیا کہنے غریب ٹیچر صاحبہ کے۔۔۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو کل شام آ سکتی ہو میری طرف؟"

"کیوں بھئی۔۔۔ خیریت؟" دیا نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں بھئی خیریت ہی ہے وہ۔۔۔ وہ دراصل میں نے تمہیں بتایا تھا ناں ڈاکٹر عمیر کے

بچے پُراعتماد کیوں نہیں ہوتے

بچے ہوں یا بڑے زندگی کے میدان میں وہی افراد کامیاب رہتے ہیں جنہیں اپنی ذات اور صلاحیتوں پر اعتماد اور بھروسا ہو۔ بیش تر افراد میں ایسے رویّوں کی بنیاد بچپن میں پڑ جاتی ہے۔ گھر کا ماحول اور افراد کے رویّے بچے کی سوچ اور شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کے مطابق والدین بچے کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ والدین کی نکتہ چینی یا ان کی حوصلہ افزائی بچے کی شخصیت میں مثبت یا منفی تبدیلی لاسکتی ہے۔

اگر بچہ ایسے کسی خوف کا شکار بھی ہو تو والدین کو سمجھانا چاہیے کہ آپ وہی کریں جسے آپ کی عقل تسلیم کرتی ہے اور یقین رکھیں کہ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ہر ایک اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ دوسرے کی ذات کا جائزہ لینے میں اپنا وقت صرف کرے۔ شاید آپ کو یہ باتیں مناسب نہ لگیں لیکن ٹین ایج بچوں کو سمجھانے کے لیے یہ انداز خاصا فائدہ مند ثابت ہوتا ہے اور وہ اپنی سوچ کے حصار سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اس طرح بہت موٹے یا بہت دبلے پتلے یا زیادہ لمبے قد یا بہت چھوٹے قد والے بچے بھی عموماً احساسِ کمتری کا شکار رہتے ہیں۔ خصوصاً جب ہم جماعت یا دوست وغیرہ ان کا مذاق اڑاتے یا کسی طنزیہ نام سے پکارتے ہیں تو ان کا

بارے میں تو کل شام کو وہ اپنے ایک دوست اور اس کی والدہ کے ہمراہ آرہے..... چونکہ عمیر کے والدین تو حیات نہیں ہیں۔ ان کے دو بھائی ہیں جو بیرون ملک ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنے دوست کی والدہ کو لے کر آرہے ہیں جو انہیں حقیقی بیٹوں ہی کی طرح چاہتی ہیں۔" رافیہ نے گہری سانس لے کر اپنی بات مکمل کی۔

"واؤ..... مبارک ہو..... میں ضرور آؤں گی..... بہت خوشی کی بات ہے..... اللہ تمہیں اور عمیر بھائی کو ہمیشہ خوش رکھے۔" دیا نے خلوص سے کہا۔

"تھینک یو..... دیا پلیز ضرور آنا..... تم تو جانتی ہو کہ میری کوئی بہن نہیں، بھائی کی ابھی شادی نہیں ہوئی..... اور امی ایسے موقع پر بری طرح نروس ہو جاتی ہیں اور ساتھ میں مجھے بھی بوکھلا دیتی ہیں۔ دراصل انہیں میری بڑھتی عمر کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ اتنے رشتے آئے مگر کسی نہ کسی وجہ سے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اور عمیر کو تو چند ماہ ہی ہوئے اس اسپتال میں آئے ہوئے اور اتنی مختصر مدت ہی میں ہماری انڈر اسٹینڈنگ اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ عمیر نے خود ہی مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کر دیا تو میں نے انہیں صاف کہہ دیا کہ

رضامندی ہی میری رضامندی ہوگی۔" ایک قابل ڈاکٹر ہونے کے باوجود رافیہ ماں کی مرضی پر چلتی تھی۔

"تم فکر نہ کرو رافی میں ضرور آؤں گی۔ اچھا اللہ حافظ....."

"اللہ حافظ....." رافیہ نے کہا اور پھر کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

دوسرے دن دیا اسکول سے واپس آکر اچھی طرح تیار ہوئی۔ اور ڈاکٹر رافیہ کے گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

دس مرلے پر خوب صورت ڈیزائن کا ڈبل اسٹوری بنگلا صاف ستھرے علاقے میں تھا۔ یہ گھر رافیہ کے والد نے بہت عرصے قبل سستے داموں خریدے ہوئے پلاٹ پر اپنی پینشن۔ کمیوٹ کروا کر اور جی پی فنڈ کے پیسوں سے تعمیر کروایا تھا بلکہ ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن سے بھی قرضہ لینا پڑا تھا جس کی قسطیں وہ ابھی تک اپنی پینشن سے ادا کر رہے تھے۔ گھر چونکہ کارنر پلاٹ پر بنا ہوا تھا اس لیے دوسرا گیٹ سائڈ والی گلی میں تھا۔ اور اوپر والا پورشن کرایے پر چڑھا دیا تھا۔

دیا اندر لاؤنج میں آئی تو سامنے دیوار کے ساتھ پڑے کاؤچ پر رافیہ کے والد عتیق صاحب گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہے تھے جبکہ رافیہ کی امی ثمینہ

خوف، الجھنیں اور پریشانیاں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ ان کو کسی کا بھی سامنا کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں والدین ہی بچے کو اس احساس کمتری سے باہر نکال سکتے ہیں۔

بچے کا احساس کمتری ختم کرنے اور اس میں اعتماد پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس سے اصرار کیا جائے وہ اپنے اسکول، کالج، محلے، ریڈیو یا ٹی وی کے چینل پر ہونے والے حسن قرأت کے مقابلوں، نعتیہ اور تقریری مقابلوں، ذہنی آزمائش کے پروگراموں وغیرہ میں ضرور حصہ لے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ بچہ مجمع کے سامنے پیش ہونے کے خوف پر قابو پالے اور اس میں اگر آپ کی حوصلہ افزائی بھی شامل رہے تو فتح کی صورت میں حاضرین کی طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں، دوستوں کے تعریفی کلمات اور والدین کے خوشی سے دمکتے چہرے بچے کی زندگی میں ایک ایسا اہم موڑ ثابت ہوتے ہیں لیکن بالفرض اگر وہ مقابلہ نہیں جیت پاتا یا کوئی پوزیشن نہیں لیتا تب بھی والدین کو اس کی حوصلہ افزائی ضرور کرنی چاہیے تاکہ وہ اگلے کسی اور مقابلے میں زیادہ اعتماد کے ساتھ شریک ہو سکے۔ غرض ان باتوں پر عمل کر کے والدین کسی بھی شرمیلے اور احساس کمتری کے شکار بچے میں حوصلہ، جرأت اور خود اعتمادی پیدا کر سکتے ہیں اور اس طرح اس کو کامیابیوں کی راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔

مرسلہ حلیمہ، کراچی

بیگم کاؤچ کے دائیں طرف رکھے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ دونوں نہایت سنجیدگی سے رافیہ کے لیے آنے والے رشتے ہی کو ڈسکس کر رہے تھے۔

''السلام علیکم انکل جی اور آنٹی جی.....'' دیا نے ان کے قریب جا کر سلام کیا تو ثمینہ آنٹی فوراً کھڑی ہو گئیں اور انہوں نے نہایت تپاک سے اسے گلے لگایا پھر پیشانی پر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو دیا بیٹی..... بڑے عرصے بعد چکر لگایا تم نے؟'' وہ بہت پیار سے اس سے اس کی گھر والوں کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔

انکل آنٹی دونوں سے سلام دعا کر کے حال احوال دریافت کر کے وہ رافیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو رافیہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے نیم دراز تھی۔ سامنے ہی کرسی پر ہلکے فیروزی رنگ کا خوب صورت کام والا جارجٹ کا سوٹ استری شدہ پڑا تھا غالباً کپڑے پریس کرنے کے بعد کچھ دیر کے لیے وہ ریسٹ کر رہی تھی۔ یہ اس کی ہمیشہ کی عادت تھی، تھی تو وہ ڈاکٹر مگر اس قدر نرم و نازک تھی کہ تھوڑا سا کام کرنے کے بعد ہی اس پر تھکان حاوی ہو جاتی تھی..... اور جب تک وہ کام ختم کر کے چند لمحات کے لیے آرام نہیں کر لیتی تھی اس کی توانائی بحال نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اسکول میں کھیلتے کھیلتے بھی اچانک کھیل چھوڑ کر قریبی گراسی پلاٹ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتی تھی ویسے وہ تھی بہت محنتی پر امتحان میں ٹاپ کرنا اس کا طرۂ امتیاز تھا..... میٹرک تک وہ اور دیا ایک ہی اسکول میں زیر تعلیم رہی تھیں۔ پھر دونوں کی فیلڈ مختلف ہو گئی تھی سو کالج بھی مختلف ہو گئے۔

آج رافیہ ایک ماہر معالج تھی اور ڈاکٹر عمیر بھی بے حد قابل سرجن تھے..... انہوں نے رافیہ کی عام سی شکل و صورت کے بجائے اس کی قابلیت کو پسند کیا تھا..... اور یہ بات رافیہ کے لیے ایک اعزاز کی بات تھی دیا۔ رافیہ کے کمرے میں کھڑی اس کے کمزور سے سراپے کو تکتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کمزور دبلی پتلی بونے سے قد کی سانولی لڑکی کے اندر فولاد جیسی خود اعتمادی تھی تبھی تو جو چاہتی تھی حاصل کر لیتی تھی اور ایک دیا تھی جو ہمیشہ محرومیوں ہی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ اسے اکثر ہی رافیہ پر رشک آتا تھا رافیہ کو یوں سکون سے آنکھیں بند کیے دیکھ کر دیا کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اسے ڈسٹرب کرے کہ اچانک رافیہ نے آنکھیں وا کیں..... اس کے صبیح چہرے پر سب سے زیادہ خوب

صورت آنکھیں ہی تھیں۔ گہری سیاہ بڑی، بڑی آنکھیں جن سے عجیب قسم کی مقناطیسی لہریں نکلتی محسوس ہوتی تھیں جو سامنے والے کو سسرائز کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ شاید انہی آنکھوں نے ڈاکٹر عمیر کو اپنا اسیر کرلیا تھا۔ دیا نے سوچا تھا۔

''ارے تم آگئیں...... اُف کس قدر خوب صورت لگ رہی ہو تم دیا...... اگر عمیر سے میری کٹ منٹ نہ ہوتی تو میں کبھی تمہیں اس کے سامنے جانے نہ دیتی کہ کہیں وہ تمہیں ہی پسند نہ کرلے۔'' رافیہ نے بیڈ سے اتر کر آگے بڑھ کر دیا کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''ڈونٹ وری ڈیئر تمہاری ان قاتل آنکھوں کا جو اسیر ہو جائے ناں پھر وہ کسی جوگا نہیں رہتا۔'' دیا نے مسکرا کر کہا۔

''اور ہاں...... دلہن صاحبہ ابھی تیار ہی نہیں ہوئیں...... ان لوگوں کے آنے میں صرف آدھا گھنٹا رہ گیا ہے۔ اور ابھی چائے وغیرہ کا بھی بندوبست کرنا ہے۔'' دیا نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

''ڈونٹ وری ڈیئر فرینڈ...... وغیرہ، وغیرہ کا بندوبست ہو چکا ہے۔ البتہ چائے بنانی ہے وہ چند منٹ میں بن جائے گی...... تمہیں میں نے کسی کام کاج کے لیے نہیں بلایا بلکہ مورل سپورٹ کے لیے بلایا ہے۔ اور ہاں ممکن ہے تمہاری یہ سج دھج بھی کسی کام آجائے کہ خیر سے عمیر کے دوست ڈاکٹر سرمد بھی آج کل اپنے لیے دلہن کی تلاش میں اور ان کی والدہ صاحبہ بھی ساتھ تشریف لا رہی ہیں...... اور تمہیں پہلی نظر میں انہوں نے پسند نہ کرلیا تو میرا نام بدل دینا۔'' رافیہ نے شوخ لہجے میں کہا۔

''اچھا...... اچھا پہلے خود تو ٹھکانے لگو پھر دوسروں کے بارے میں سوچنا، چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ...... میں ذرا کچن میں جا کر دیکھوں کہ تم نے اپنے ان نشتر پکڑنے والے ہاتھوں سے کیا، کیا تیار کیا ہے۔'' دیا نے کہا۔

''...... نشتر ہم نہیں پکڑتی بلکہ عمیر صاحب

پکڑتے ہیں۔ اور ہاں ان کی زبان بھی کسی نشتر سے کم نہیں ہے۔'' رافیہ نے قدرے متفکر لہجے میں کہا۔

''ہائیں کیا واقعی......؟ تمہیں کیسے پتا چلا...... کیا تم پر ابھی سے زبان کے نشتر چلانے لگے۔'' دیا نے گھبرا کر پوچھا۔

''ارے نہیں، مجھ پر تو نہیں البتہ لوئر اسٹاف کی شامت آئی رہتی ہے۔ آئے روز موصوف کی شکایات ایم ایس تک پہنچتی رہتی ہیں۔''

''اوہ...... اچھا...... ظاہر ہے غلطی پر تو ڈانٹنا ہی پڑتا ہے...... ڈونٹ یو وری......'' دیا نے اطمینان سے کہا۔ پھر اسے دھکیلتے ہوئے بولی۔

''خیر چھوڑو ان باتوں کو تم جلدی سے چینج کر کے نک سک سے درست ہو جاؤ۔'' اور پھر وہ کمرے میں رکی نہیں...... آنٹی کے ساتھ چائے کے انتظامات کرنے لگی۔

ٹھیک شام چھ بجے مہمان آگئے تھے۔ دیا نے آنٹی انکل اور سمیر کے ساتھ گیٹ پر ہی ان کا استقبال کیا اور سب ڈرائنگ روم میں آگئے۔ سب سے علیک سلیک کے بعد آنٹی نے دیا کا تعارف کروایا۔

''یہ دیا ہے، رافیہ کی بے حد پیاری دوست بلکہ بہن ہی سمجھیے کہ دونوں بچپن ہی سے ایک ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی ہیں۔'' اس پر انتہائی ہینڈسم چھ فٹ کے عمیر نے گہری نظروں سے دیا کا سراپا جانچا اور پھر رخ موڑ لیا...... جبکہ اس کے ساتھ آنے والے اس کے دبلے پتلے درمیانی قامت کے گہرے سانولے رنگ کے عام سے نین نقش والے دوست ڈاکٹر سرمد نے بڑی خوشدلی سے کہا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی...... آپ بھی ڈاکٹر ہیں کیا؟''

''نن...... نہیں...... میں...... اسکول ٹیچر ہوں......'' دیا نے متانت سے عمیر کی بولتی ہوئی خوب صورت آنکھوں کو نظر انداز کر کے ڈاکٹر سرمد سے کہا۔

''بڑی پیاری بچی ہے ماشاء اللہ......'' یہ کہہ کر سرمد کی باوقار سی والدہ مسز جلیل اکبر نے دیا کو اپنے

ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیے۔

''تھینک یو آنٹی آپ خود بھی بہت گریس فل ہیں۔'' دیا نے بھی نور ابدلہ چکا دیا۔

مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ وہیں کچن میں چلی گئی۔ اور جلدی، جلدی چائے کا پانی رکھا..... چائے کے لوازمات ایک ٹرالی میں پہلے ہی ڈھانپ کر رکھے ہوئے تھے۔ کافی چیزیں تھیں کیک، کباب، پیٹیز، بسکٹ اور کٹس وغیرہ..... دیا نے پیالے اور پلیٹیں، چمچ اور کانٹے وغیرہ بھی ٹرالی میں رکھے۔ اس اثنا میں چائے بھی تیار ہو گئی..... جو اس نے ٹی پاٹ میں ڈال کر اوپر خوب صورت سی ٹی کوزی رکھ دی۔

اور پھر ٹرالی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ کیونکہ رافیہ نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ روایتی لڑکیوں کی طرح چائے کی ٹرالی لے کر مہمانوں کے سامنے ہرگز نہیں جائے گی اور نہ ہی چائے سرو کرے گی۔ البتہ اس نے دیا سے سرپرائز کیا تھا کہ وہ اس کے بردکھوے کے موقع پر یہ خدمت بخوبی سرانجام دے دے گی۔ اس پر دیا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ کون سا اسے دیکھنے آئے تھے چنانچہ اس نے بڑے اعتماد سے سب کو پہلے پلیٹیں چمچ پیش کیں پھر چائے کے لوازمات سرو کیے..... اور تھوڑی دیر میں چائے کپس میں ڈال کر ان سب سے پوچھ کر چینی ڈالی اور کپس ان کے سامنے سینٹر ٹیبل اور سائڈ ٹیبلز پر رکھ دیے۔ اب وہ رافیہ کو بلانے اس کے کمرے میں آئی تھی۔

''ارے واہ..... میری پیاری رانی تو شہزادی لگ رہی ہے۔ ایسے ہی بنی سنوری رہا کرو ناں یہ کیا ہر وقت سر جھاڑ منہ پھاڑ پڑی رہتی ہو۔'' دیا نے ستائشی انداز میں کہا تو رافیہ قدرے شرما کر بولی۔

''جس نے پسند کرنا تھا وہ مجھے اسی سر جھاڑ منہ پھاڑ حلیے میں ہی پسند کر چکا ہے اس لیے مجھے کبھی زیادہ بننے سنورنے کی ضرورت نہیں پڑا کرے گی کہ وہ ظاہری خوب صورتی کے بجائے اندر کی خوب صورت کے قائل ہیں۔'' رافیہ کی بات سن کر دیا ایک لمحے کے لیے چپ سی ہو گئی۔ اور اسے عمیر کی کچھ کہتی ہوئی پُرکشش نگاہیں اپنی طرف متوجہ ہوتی ہوئی یاد آئیں..... اور اس کے دل سے دعا نکلی کہ خدا اس کی پیاری سی معصوم سی سادہ دل دوست کو سدا خوش رکھے۔ کیونکہ اسے تو عمر بھی عام مردوں کی طرح حسن پرست اور دل پھینک ہی محسوس ہوا تھا۔ مگر اپنی ذات اور کام میں منہمک رہنے والی رافیہ کو پتا نہیں کیوں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ رافیہ اور دیا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو عمر اور سرمد دونوں کھڑے ہو گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد پھر اپنی جگہوں پر بیٹھ کر جبکہ عمیر کی نگاہیں گاہے بہ گاہے دیا ہی کے حسین چہرے کا طواف کر رہی تھیں..... ہر وقت سادہ رہنے والی یا آج خصوصی طور پر تیار ہوئی تھی تو اس لیے وہ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ سرمد بھی اس میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا مگر دیا دونوں کی نظروں کو محسوس کرنے کے باوجود انجان بنی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد رافیہ ڈرائنگ روم سے چلی گئی تھی۔ دیا ملازمہ کے ساتھ مل کر چائے کے برتن وغیرہ سمیٹ کر کچن میں لے آئی۔ اور ملازمہ کو ہدایت کی کہ وہ اس کی اور رافیہ کی چائے بنا کر رافیہ کے کمرے ہی میں لے آئے۔

وہ کمرے میں آئی تو رافیہ کچھ اداس، اداس سی بیٹھی تھی۔

''کیا بات ہے..... میری گڑیا خوش نظر نہیں آ رہیں۔'' دیا نے رافیہ کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

''وہ..... دیا..... میری..... دوست..... میری پیاری بہنا..... میں..... میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' اور اتنا کہہ کر رافیہ نے دیا کے کندھے پر سر رکھ کر دھواں دھار رونا شروع کر دیا۔

''ارے..... ارے..... یہ..... یہ کیا بیوقوفی ہے، تم کوئی ٹین ایج بچی نہیں ہو۔ ماشاء اللہ اٹھائیس، تیس سال کی ایک میچور ڈاکٹر ہو، پھر یہ رونا دھونا کیسا؟''

''پتا نہیں کیوں..... دیا..... میرا یہ سوچ، سوچ کر ہی دل بیٹھا جا رہا ہے کہ میں، میں یہ گھر، اپنے

چاہنے والے والدین اور جان سے پیارے بھائی کو چھوڑ کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔" رانی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہش..... پگلی یہ وقت تو ہر لڑکی پر جلد یا بدیر آتا ہی ہوتا ہے..... ہم دونوں تو پھر بھی لکی ہیں کہ ہمیں اتنا عرصہ والدین کے پاس رہنے اور ان کی خدمت کرنے کا موقع مل گیا ہے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو....." یہ کہہ کر رافیہ نے اپنی انگلی کی پوروں سے اپنے آنسو خشک کیے..... دونوں دیر تک اپنے بچپن کی باتیں کرتی رہیں۔

☆☆☆

چند ماہ بعد ہی رافیہ کی شادی ہوگئی..... چونکہ عمیر کا تو اپنا کوئی گھر تھا نہیں وہ اسپتال کے ہاسٹل میں رہائش پزیر تھا۔ اس لیے کہ اس کا تعلق دور دراز کے ایک گاؤں سے تھا۔ اس لیے جب تک اسے اسپتال میں اسٹاف کے لیے بنے..... گھروں میں سے گھر نہیں مل جاتا تب تک وہ سرمد کے گھر کے اوپر والے پورشن میں شفٹ ہوگیا تھا۔ اوپر دو بیڈ روم، کچن، ایک لاؤنج اور ٹیرس وغیرہ تھا جو کہ دو افراد کی رہائش کے لیے کافی تھا۔ رافیہ شادی کے بعد رخصت ہو کر اسی گھر میں آئی تھی۔ نچلے پورشن میں سرمد اپنی والدہ، ایک مطلقہ بہن اور اس کے دو بچوں اور اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ سرمد کی دوران تعلیم ہی اپنی ایک کزن کے ساتھ شادی ہوگئی تھی جو دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت زچگی میں ہونے والی کسی پیچیدگی کی وجہ سے انتقال کر گئی تھی..... البتہ بچہ بچ گیا تھا۔ اب وہ بچہ چار سال کا تھا اور اس سے بڑا بچہ پانچ سال کا تھا۔

سرمد کی والدہ اور بہن بہت عرصے سے اس سے اصرار کر رہی تھیں کہ وہ دوسری شادی کر لے..... مگر وہ فی الحال شادی کے بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا بچوں کا تو اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ انہیں دادی اور پھوپی سنبھالتی تھیں۔ سرمد اب سوچ سمجھ کر کسی اچھی سی لڑکی سے اپنی پسند کے مطابق شادی کرنا چاہتا تھا۔

جب وہ عمیر کے ساتھ رافیہ کے گھر گیا تھا تو اسے بنی سنوری سوبرسی دیا بہت پسند آئی تھی۔ نہ صرف اسے بلکہ اس کی والدہ نے بھی دیا کو بغور دیکھا تھا..... وہ انہیں سرمد کے لیے ہر لحاظ سے مناسب لگی تھی۔ اور انہوں نے سرمد کو کہہ دیا تھا کہ اگر اسے دیا اچھی لگی ہے تو وہ شادی کے لیے اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرے۔

جب شادی کے بعد رافیہ، سرمد کے گھر کے اوپر کے پورشن ہی میں رہائش پزیر ہوگئی تو ایک دن جب وہ نیچے اس کی والدہ کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی تو سرمد نے فیصلہ کیا کہ وہ رافیہ بھابی سے اس کے سلسلے میں بات کرے گا۔ اس وقت اتفاق سے لاؤنج میں رافیہ اکیلے ہی بیٹھی تھی امی کچن میں تھیں جبھی سرمد نے موقع غنیمت جان کر جھجکتے ہوئے اپنا مدعا بتا دیا تھا۔

"رافیہ بھابی آپ سے ایک بات کرنی تھی؟"

"ہاں، ہاں کہیے..... سرمد بھائی۔" رافیہ نے مسکرا کر کہا۔

"وہ..... وہ..... دراصل میں آپ کی فرینڈ دیا کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔"

"او..... ہو..... تو یہ بات ہے۔" رافیہ نے شوخ لہجے میں کہا۔ تو اس پر سرمد نے بھی پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"جی..... یہی بات ہے۔"

"آہم..... تو پھر بتائیں کہ کیا جاننا چاہتے ہیں آپ دیا کے بارے میں؟"

"یہی کہ وہ کیسی ہیں، ان کی فیملی بیک گراؤنڈ وغیرہ....."

"سرمد بھائی اگر آپ واقعی دیا کے بارے میں سیریس ہیں تو آپ کا انتخاب بہت اچھا ہے..... وہ ہر لحاظ سے ایک سلجھی ہوئی اور مثالی لڑکی ہے..... پڑھی لکھی، باشعور اور سگھڑ..... ان کا تعلق ہمارے جیسے ہی درمیانے طبقے سے ہے۔ دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں، ایک بھائی کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا ہے، چھوٹا بھائی پڑھ رہا ہے جبکہ والد حال ہی میں ایک سرکاری محکمے سے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ریٹائرڈ

ہوئے ہیں اور اب میرے والدین کے گھر کے قریب ہی ان کا گھر زیر تعمیر ہے جس میں چند ماہ تک وہ لوگ شفٹ ہو جائیں گے۔ میری تو جیسے کہ حقیقی بہنوں جیسی ہے وہ اور بچپن سے لے کر اب تک ہم گہری دوستیں ہیں۔" رافیہ نے نہایت تفصیل سے دیا کا حدود اربعہ بتایا۔

"شکریہ بھابی..... ایک درخواست اور ہے کہ کیا آپ مجھے ان کا فون نمبر دے سکتی ہیں اور کیا وہ مجھ سے بات کرنا اور ملنا پسند کریں گی؟" سرمد نے پوچھا۔

"اصل میں وہ بہت لیے دیے رہنے والی لڑکی ہے۔ میں اس سے بات کروں گی، اگر وہ مان گئی تو ٹھیک ہے باقی آپ کی قسمت....." رافیہ نے ہنسی لبوں میں دبا کر کہا۔

"ایسا نہ کہیے بھابی..... میں۔ میں آپ کی فرینڈ کے لیے بے حد سیریس ہوں..... امی اور باجی بھی انہیں پسند کرتی ہیں امی تو اس وقت سے ہی انہیں پسند کر رہی ہیں جب انہوں نے انہیں آپ کے گھر میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا بلکہ انہوں نے ہی مجھے ان کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اور باجی سے ان کی آپ کی شادی پر ملاقات ہو گئی تھی تو وہ بھی ان کی پرسنلیٹی اور اخلاق سے متاثر ہوئی تھیں اور انہوں نے بھی او کے کر دیا تھا۔ اور اب وہ مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہیں کہ میں آپ سے بات کروں..... دراصل جب سے میری پہلی وائف کا انتقال ہوا ہے تب ہی سے امی کئی لڑکیاں دیکھ چکی ہیں مگر میں اب تک ٹالتا آیا ہوں۔ مگر اب محسوس ہو رہا ہے کہ مزید ٹالنا اس لیے مشکل ہے کہ دیا مجھے بھی بہت پسند آ گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے..... سرمد بھائی میں آج ہی دیا سے بات کروں گی اور جو بھی اس کا جواب ہوا آپ کو انفارم کر دوں گی۔" رافیہ نے سرمد کو تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"تھینک یو بھابی..... سو ناکس آف یو۔" سرمد نے کہا اور وہ پھر ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گیا اور رافیہ اوپر اپنے پورشن میں آ گئی کہ عمیر کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔

معلوم کی تو وہ بولی۔

"رافیہ میرا خیال ہے؟ کہ اب میری شادی کی عمر نہیں رہی۔ اور اب یہ شادی بیاہ کے بکھیڑوں میں پڑنے کا وقت نہیں رہا۔ چھوٹا بھائی ابھی پڑھ رہا ہے، ابا بیمار رہتے ہیں، وہ میری ذمے داری ہیں۔ اس لیے تم کسی طرح سرمد صاحب کو ٹال دو، یوں بھی تم میرا مسئلہ جانتی ہی ہو کہ میں ویسے بھی شادی نہیں کر سکتی۔" دیا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"میری عمر بھی تو تمہارے برابر ہی ہے، جب میں اب اس عمر میں شادی کر سکتی ہوں تو تم کیوں نہیں، عجیب بات کرتی ہو اور سرمد بھائی اور ان کی والدہ اور بہن بے حد اچھی ہیں، تمہیں کبھی کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہو گا سرمد بھائی کے اپنے دو بیٹے ہیں تو وہ تم سے کیوں بچوں کی خواہش کریں گے۔ تم شادی سے پہلے آپریشن کروا لینا پھر تو کوئی خطرہ نہیں ہو گا ناں....." رافیہ نے دیا کو سمجھایا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو رافی..... مگر دیکھو ناں کل کو دونوں بھائیوں کی بھی شادیاں ہو جائیں گی، دونوں کا ہی بیرون ملک جانے کا ارادہ ہے تو تب امی، ابو اکیلے رہ جائیں گے۔ ان کی اس عمر میں کون دیکھ بھال کرے گا۔" دیا نے اپنی طرف سے مضبوط تاویل پیش کی۔

"اور والدین کے بعد تمہارا کیا ہو گا؟ تب تم بھی تو اکیلی رہ جاؤ گی ناں۔" رافیہ نے اس کی بات کاٹی..... "سو میری پیاری بہن اگر قسمت کی دیوی تم پر مہربان ہو ہی گئی ہے تو تمہیں اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" رافیہ کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے دیا خاموش ہو گئی۔

"ٹھیک ہے رافی میں سوچ کر جواب دوں گی۔" چند لمحوں بعد اس نے اتنا ہی کہا اور فون بند کر دیا۔

اور پھر کئی روز کی سوچ بچار کے بعد اس نے رافیہ سے کہہ دیا کہ وہ سرمد کو اس کا فون نمبر دے دے۔

"دیٹس لائک اے گڈ گرل....." رافیہ نے خوش

اور اب دونوں ایک دوسرے سے ملنے کے لیے طے شدہ مقام پر موجود تھے اور اپنے، اپنے بارے میں بتا رہے تھے اور پھر کچھ دیر کے بعد دیا نے کچھ کہنے کی ہمت کر ہی لی تھی۔

''سرمد صاحب میں آپ کو کسی قسم کے اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ اس لیے اپنی ذات کے بارے میں ایک اہم انکشاف کرنا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر دیا ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی اور سامنے ونڈ اسکرین پر کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے لگی۔

''ہاں، ہاں کہیے دیا..... میں آپ کے بارے میں ہر بات سننے کو تیار ہوں کہ میں خود ایک صاف گو اور حقیقت پسند شخص ہوں۔'' سرمد نے گاڑی سگنل پر روکتے ہوئے کہا۔

''وہ..... وہ..... دراصل میں ایک مسئلے کا شکار ہوں۔'' اور پھر دیا نے نہایت تفصیل سے اپنے میڈیکل پرابلم کے بارے میں سرمد کو بتا دیا۔ آخر وہ ایک ڈاکٹر جو تھا۔

''ہوں.....'' سرمد نے سب کچھ سنا اور ایک گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے تفکر کے سائے سے رینگنے لگے مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پا کر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا کر کہا۔

''دیا میں نے آپ کی ذات کو آپ کی شخصیت کو پسند کیا ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ میڈیکلی کسی ایسی پرابلم کا شکار ہیں جو براہ راست ہمیں متاثر کر رہی ہو یا نہیں دیا... یہ خدانا خواستہ کوئی بڑا پرابلم نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

''مگر..... مگر کیا آپ کے گھر والے۔'' دیا نے دھڑکتے دل سے استفسار کیا۔

''پتا نہیں یہ جان کر امی اور باجی کا کیا ردِعمل ہو، اگرچہ میرے دو بیٹے تو ہیں پھر مزید اولاد نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے مگر ہر ماں اور بہن کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے اکلوتے بیٹے یا بھائی کے ہاں زیادہ بچے ہوں۔ اب پتا نہیں تمہارے بارے میں یہ جان کر ان کا کیا ردِعمل ہو؟'' سرمد نے کچھ متفکر لہجے میں کہا۔

''تو آپ انہیں بتائیے گا ہی نہیں، یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی۔'' دیا نے قدرے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ اس نے بڑی مشکل سے ایک آس کے جگنو کو تھاما تھا کہ شاید جو شخص اسے پسند کر کے اپنانے جا رہا ہے وہ اس کی خوبیوں اور تمام خامیوں کو قبول کر کے اسے اپنائے گا اور اس کی باقی کی زندگی ایک اچھے جیون ساتھی کے سنگ سکون اور اطمینان سے گزرے گی مگر اسے پسند کرنے کا دعوے دار تو پہلے قدم پر ہی لڑکھڑا گیا تھا۔

''چلیے اگر آپ کی بات مان کر ابھی میں انہیں یہ بات نہیں بتاتا تو بعد میں جب انہیں پتا چلے گا تو وہ کس قدر شدید طور پر ری ایکٹ کریں گی اور وہ سمجھیں گی کہ ہم نے انہیں دھوکا دیا ہے، ظاہر ہے میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں، میری بہن بھی مجھے پر ہی انحصار کرتی ہیں تو میں گھر کے ماحول کو بدمزگی سے بچانے کے لیے ان سے علیحدہ ہونے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ انہیں ابتدا ہی میں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر کے سمجھا دوں اور وہ مان جائیں اور مجھے پوری امید ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر ضرور آمادہ ہو جائیں گی۔'' سرمد نے پُرامید لہجے میں کہا..... مگر دیا کو صاف معلوم ہو رہا تھا کہ سرمد کا اپنا ارادہ بھی ڈانواں ڈول ہے اور اس کے انداز میں وہ گرمجوشی نہیں ہے جو حقیقت جاننے سے قبل تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک ریستوران میں بیٹھے چائے اور اسنیکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے، کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر ریستوران سے باہر آ گئے۔ دیا نے باہر آتے ہی جاتے رکشے کو ہاتھ دیا اس نے سرمد کے بے حد اصرار کے باوجود اس کے گھر ڈراپ کرنے کی پیش کش مسترد کر دی تھی۔ کیونکہ ابھی اس نے گھر میں کسی کو بھی سرمد کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور یہ اچھا ہوا تھا ورنہ اگر وہ امی ہی کو بتا دیتی تو ان

بیچاری نے خواہ مخواہ ہی بیٹی کے گھر کے آباد ہونے کی امیدوں کے جگنوؤں سے اپنے دل و دماغ کو روشن کر لیا تھا جو بعد میں لاحاصل ثابت ہوتا تو انہیں کس قدر دکھ ہوتا۔

سرمد اکثر دیا سے رات کو فون پر باتیں کرتا یا میسج کرتا ایک دو بار دونوں باہر ملے بھی تھے۔ رافیہ کے گھر بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود دونوں کے انداز یونہی وقت گزارنے والے ہی ہوتے، لگتا تھا کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے کوئی خاص لگاؤ یا اپنائیت محسوس نہیں کرتے بس یونہی مل رہے ہیں۔ ایک نامعلوم سا فاصلہ دونوں کے بیچ میں در آیا تھا۔ جسے پاٹنا ان کے لیے ناممکن ہو رہا تھا۔ دیا جب بھی اس سے پوچھتی کہ اس نے اپنی والدہ اور بہن سے بات کی ہے تو وہ یہ کہہ کر ٹال جاتا کہ وہ مناسب وقت دیکھ کر ان سے بات کرے گا اور جواب میں دیا خاموش ہو جاتی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ سرمد کے ساتھ تمام روابط ترک کر دے مگر انجانے میں وہ اس کے فون کی بھی منتظر رہتی اور دو دو تین تین دن تک اس سے ملاقات نہ ہو پاتی تو وہ بے قرار سی ہو جاتی۔ بلکہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ چپکے، چپکے اسے چاہنے لگی ہے جبکہ سرمد نے کبھی اس کے لیے اپنی کسی قسم کی چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نہ ہی وہ کسی قسم کی لگاوٹ بھری باتیں کرتا تھا، بس جیسے اس سے ہفتے میں ایک آدھ بار ملنا اور فون کرنا بھی اس کی لائف کی دیگر معمول کی سرگرمیوں جیسا ہو اور جب بھی وہ دبے لفظوں میں اس سے پوچھتی کہ اس نے اپنی والدہ سے بات کی تو سرمد یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ وہ کوشش کر رہا ہے۔ موڈ دیکھ کر بات کرے گا۔

اگرچہ سرمد زیادہ کیا بلکہ بالکل ہی ہینڈسم تھا نہ ہی کسی ہیرو کی طرح اسٹائلش یا دل موہ لینے والی باتیں کرتا تھا مگر پھر بھی جانے کیسے وہ دیا کے دل و دماغ میں بس گیا تھا۔ شاید وہ دنیا کا پہلا مرد تھا جس نے عمر کے اس حصے میں اس کے اندر سوئی ہوئی محبت کو بیدار کیا

صورت لڑکی ہے چاہے جانے اور سراہے جانے کے قابل..... مگر پھر وہ بھول گیا تھا کہ اس نے ایک سیدھی سادی سادہ دل لڑکی کو چاہنے اور چاہے جانے کا احساس دلایا ہے اور مزید پیش قدمی کے بجائے ایک بزدل شخص کی طرح ماں کی آڑ لے کر بھاگنے کے چکر میں تھا۔

وہ کوئی نوخیز، نوجوان اور جذباتی شخص نہیں تھا..... پہلے سے شادی شدہ دو بچوں کا باپ پینتیس، چھتیس سال کی عمر کا میچور آدمی تھا..... جو زندگی کے بہت سے روپ دیکھ اور برت چکا تھا اگرچہ دیا بھی اب اپنی زندگی کی سینتیسویں دہائی میں قدم رکھ چکی تھی۔ مگر اس کے دل کی کتاب ہنوز ایک ٹین ایج لڑکی کی طرح سادہ تھی۔ جس پر محبت کا پہلا لفظ سرمد ہی نے تحریر کیا تھا..... اور وہ اب اس کی چاہت میں اس قدر گرفتار ہو گئی تھی کہ اسے پانے کے لیے شب و روز دعائیں مانگ رہی تھی۔ وظیفے کرنے لگی تھی۔ اس بے پروا شخص کی بے اعتنائی کے باوجود اس کی پسند کے سانچے میں خود کو ڈھالنے کی تگ و دو میں لگی رہتی۔ کہاں وہ عام سے حلیے والی سادہ سی دیا اور کہاں اب برانڈڈ ڈریسز پہننے اور اکثر پالرز کے چکر لگانے والی ایک ماڈ اور سجی سنوری گڑیا بن چکی تھی۔ چونکہ اب اس کا بھائی بھی کمانے لگا تھا، اس لیے اس پر گھر کے اخراجات کا بوجھ کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اپنی گرومنگ پر صرف کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر سے اپنا آپریشن بھی کروا لیا تھا تاکہ سرمد کے ساتھ شادی کے بعد اسے کسی قسم کا رسک نہ ہو کیونکہ ایک مرتبہ باتوں، باتوں میں سرمد نے اسے بتا دیا تھا کہ اس نے دیا کے میڈیکل پرابلم کا ذکر کر کے اپنی والدہ سے شادی کی اجازت طلب کی تھی تو وہ کہنے لگیں۔

"بیٹا تمہاری پہلی بیوی بھی زچگی کے دوران انتقال کر گئی تھی اور یہ بھی اگر اسی طرح چل بسی تو میں کیا ساری زندگی تمہارے لیے بیویاں ہی تلاش کرتی

یہ بات سن کر دیا نے سرمد کو بغیر بتائے اور اس سے مشورہ کیے بغیر ہی اپنا آپریشن کروا کر خود کو ہمیشہ کے لیے ماں بننے کی صلاحیت سے محروم کر لیا تھا۔ اور جب اسے کئی روز کے بعد یہ بتایا تو وہ خاموش سا ہو گیا تھا۔ بلکہ اس نے تواتر سے فون کرنا اور ملنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی خود ہی دیا ڈھیٹ بن کر فون کر لیتی تو وہ ریسیو تو کر لیتا مگر بڑے اکھڑے، اکھڑے انداز میں مختصر ہی بات کرتا۔

پھر ایک دن رافیہ نے اسے فون پر بتایا کہ سرمد نے اپنی کولیگ ڈاکٹر عنیزہ علی سے منگنی کر لی ہے۔ تب دیا رو دی تھی نہ ہی اس نے تقدیر سے کوئی گلہ شکوہ کیا تھا۔ بس وہ چپ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا محبت جیسے جذبے پر سے ہمیشہ کے لیے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ اور اب اس نے اپنے دل کی بستی کو غیر آباد ہی رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دل کے سارے دروازے کھڑکیاں بند کر کے اپنی زندگی کی مصروفیات میں خود کو گم کر لیا تھا۔ اللہ سے لو لگا رکھی۔ عبادات کی پابندی میں پہلے سے زیادہ شدت آ گئی تھی۔ ماں، باپ کی خدمت اور زیادہ جی جان سے ..... کرنے لگی تھی۔ دونوں بھائیوں کی تعلیم مکمل ہونے اور ان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بعد ان کے لیے اچھی، اچھی لڑکیاں تلاش کر کے ان کی شادیاں کر دی تھیں۔ دونوں بھائی باری، باری نئی منزلوں کی تلاش میں بیرون ملک چلے گئے تھے اور گھر میں دیا بیمار والدین کے ساتھ رہ گئی تھی اور اسے اپنی اس سعادت پر فخر بھی محسوس ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے بڑھاپے میں ان کی خدمت کرنے کا موقع اسے عطا فرمایا تھا اور یہی تو اس کی زندگی کا نصب العین تھا..... کبھی، کبھار رافیہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے ہاں تین بچے پیدا ہو چکے تھے بڑی بیٹی چھ سال کی تھی..... اس سے چھوٹا بیٹا پانچ سال کا اور سب سے چھوٹا تین سال کا تھا۔

چونکہ ڈاکٹر عمیر کو اسپتال کے رہائشی حصے میں شادی کے کچھ عرصے بعد ہی ایک خوب صورت سا بنگلا مل چکا تھا۔ اس لیے وہ لوگ وہیں رہ رہے تھے

..... تین، بچوں کی پیدائش، گھر کی ذمے داریوں اور ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے رافیہ کی صحت کافی گر چکی تھی اور وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ دراصل تیسرے بچے کی پیدائش کے بعد یہ ہولناک انکشاف ہوا تھا کہ اسے بلڈ کینسر ہے اور تیزی سے اس کے کمزور جسم میں پھیل رہا تھا۔ پھر علاج کا مرحلہ شروع ہوا۔ کیموتھراپی کے تکلیف دہ عمل سے گزرنا تو جان لیوا تھا۔

دیا کو والدین کے بعد اس دنیا میں اگر کسی ہستی سے لگاؤ تھا تو وہ رافیہ ہی تھی اور اپنی جان سے پیاری دوست کو یوں تیزی سے زندگی سے دور اور موت کے قریب جاتا دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ اسے جب بھی وقت ملتا وہ رافیہ کے گھر چلی جاتی۔ اگرچہ گھر میں ملازم تھے مگر ملازم بھی تو بغیر کسی کی ہدایت اور نگرانی کے کہاں کام کرتے ہیں، بچوں کی دیکھ بھال کے لیے آیا تھا۔ مگر وہ بھی اپنے فرائض صحیح طرح سے سرانجام نہیں دے رہی تھی۔ رافیہ نے تو اب ملازمت کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا اور سارا وقت بیڈ پر پڑی نم آنکھوں سے اتنی محنت سے سجائے گھر کو حسرت سے تکتی رہتی۔

دیا اب تقریباً روز ہی رافیہ کے ہاں شام کو آ جاتی..... اپنی نگرانی میں بچوں اور عمیر کے لیے کھانا تیار کرواتی، رافیہ کے لیے پرہیزی کھانا اپنے ہاتھوں سے تیار کرتی..... گھر کی صفائی ستھرائی کرواتی، بچوں کو ہوم ورک کرواتی۔ ان کے اگلے دن کے اسکول کے لیے یونیفارم پریس کرواتی..... رافیہ کو نہانے دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے میں مدد کرتی۔ غرضیکہ رافیہ کے گھر کی تقریباً تمام ذمے داریاں دیا نے سنبھال لی تھیں..... اسکول سے واپس آ کر امی اور ابو کو کھانا کھلا کر وہ رافیہ کی طرف چلی آتی تھی۔ اپنے گھر میں اس نے کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی۔ وہ رات کو آٹھ، نو بجے تک دوست کے پاس ہی رہتی۔ اس کا بھائی سعد باہر جاتے ہوئے اپنی قسطوں پر خریدی ہوئی گاڑی اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ دیا نے ڈرائیونگ بھی سیکھ لی تھی۔ اس طرح اسے آمد و رفت کی بھی آسانی ہو گئی تھی۔

دونوں بھائی ہر ماہ معقول رقم بھیج دیتے۔ جس سے گھر کے اخراجات بخوبی پورے ہو رہے تھے گھر کا اوپر کا پورشن بھی کرایے پر دے دیا تھا۔ چنانچہ اب مالی پریشانی نہیں رہی تھی۔

رافیہ بے حد مایوس اور دلگرفتہ رہنے لگی تھی۔ اسے اپنے معصوم بچوں کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ چنانچہ ایک دن جب دیا سارے کاموں سے فارغ ہو کر اس کے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتوں سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھی تو اچانک رافیہ جو تکیوں کے سہارے بیڈ پر نیم دراز تھی کچھ سوچ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور دیا کے دونوں ہاتھوں کو اپنے کمزور ہاتھوں میں تھام کر عجیب لہجے میں بولی۔

''دیا میری پیاری بہن ..... میری ایک درخواست ہے امید ہے کہ تم اسے رد نہیں کرو گی۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو رافی تم درخواست نہیں حکم کرو، تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں تمہیں کس قدر شدت سے چاہتی ہوں تم اگر میری جان بھی مانگو تو وہ بھی حاضر ہے۔'' دیا نے خلوص بھرے لہجے میں کہا۔

''میں..... میں..... تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں..... میری بے حد عزیز دوست، میری بہن، جس طرح تم پچھلے تین سال سے میری اس بیماری کی وجہ سے میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اپنی جان مار رہی ہو، ایسا تو میری حقیقی بہن بھی ہوتی تو وہ بھی نہ کرتی..... بلکہ میری ماں اور بھائی بھی نہیں کر پا رہیں کہ اپنے گھر کے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی ہیں اور تم ملازمت اور اپنے گھر کی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ایک مشین کی طرح میرے بچوں اور میرے گھر کو سنبھال رہی۔ یہ تمہارا اتنا بڑا احسان ہے مجھ پر، میرے شوہر اور بچوں پر کہ ہم کسی طرح بھی اس کا صلہ نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہی تمہیں اس کا اجر دیں گے، بس میری ایک آخری التجا اور مان لو تاکہ میں..... میں سکون اور بے فکری سے اپنی زندگی کے بقایا ایام گزار سکوں۔'' اتنی بات کرنے کے بعد رافیہ بری طرح سے ہانپنے لگی تھی۔ اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ کھانسی کی شدت کی وجہ سے اس کا پورا جسم کسی خزاں رسیدہ پیڑ کے مانند لرز رہا تھا۔ دیا نے جلدی سے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور گلاس میں پانی ڈال کر دیا جو بہ مشکل گھونٹ، گھونٹ کر کے وہ پی سکی اور پھر نڈھال سی ہو کر اپنا سر دیا کے کاندھے سے ٹکا کر آنکھیں موند کر گہری، گہری سانس لینے لگی۔ اسی لمحے عمیر جو کچھ دیر قبل ہی اسپتال سے آئے تھے اور لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، جو ملازمہ نے انہیں بنا کر دی تھی۔ مگر جب رافیہ کی زور، زور سے کھانسنے کی آواز سنی تو جلدی سے کمرے میں آ گئے۔

''کیا ہوا؟ طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے کیا؟'' عمیر نے تشویش بھرے لہجے میں دیا سے پوچھا۔

''بس باتیں کرتے، کرتے کھانسی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ میں نے پانی پلا دیا ہے۔ اب بہتر ہے۔'' دیا نے رافیہ کا سر تکیوں پر آہستگی سے رکھ کر کہا۔

''ٹھیک ہے آپ خیال رکھیے گا، اگر زیادہ مسئلہ ہوا تو میں اسپتال لے جاؤں گا، آج میں گھر ہی پر ہوں، شام کو کلینک نہیں جا رہا۔'' یہ کہہ کر وہ دبے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئے جبکہ دیا بیڈ کے ساتھ بڑی کرسی پر بیٹھ کر ترحم سے رافیہ کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگی۔ یوں تو وہ پہلے ہی خاصی نازک و کمزور تھی مگر کم از کم چہرے پر صحت مندی کی چمک تو تھی مگر پچھلے چند سالوں سے تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔ ملازمت تو چھوٹ گئی تھی۔ ساتھ ہی اس کی سوشل لائف بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ کہیں آنا جانا بھی ختم ہو گیا تھا۔ پہلے تو پھر بچوں اور شوہر کے ساتھ کبھی آؤٹنگ کے لیے تو کبھی والدین کی طرف چلی جاتی تھی..... مگر بیماری کی شدت بڑھنے کے ساتھ، ساتھ بالکل ہی بیڈ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کیمو تھراپی اسے قطعی راس نہیں آئی تھی۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ کینسر کے مریضوں کی اکثریت کے لیے کیمو تھراپی بالکل بھی مناسب طریقہ علاج نہیں اور بہت سے مریضوں کی

موت بیماری سے نہیں بلکہ کیمو تھراپی کے سائڈ ایفیکٹس سے ہوتی ہے۔ رافیہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اور تین سال سے وہ کیمو تھراپی کروانے کے باوجود صحت یاب ہونے کے بجائے مزید بیمار ہو چکی تھی۔ اور تیزی سے زندگی سے اور موت کے قریب جا رہی تھی۔

عمیر ایک معروف سرجن تھے۔ وہ بھی دیا کے ممنون تھے جو اُن کی بیمار بیوی اور گھر کو سنبھال رہی تھی۔ پہلے تو وہ دیا کو دل ہی دل میں پسند کرتے تھے مگر جب سرمد کو اس کی جانب متوجہ دیکھا تو اپنی پسندیدگی کو دل کے نہاں خانوں میں دفن کر دیا تھا۔ یوں بھی رافیہ جو بھی تھی جیسی بھی تھی، ان کی بیوی بن چکی تھی۔ ان کے بچوں کی ماں تھی پھر جب سرمد نے ماں کی رضامندی کا بہانہ بنا کر دیا کو ٹھکرا کر کہیں اور شادی کر لی تو عمیر نے اسے بہت برا بھلا کہا تھا کہ اس نے ایک نیک اور مخلص لڑکی کو چھوڑ کر محض ماں کو خوش کرنے کی خاطر ایک عام سی شکل صورت کی خود سے کئی سال بڑی خاتون کو اپنا لیا تھا۔ مگر جواب میں سرمد خاموش سا رہ گیا تھا۔ اس نے دیا سے دامن چھڑانے کی اصلی وجہ عمیر کو نہیں بتائی تھی۔

سرمد کے دیا کو چھوڑنے پر بظاہر تو عمیر نے اسے جلی کٹی سنائی تھیں۔ مگر حقیقت میں وہ خوش ہی ہوا تھا اور دیا کے لیے اس کی سوئی ہوئی پسندیدگی بھرپور طریقے سے بیدار ہو گئی تھی چونکہ رافیہ کی گہری اور مخلص دوست دیا ہی تھی۔ اسی طرح دیا کی بھی رافیہ کے علاوہ کوئی اور خاص دوست نہیں تھی۔ اس لیے دونوں گاہے بہ گاہے جب بھی موقع ملتا ایک دوسرے کے گھروں میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ کبھی باہر کھانے پر یا بکنگ وغیرہ پر جانا ہوتا تو دیا کی موجودگی اکثر ہی لازمی ٹھہرتی۔ جب تک دیا نے گاڑی چلانی نہیں سیکھی تھی تب تک عمیر ہی اسے پک اور ڈراپ کرتے تھے۔ یوں دھیرے، دھیرے اس کی پسندیدگی شدید چاہت میں بدل چکی تھی۔ البتہ انہوں نے کبھی دیا سے کھل کر اظہار کیا اور نہ ہی دیا نے

کے ذومعنی جملے اور کچھ کہتی ہوئی نگاہیں اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر دیا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتی۔ انجان بن جاتی کہ وہ اس کی جان سے زیادہ عزیز دوست کے شوہر تھے۔ اس لیے وہ ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھی۔ یوں بھی سرمد کی بے وفائی کے بعد اب وہ مرد ذات سے کبیدہ خاطر ہو چکی تھی۔ اور اب کسی بھی طرح سے خود کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے عمیر کے ساتھ اس کا رویہ ہمیشہ ہی لیے دیے رہنے والا تھا اور اب رافیہ کی بیماری کے بعد دیا کا ان کے گھر روز، روز آنا جانا ہوا تو عمیر کی اس کے لیے محبت کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ اور وہ بہانے، بہانے سے باتوں، باتوں میں کوئی نہ کوئی جملہ ایسا ضرور کہہ دیتے جس سے دیا کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔ کانوں کی لویں سرخ ہو جاتیں۔ اور من بے اختیار ایک بار پھر سے کسی کو چاہنے اور چاہے جانے پر مچل اٹھتا۔ مگر وہ ایک باضمیر اور باوقار انسان تھی۔ وہ تو کسی اور عورت کا گھر اجاڑنے کو انتہائی قبیح فعل تصور کرتی تھی۔ کجا کہ اپنی ہی دوست کے شوہر کے دل پر قابض ہونے کی سعی کرتی۔

مگر شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ جیسے جیسے رافیہ کی بیماری شدید ہوتی جا رہی تھی ویسے، ویسے وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے معصوم بچوں کا خیال ہر وقت نڈھال کیے رہتا۔ تبھی اس نے ایک دن دیا سے فیصلہ کُن بات کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی تھی۔ اس کے کئی روز بعد جب ایک دن دیا اس کے گھر آئی تو رافیہ نہایت خوب صورت میرون کلر کا کام والا سلکی سوٹ پہنے، بالوں کو سنوارے ہلکا، ہلکا میک اپ کیے لاؤنج ہی میں ایک صوفے پر کشنوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ عمیر کچھ دیر پہلے ہی ایک آپریشن کے سلسلے میں اسپتال گئے تھے جبکہ بچے اسکول سے آ کر یونیفارم تبدیل کر کے اور کھانا کھا کر اپنے، اپنے کمروں میں تھے۔ ملازمہ رافیہ کے قریب بیٹھی نرم ہاتھوں سے اس کا

سردبار ہی تھی۔ اور رافیہ ٹی وی پر ایک دلچسپ پروگرام دیکھتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ رافیہ کو اس قدر سجا سنورا اور خوشگوار موڈ میں دیکھ کر دیا کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کی جانب بڑھی تو رافیہ جلدی سے صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور اپنی کمزور باہیں دیا کی جانب وا کر دیں، دیا اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے گلے لگ کر اس کا سر سہلانے لگی۔

''رانی ڈیئر بس ایسے ہی خوش رہا کرو..... یونو کہ خوش رہنے سے بیماری یوں بھاگ جاتی ہے جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو۔'' دیا کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے رافیہ چپ سی رہ گئی اور اس کے کمزور چہرے پر ایک سایہ سا رینگ گیا مگر دوسرے ہی لمحے خود کو سنبھال کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اپنے بیرون لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں پر سجا کر بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو دیا..... ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے میں تو مریضوں کو آخری لمحات تک تسلی، دلاسا دینے کی عادی رہی ہوں..... اور خود تھوڑے عرصے کی بیماری سے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیے۔ اب میں تو تمہیں بستر پر پڑی نظر آؤں گی نہ ہی ہائے وائے کروں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ چاہے کتنی ہی طبیعت خراب کیوں نہ ہو مایوس نہ ہوں گی اور نہ ہی خود کو بیمار محسوس کرو گی۔ تم یہی تو ہر وقت مجھے کہتی رہتی ہو ناں بلکہ بچے اور عمیر بھی یہی چاہتے ہیں امی، ابو اور بھائی بھی مجھے نڈھال اور پریشان دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میری زندگی کی جتنی بھی سانسیں باقی اور جتنے بھی دن میں زندہ رہوں گی۔ اپنے پیارے اور چاہنے والے رشتوں کو دکھی نہیں کروں گی۔''

''یس..... یہ تمہارا بہت اچھا فیصلہ ہے اور دیکھنا تم اگر اس طرح اچھا، اچھا سوچو گی تو اپنی بیماری کو خود پر طاری نہیں کرو گی تو پھر صحت یاب بھی جلد ہو جاؤ گی۔ ان شاء اللہ.....'' دیا نے مسکرا کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''تم فکر نہ کرو..... اب میں مریضوں کی طرح کبھی بی ہیو نہیں کروں گی..... مگر تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر رافیہ نے چائے کے برتن میز پر رکھتی ملازمہ کو ایک نظر دیکھا اور پھر بولی۔

''عاصمہ تم ذرا بچوں کو دیکھ لو..... اب دیا آ گئی ہے میرے پاس۔ تم کہہ رہی تھیں ناں کہ آج تمہیں جلدی گھر جانا ہے تو تم چلی جاؤ، یہ لو کچھ پیسے رکھ لو، کرایے کے لیے اور اپنے بچوں کے لیے کچھ کھانے کو بھی لے جانا۔'' یہ کہہ کر رافیہ نے قریب پڑے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر عاصمہ کو دیا تو وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ تو وہ دوبارہ دیا کی جانب متوجہ ہوئی۔

''ہاں تو دیا..... میری سوہنی بہنا..... مجھ سے وعدہ کرو کہ خاموشی سے میری بات سنو گی اور جو میں کہوں گی اس پر عمل بھی کرو گی۔''

''ارے یار اب بولو بھی کہ تمہید ہی باندھے جاؤ گی۔'' دیا نے جھنجلا کر کہا تو رافیہ بے اختیار ہنس دی اور پھر کچھ دیر خاموش لیٹنے کے بعد کہنے لگی۔

''دیا تمہیں میری حالت کا بخوبی اندازہ ہے۔ اور میری بیماری اس اسٹیج پر پہنچ چکی ہے کہ ڈاکٹرز نے بھی مایوسی کا اظہار کر دیا ہے۔ اور کسی وقت بھی میری سانسیں تھم سکتی ہیں، میں موت سے خوف زدہ نہیں ہوں کہ یہ برحق ہے اور ایک دن ہم سب نے ہی اس دنیا سے جانا ہے کوئی پہلے جاتا ہے، کوئی بعد میں..... مگر جانا سب نے لازمی ہے سو سال کی زندگی ہو یا چند دن کی..... اس نے بہر حال ایک دن ختم ہونا ہی ہے۔ مجھے موت سے زیادہ اپنے بچوں کی فکر ہے دیا..... اور میں نہیں چاہتی کہ میرے بعد وہ رُل جائیں، ظاہر ہے عمیر اپنے گھر کو آباد رکھنے کی غرض سے دوسری شادی ضرور کریں گے۔ یوں بھی میں نے شادی کے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا کہ عمیر نے جذبات میں آ کر مجھ سے شادی کا وعدہ تو کر لیا تھا اور اسے نبھایا بھی تھا مگر انہیں مجھ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی..... شاید ہماری قسمت ہی میں یہ بندھن لکھا ہوا تھا۔ بہر حال مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں، نہ ہی میں نے کبھی زبردستی ان کی محبت اور

توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہی احسان مجھ پر بہت ہے کہ انہوں نے مجھ سے محبت نہ کرنے کے باوجود اس رشتے کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اب میں زیادہ دن تک شاید ان کا ساتھ نہ دے سکوں..... اس لیے میری، میری خواہش ہے کہ دیا تم میرے بعد عمیر سے شادی کر لینا۔ کیونکہ میرے بچوں کو جو محبت اور پیار تم دے سکتی ہو۔ وہ دنیا کی کوئی اور عورت نہیں دے سکتی۔ بچے تم سے بے حد مانوس ہیں بلکہ جب سے میں اس خطرناک بیماری میں مبتلا ہوئی ہوں وہ میرے بجائے تمہارے ساتھ زیادہ اٹیچڈ ہو چکے ہیں۔ اور ایک طرف اگر انہیں ماں کی دائمی جدائی کا صدمہ ہوگا تو دوسری طرف جب تم ہمیشہ کے لیے ان کے پاس آ جاؤ گی تو ان کے دکھ کا کسی حد تک ازالہ ہو جائے گا کہ ان کی پیاری اور چاہنے والی آنٹی نے ہی ان کی ماں کی جگہ لی ہے۔" رافیہ نے بڑی مشکل سے رک، رک کر اپنی بات مکمل کی تھی۔ اس نے یہ سب کہنے کے لیے کافی ہمت جوڑی تھی۔

اور جب دیا نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے تو

"نہیں..... کچھ مت کہنا مجھے صرف تمہارا وعدہ چاہیے..... اگر تم چاہتی ہو کہ میں اپنی زندگی کے بقایا دن خوش رہ کر گزاروں اور سکون اور اطمینان سے اس دنیا سے رخصت ہو سکوں..... تو تمہیں یہ سب کرنا ہوگا۔"

"مگر..... مگر رانی، بالفرض میں تمہاری اور بچوں کی خاطر تمہاری بات مان بھی لوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ عمیر بھائی بھی اس پر آمادہ ہو جائیں گے کیونکہ میری زندگی کا تو اب مقصد ہی دوسروں کے لیے جینا ہے اور اگر یہ بے مصرف زندگی تمہارے یا تمہارے بچوں کے کسی کام آجائے تو اس سے زیادہ میرے لیے اور کیا سعادت ہو سکتی ہے۔" بالآخر دیا نے دھیمے لہجے میں پُرنم آنکھوں سے اپنی بات مکمل کی اور پھر دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اپنا منہ چھپا کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

"دیا، دیا میری جان خود مجھے خوش رہنے کو کہتی ہو

اور اب یوں رو رہی ہو۔" رافیہ نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے دیا کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"جب تم ایسی دل دکھانے والی باتیں کرو گی تو شقی القلب سے شقی القلب انسان بھی تڑپ جائے گا اور میرے لیے تو والدین اور بھائی بہنوں کے بعد تم ہی سب کچھ ہو، اور تم نہ صرف یہ کہ اس بے رحمی سے اپنے جانے کی باتیں کر رہی ہو بلکہ اپنے میاں اور بچوں کو بھی مجھے سونپنے کا سوچے بیٹھی ہو۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے دنیا بھر کے ڈاکٹر بھی تمہارے لاعلاج ہونے کی باتیں کرتے ہیں لیکن اگر اللہ کو منظور ہوا تو تم نہ صرف صحت مند رہو گی بلکہ اپنے بچوں کو بھی پال پوس کر جوان کرو گی۔ تم اللہ پر بھروسا رکھو اور اس کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگو۔۔۔۔ وہ عظیم ذات جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے وہ تمہاری دعا بھی ضرور سنے گا۔ مایوسی ویسے بھی ہمارے مذہب میں کفر ہے اور ہر انسان جتنی زندگی لکھوا کر لایا ہے وہ اسے پوری کرنی ہے۔ بعض اوقات لاغر، بیمار، فالج کے مریضوں کو برسا برس تک معذوری کی حالت میں زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ حالانکہ وہ بے حد بے بس اور مجبور ہوتے ہیں اور ہر وقت موت کی دعا مانگتے ہیں۔ مگر موت ان کا دامن جھٹک دیتی ہے اور اچھے خاصے صحت مند لوگ چلتے پھرتے چل بستے ہیں تو یہ کوئی ہارڈ اینڈ فاسٹ رول نہیں ہے میری بہن۔۔۔۔ کہ کینسر کا مریض ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق قبل از وقت فوت ہو جائے سو مائی ڈیئر فرینڈ تم بس ہمت کرو اور زندہ رہنے کے لیے موت سے نبرد آزما ہو جاؤ۔ ان شاء اللہ، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔" دیا بہت پُرامیدی سے اس کی ہمت بندھا رہی تھی۔

"دیا میں نہ مایوس ہوں۔ نہ ہی اللہ کی رحمت سے ناامید ہوں۔۔۔۔ میں صرف اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے تم سے وعدہ لے رہی ہوں کہ خدانخواستہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے بچوں کو اپنی محبت بھری آغوش میں سمیٹ لینا اور یونہی سمجھنا کہ انہیں میں نے نہیں تم نے ہی اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ بس میرے اطمینان کے لیے ہامی بھر لو تو تمہارا کیا جاتا ہے، جب تک میں زندہ ہوں ظاہر ہے تب تک تو ایسا نہیں ہو گا ناں پھر تمہیں کیا اعتراض ہے، جب یہاں کوئی اور عورت میری جگہ لینے کے لیے آسکتی ہے تو پھر تم ہی کیوں نہیں۔"

"اوکے، تم کہتی ہو تو میں دل پر پتھر رکھ کر وعدہ کر لیتی ہوں لیکن ضروری تو نہیں کہ عمیر بھائی مجھے ضرور ہی اپنا لیں۔ جبکہ تمہارے کہنے کے مطابق وہ کسی اور کو چاہتے ہیں۔" بالآخر دیا نے رافیہ کا دل رکھنے کی خاطر کہا۔

"میں ان سے بات کر چکی ہوں دیا۔۔۔۔ اور وہ اس کے لیے رضامند ہیں، دراصل میں نے تو انہیں صرف یہ کہا تھا کہ وہ چاہیں تو اپنی پسندیدہ خاتون سے جب چاہیں شادی کر سکتے ہیں البتہ میرے بعد بچوں کو اپنے پاس رکھنے کے بجائے تمہارے حوالے کر دیں، بے شک ان کے اخراجات برداشت کرتے رہیں مگر انہیں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے نہ دیں، اس پر انہوں نے کہا تھا کہ وہ میری اور بچوں کی خاطر تمہیں اپنا لیں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جو پیار تم ان کے بچوں کو دے سکتی ہو کوئی اور عورت نہیں دے سکتی خواہ وہ ان کی پسندیدہ ہی کیوں نہ ہو۔۔۔۔ اور اولاد سب کو پیاری ہوتی ہے اولاد کی خاطر تو انسان بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے کہ اولاد جیسی نعمت ایسے ہی تو نہیں مل جاتی ناں۔۔۔۔" رافیہ نے بہ مشکل تمام اپنی بات مکمل کی ۔۔۔۔ اور پھر نڈھال سی ہو کر صوفے پر لیٹ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد جب طبیعت قدرے سنبھل گئی تو اچانک کہنے لگی۔

"تمہیں یاد ہو گا دیا کہ بچپن ہی سے ہم دونوں یک جان دو قالب تھیں۔۔۔۔ اور ایک بار جب ہم نے اپنی ماؤں کے سامنے کہا تھا کہ ہم کبھی ایک دوسری سے جدا نہیں ہوں گی۔ اور ساری زندگی اکٹھی رہیں گی تو میری امی نے ہنس کر کہا تھا کہ جب ہماری شادیاں ہو جائیں گی تب تو جدا ہونا پڑے گا۔ تو میں نے فوراً کہا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی بندے سے شادی کر لیں گے

تاکہ ہمیشہ ساتھ رہیں تو امی نے مجھے کس قدر ڈانٹا تھا اور کہا تھا مجھے نہیں پتا تھا کہ معصومیت سے کہی گئی وہ بات ایک دن پوری ہو جائے گی اس حد تک کہ ہم دونوں ایک ہی شخص سے بیاہی جائیں..... مگر افسوس کہ ہم اکٹھے پھر بھی نہیں رہ سکتے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا دیا کہ تم ابھی میری زندگی ہی میں عمیر سے شادی کر لو..... تاکہ میں اپنی زندگی کے بقایا ایام تمہارے ساتھ بسر کر سکوں۔" رافیہ کی بات سن کر دیا غصے سے بولی۔

"کیا فضول بک، بک کر رہی ہو..... بدفالی مت نکالو منہ سے تمہیں کچھ نہیں ہونے والا۔ تم ان شاء اللہ بوڑھی ہو کر مجھ سے بھی بعد میں مرو گی اس لیے مت الٹی سیدھی باتوں سے میرا اور اپنا دماغ خراب کرو....." رافیہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسی وقت بچے ان کے پاس آ گئے اور وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔

جس طرح شمع بجھنے سے پہلے آخری بار ٹمٹماتی ہے اور اس کی لو بہت تیز ہو جاتی ہے اسی طرح رافیہ نے بھی اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنی بچی کھچی ممتا جمع کر کے اچھا لباس پہنا تھا۔ میک اپ کیا تھا اور پہلے شوہر سے اور پھر دیا سے اپنے دل کی تمام باتیں کر کے یوں ہلکی پھلکی ہو گئی تھی جیسے اس کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو اور اب جیسے وہ مرنے کے لیے مکمل طور پر تیار ہو چکی ہو کیونکہ اسے زندگی سے وابستہ رہنے کی خواہش محض اپنے بچوں کی خاطر تھی۔ مگر جب اس نے شوہر اور بچوں اور سہیلی سے اپنے بچوں کے لیے وعدے لیے تو وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔ اور بس اسی رات کسی وقت نیند ہی میں اس کی روح قفسِ عنصری سے ہمیشہ کے لیے عالم بالا کی جانب پرواز کر گئی۔ مرتے ہوئے اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے گہرے تاثرات تھے اور اس کا کمزور اور زرد چہرہ پھول کی طرح کھل گیا تھا۔

عمیر نے بچوں کو ماں کی اچانک موت کے صدمے سے بچانے کی خاطر صبح، صبح نیند سے جگا کر رافیہ کی والدہ کے گھر ملازمہ کے ساتھ بھجوا دیا تھا۔ انہیں یہی کہا تھا کہ ماما بیمار ہیں اور انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا گیا ہے اور ٹھیک ہو کر وہ واپس آ جائیں گی اور پھر اگلے دو ماہ تک بچے نانی کے پاس ہی رہے تھے۔ وہیں سے اسکول چلے جاتے، ماں کی بیماری کے پیشِ نظر زیادہ ملنے کی ضد نہیں کرتے تھے یا پھر قدرت نے ان کے دلوں میں صبر ڈال دیا تھا۔ اور جب دو ماہ بعد عمیر اور دیا کا سادگی سے نکاح ہو گیا تو عمیر بچوں کو گھر واپس لے آئے تھے اس سے پہلے ہی عمیر نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ چونکہ ماما بے حد بیمار تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے اور اب دیا آنٹی ان کی ماما بن کر ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں گی۔ وہ اکثر نانی کے ہاں بچوں سے ملنے چلی جاتی تھی۔ تو بچے جہاں ماں کے بچھڑنے پر دلگرفتہ اور غم سے نڈھال تھے وہاں انہیں اس بات کی بھی تسلی تھی کہ ماما نہیں رہیں تو دیا آنٹی تو ان کی ماما کی جگہ ان کے پاس آ جائیں گی جو انہیں ماما کی طرح ہی پیار کریں گی اور ان کا خیال رکھیں گی۔ دیا نے اگرچہ رافیہ سے کیا گیا وعدہ نبھانے کی خاطر عمیر کے ساتھ نکاح کے بندھن میں بندھنا قبول کیا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملنے جا رہی ہے۔ جب نکاح کے بعد عمیر اپنے چند دوستوں کے ساتھ دیا کو رخصت کروا کر اپنے گھر لایا تو اگرچہ سبھی کے دل بوجھل تھے اس غم سے کہ ابھی اس گھر کی مالکن کو اس دنیا سے رخصت ہوئے دو ماہ ہی ہوئے تھے اور وہ پھر سے ویران گھر آباد کرنے جا رہے تھے کہ یہ مرحومہ کی خواہش تھی کہ جس کا احترام لازم تھا۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد دیا قدرے شرمائی لجائی سی لاؤنج میں اسی صوفے پر اسی جگہ بیٹھی تھی جہاں آخری ملاقات کے وقت رافیہ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ کیسی دلہن تھی جس کا دل آنے والی زندگی کے تصور سے خوش ہونے کے بجائے انجانے اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔

اس طرح کی شادی کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا نہ ہاتھوں میں مہندی لگی نہ سکھیوں نے ڈھولک بجائی اور نہ ہی سہاگ کے گیت گائے گئے۔ بس چند افراد کے ساتھ ایک زندگی کی دوڑ میں تھکا ہوا شخص آیا

اور نکاح کے بعد اسے اپنے ہمراہ لے آیا اور وہ سوچ رہی تھی کہ وہ یہاں عمیر کی بیوی تو برائے نام ہی ہے اصل میں تو بچوں کی ماں کی حیثیت سے ہی لائی گئی ہے کہ جنہیں اگرچہ اس نے اپنی اس کوکھ سے جنم نہیں دیا تھا جس سے وہ اپنے محبوب کو پانے کی خاطر پہلے ہی محروم ہو چکی تھی..... اور اس شخص کو جس سے شادی کا کبھی اس نے سوچا ہی نہیں تھا وہ یہ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ ایک ادھوری عورت ہے کیونکہ رافیہ نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ عمیر کو کبھی اس راز سے آگاہ نہ کرے ورنہ سرمد کی طرح وہ بھی اسے ٹھکرا دے گا کہ کوئی بھی مرد ادھوری عورت کو اپنانا پسند نہیں کرتا جبکہ اس کا ادھورا پن رافیہ کے لیے اس لیے انمول تھا کہ اس طرح وہ اس کے بچوں کو... بھرپور پیار اور توجہ دے کر اپنی ممتا کی تسکین کر سکے گی۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے تم سے اس طرح اور ان حالات میں شادی کرنی پڑے گی مگر..... جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔''

عمیر نے ہیرے کی انگوٹھی دیا کی انگلی میں پہناتے ہوئے کہا تو دیا نے شرما کر سر کو اور بھی جھکا لیا۔

''تم یہ بھی مت سمجھنا کہ میں نے محض رافیہ کے کہنے پر بچوں کی خاطر تمہیں اپنایا ہے بلکہ تمہیں تو میں نے اسی وقت پسند کر لیا تھا جب میں پہلی مرتبہ رافیہ کے گھر اس کا رشتہ لینے آیا تھا مگر چونکہ میں رافیہ سے پہلے ہی شادی کا وعدہ کر چکا تھا اور خود ہی اسے اپنی طرف مائل کیا تھا تو یہ میری کم ظرفی ہوتی کہ کوئی اور لڑکی پسند آنے پر اس کے دل کو توڑ دیتا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس سے شادی کرنی پڑی کہ یہ میرے ضمیر کی آواز تھی..... ورنہ مجھے کون روک سکتا تھا پھر مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تم بھی میرے لیے ویسے ہی جذبات رکھتی ہو یا نہیں..... دراصل میں بنیادی طور پر ایک کم گو اور قسمت پر شاکر رہنے والا شخص ہوں..... تعلیم سے فارغ ہو کر جو پہلی لڑکی میرے قریب آئی بغیر سوچے سمجھے اسے ہی پرپوز کر بیٹھا۔ اور میں شاید اپنی قسمت پر قانع ہو چکا تھا اپنے پروفیشن اور بیوی بچوں کی مصروفیات میں مگن ہو کر کافی حد تک تمہارا خیال اپنے ذہن سے نکالنے میں کامیاب رہا تھا۔ مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شاید ہمارا ملاپ ہمارے مقدر میں لکھا جا چکا تھا بہر حال میں تمہیں دل و جان سے اپنی زندگی میں شامل ہونے پر خوش آمدید کہتا ہوں اور تمہیں ہر طرح سے خوش رکھنے کی سعی کروں گا۔''

عمیر کی طویل بات سن کر دیا نے سر اٹھایا تو اس نے عمیر کی پُرشوق محبت کا امرت لٹاتی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اس کے دل میں خوشیوں کے پھول کھل اٹھے اور اسے یوں محسوس ہوا کہ تپتے صحرا میں آبلہ پا چلتے، چلتے اچانک ہی ایک سرسبز و شاداب نخلستان میں پہنچ گئی ہو.....

اس نے ایک نیک جذبے کے زیر اثر بن ماں کے بچوں کو اپنی ممتا بھری آغوش میں سمیٹ کر انہیں ماں سے محرومی کے احساس سے بچانے کی خاطر ایک جوا ہی کھیلا تھا کہ جانے عمیر اسے کس طرح قبول کریں گے۔ اپنے بچوں کی آیا کے طور پر یا پھر اپنے گھر کی نگران کی حیثیت سے..... مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی زندگی بھر کی قربانیوں اور محرومیوں کا اس قدر خوب صورت صلہ عطا فرمانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ وہ جو سرمد کی بے رخی اور ٹھکرائے جانے کا غم برسوں سے سینے میں چھپائے محض سانس لینے کی مشین بن کر رہ گئی تھی۔ نہ ہی اسے زندگی اور اس کی خوشیوں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوئی توقع اور خواہش رہی تھی مگر کاتب تقدیر نے اچانک ہی اس کی خالی جھولی کو خوشیوں کی انمول دولت سے بھر دیا تھا۔ چاہنے والا شوہر بھی مل گیا تھا پیارے، پیارے محبت کرنے والے پھول سے بچے اور بھرا پرا گھر بھی کیونکہ پہلے اس نے اپنے بہن، بھائیوں اور والدین کی خاطر اپنی خوشیوں کو تج کیا تھا پھر بیمار دوست کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی تو پھر خدا اسے کیسے محروم رکھتا کہ اس کے نصیب میں تو بامراد ہونا رقم تھا۔

❁ ❁ ❁

یہ کیسی ذلت ہے

قرۃ العین سکندر

آج شہناز بہت جلدی، جلدی ہاتھ چلا رہی تھی۔ اسے گھر پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ اس کی بیٹی رانو کو تیز بخار تھا اور وہ اس کے لیے دوا کے ساتھ اس کی من پسند چیزیں بھی اسے خرید کر دینے کی خواہش مند تھی۔ بیگم صاحبہ آج اسے کسی طور پر بھی واپس جلدی بھیجنے کی خواہش مند نہ تھیں۔ وہ اس وقت کچن میں کبابوں کا آمیزہ تیار کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی آج بیگم صاحبہ نے حلیم کی فرمائش بھی جڑ دی تھی اور

اسے پورا کرنے کے لیے وہ جت گئی تھی..... حلیم تو تقریباً تیار ہی تھی جب وہ سوچ رہی تھی کہ اب اس کی جان خلاصی ہو ہی جائے گی کہ اچانک ہی بیگم شاہنواز نے اسے پکارا تھا۔

"شہناز آج برسوں بعد میری دوست بیرونِ ملک سے واپس لوٹ کر سیدھی میری طرف آرہی ہے۔ میں چاہتی ہوں سب اس کا من پسند کھانا ہو، تم ایسا کرو کھیر بنالو اور ساتھ میں بریانی بھی۔" اب انہوں نے کچھ اور آرڈر کر دیا تھا اور شہناز حیرت زدہ تھی۔

"مگر بیگم صاحبہ آپ نے تو مجھے صبح ہی سارا مینیو بتا دیا تھا۔" شہناز نے کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ اول تو وہ بیگم صاحبہ کی بات کاٹتی ہی نہ تھی مگر اس بار بات رانو کی تھی، وہ گھر میں رانو کو تالا لگا کر چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ بھی اس حالت میں کہ رانو بخار میں پھنک رہی تھی۔۔۔ اس وقت اس کا بس چلتا تو اڑ کر وہ اپنی رانو کے پاس پہنچ جاتی۔ مگر وہ مجبور تھی، روزی روٹی کی خاطر اسے سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔ سہنا پڑتا تھا، اس وقت بھی وہ خود کو مجبور اور پابندِ سلاسل پا رہی تھی۔

"کیا بات ہے شہناز، کیا کام کرنا تمہارے لیے بار ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بتاؤ......؟ یہاں ملازمین کی کمی نہیں ہے وہ تو مسز خالدہ نے کینیڈا...... جاتے، جاتے تمہاری اتنی تعریف کی تھی کہ میں نے بھی رحم کھا کر تمہیں یہاں رکھ لیا، ورنہ یہاں نہ تو ملازمین کی کمی ہے اور نہ ہی اچھے شیف یہاں کم ہیں۔"

حسبِ توقع مسز شاہنواز کا نرم لہجہ تلخ و ترش ہو چکا تھا اور مزاج کی برہمی جو اُن کی شخصیت کا خاصہ بن چکی تھی اس وقت ان کے چہرے پر صاف عیاں تھی۔

"مگر میں نے تو کبھی بلاوجہ حیل و حجت سے کام نہیں لیا بیگم صاحبہ...... ہر کام پوری محنت اور تندہی سے کرتی ہوں۔" شہناز نے بھی واشگاف لفظوں میں کہا تھا۔ یہ سچ تھا کہ شہناز کو یہاں ملازمت مسز خالدہ کے توسط سے ہی ملی تھی۔ مسز خالدہ کا اس کی ذات پر......

پڑھ عورت نہ تھی وہ اگرچہ کالج کا منہ نہیں دیکھ سکی تھی مگر میٹرک تک تعلیم حاصل کر چکی تھی۔ اور اب مسز خالدہ کے گھر کیئر ٹیکر کی جاب نبھا رہی تھی۔ مسز خالدہ رحم دل خاتون تھیں، اس کے ساتھ اس کی بیٹی رانو کو بھی آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ رانو کے ساتھ، ساتھ کام نبٹاتی رہتی۔ رانو ہر شے کو حسرت اور حیرت سے تکا کرتی۔ مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بیوہ شہناز کو اپنی بیٹی رانو کے ساتھ اس جاب سے دستبردار ہونا پڑا تھا کیونکہ مسز خالدہ بیرون ملک شفٹ ہوگئی تھیں۔ اب یہاں سے جاتے، جاتے انہوں نے یہ نیکی کی تھی کہ اسے پڑوس میں مسز شاہنواز کی طرف لگوا دیا تھا۔

مسز شاہنواز نے اس سے ایک دو ڈشز بنوائی تھیں اور پھر وہ اس کے ہاتھوں کی لذت کی گرویدہ ہوگئی تھیں سو اس طرح مہینے کے اختتام پر اسے معقول رقم ملنے لگی تھی مگر اس قدرے معقول رقم کے عوض اسے پل، پل اپنی انا کو اپنی عزتِ نفس کو مجروح کرنا پڑتا تھا۔ اپنی روح کو کچل کر نئے سرے سے کچھ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ شروع میں وہ رانو کو اپنے ساتھ لائی تھی۔ مگر رانو نے ایک دن مسز شاہنواز کی دانست میں ایک سنگین غلطی کردی تھی۔ اور وہ غلطی یہ تھی کہ اس نے شہناز کی بنائی ہوئی سلاد میں سے ایک ٹکڑا کھیرے کا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا تھا اور عین اس وقت کچن میں مسز شاہنواز چیک اَپ کے لیے حاضر ہوئی تھیں اور ان کی سخت چبھتی نظروں سے اس معصوم بچی کی یہ حرکت ہرگز بھی پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔

"توبہ، توبہ کتنی غلاظت بھری ہے اس کے ہاتھوں میں..... کیا تم لوگ مجھے اس طرح کی غلاظت بھری چیزیں کھلا رہے ہو اور آدھی چیزیں تو یہ بچی کھاتی ہوگی۔" مسز شاہنواز نے ایک حقارت بھری نگاہ اس معصوم بچی کے چہرے پر ڈالی تھی۔ جو باتوں کے مفہوم تک تو نہ پہنچ سکی تھی مگر گھبرا ضرور گئی تھی اور ایک دم ہی ماں کے عقب میں چھپ گئی تھی۔

اس نے غلطی سے کھالیا۔'' شہناز کا بھی گلا سوکھ گیا تھا۔ وہ پچھلے کچھ عرصے سے اب تک کام کا یہ سلسلہ بحال رہا تھا۔

''آئندہ یہاں دکھائی دے گی تو ایسی حرکت کرے گی ناں......'' وہ بے رحمی اور نہایت سفاکی سے بولی تھیں۔

''مگر یہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اکیلی کس پر چھوڑوں گی۔'' شہناز کی آواز رندھ گئی تھی اور وہ فریاد کناں نظریں لیے کھڑی تھی۔

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے، تمہارا ہے۔'' اس کے بعد وہ رانو کو کبھی کسی کی طرف تو کبھی گھر میں بند کر جاتی تھی۔ اس کے اس عمل سے عجیب سی بے قراری اس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی تھی۔ مگر وہ اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ بھرنے کے لیے یہ سب کر گزرنے کے لیے مجبور تھی۔

آج بھی اس کا دل بے حد مضطرب تھا۔ اس کی بچی کو کل سے بخار تھا۔ اور مہینے کے آخری دن چل رہے تھے اور وہ اسے یہاں لے کر بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس لیے اسی حالت میں اس نے اسے گھر میں چھوڑ کر تالا لگا دیا تھا۔ وہ اسے کچھ کھلا کر اور دوا پلا کر گھر سے نکلی تھی مگر اس کا یہاں آکر بھی سارا دھیان اپنی بچی کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ اب اس کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی فارغ ہو کر گھر کی راہ لے گی مگر اس وقت اچانک پے در پے ملنے والے کاموں نے اس کا دل ہولا کر رکھ دیا تھا۔

''اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو جلدی، جلدی ہاتھ چلاؤ......'' بیگم صاحبہ کی بات پر وہ متحرک ہو گئی۔ تیز، تیز ہاتھ چلانے لگی۔ جتنی تیزی دکھائی اتنی ہی تیزی سے واپس جاسکتی تھی۔

وہ جب تک کاموں میں لگی رہی اس کا دھیان اسی طرف رہا کہ وہ جاتے وقت کس طرح رقم کا تقاضا کرنے گی۔ آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جاتے ہوئے رانو کے لیے کچھ کھانا بھی بیگم صاحبہ سے مانگ لے گی...... کیونکہ اس گھر کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی اصول تھا کھانا بے شک بچ جاتا، باسی ہو جاتا اور

پاکیزہ کے لیے

تم آرزو کے دیے جلا کر
خدا سے اچھی امید رکھنا
خزاں کے موسم کی رخصتی پہ
بہار گل کی نوید رکھنا
وہ تیرا رب ہے وہ تیرا اپنا
اسی کو دل کے قریب رکھنا
اسی سے کرنا تو دل کی باتیں
اسی کو اپنا حبیب رکھنا
اٹھا کے ہاتھوں کو اس کے آگے
تو آنکھ میں کچھ نمی بھی رکھنا
اسی سے راز و نیاز کرنا
اسی سے غم کی کہانی کہنا
اسی سے اپنی زبانی کہنا
رحیم ہے وہ
کریم ہے وہ
جہاں میں سب سے عظیم ہے وہ
اسی کو اپنے قریب رکھنا

مرسلہ: ام ایمان، ڈیرہ غازی خان

اگلے دن پھینکنے کی نوبت آجاتی۔ مگر یہاں تازہ کھانا مالکوں سے پہلے کوئی بھی ملازم نہیں کھا سکتا تھا اور وہ تو کھانا بناتے ہی چل دیتی تھی۔ اور اگر وہ رکتی تو اس کی بچی کی حالت اسے متفکر رکھتی تھی۔

وہ بریانی کو دم لگا کر فارغ ہوئی تھی جب اس نے دوپٹے سے اپنا پسینہ خشک کیا اور سوچا اب جاتے ہوئے بیگم شاہنواز سے رقم کا مطالبہ کرے گی تاکہ رانو کی دوا لے سکے...... تبھی باہر سے گاڑی کا ہارن بجا تھا اور اس وقت اس نے بیگم شاہنواز کی دیرینہ دوست کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ سرخ گلابوں کا بوکے لیے وہ گھر میں خوشدلی سے داخل ہو رہی تھیں اور بیگم شاہنواز والہانہ انداز میں ویلکم کر رہی تھیں۔ دونوں عرصے بعد ملی تھیں تو پھر نہ ختم ہونے والی باتوں کا ایک سلسلہ چل

نکلا تھا۔

''تم تو بڑی فٹ فاٹ ہو بھئی..... لگتا ہی نہیں اتنے برس بعد مل رہی ہو۔'' بیگم شاہنواز نے ان کی تعریف کی تھی۔

''ظاہر ہے اپنی فٹنس کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔'' وہ اِک ادا سے بولی تھیں۔

''کیا بات ہے بھئی بہت ہی خوب صورت تحائف لائی ہو۔'' بیگم شاہنواز نے اِک سرسری نگاہ ان تحائف پر ڈالی تھی۔ اس دوران شہناز نے..... بے قراری سے لاؤنج کے دو چکر کاٹ لیے تھے۔ تیسرے چکر پر بیگم شاہنواز نے ایک بے حد کاٹ دار نظر اس پر ڈالی تھی۔

''کیا بات ہے شہناز..... کیوں سر پر مسلط ہو؟ کیا کوئی کام وام نہیں ہے؟'' انہوں نے تلخی سے اس سے پوچھا تھا۔

''جی بیگم صاحبہ، میں پوچھ رہی تھی کہ سب کام ہو گئے ہیں تو میں.....'' ابھی اس کا جملہ ادھورا ہی تھا کہ وہ بولیں۔

''تو انتظار کرو ابھی ہم باتیں کر رہے ہیں بھوک محسوس ہو گی تو تم کھانا ٹیبل پر لگا دینا۔ میں ابھی آواز دیتی ہوں۔'' شہناز نے الجھن اور اضطراب سے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا تھا جو شام کے سات بجا رہی تھیں۔ شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ پرندے چہچہاٹ لیے اپنے، اپنے گھروندوں میں جا بسے تھے اور وہ خود بھی اپنے گھر، اپنے آشیانے میں جانے کو اور اپنی رانو کو اپنی ممتا کے سائے میں لینے کو بے قرار تھی۔

''نہ جانے رانو کیا کر رہی ہو گی؟'' وہ کچن کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھی سوچ میں گم تھی۔ جب اپنے نام کی آواز سنائی دی۔ اور اس نے جھٹ پٹ لپک جھپک سارا کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگا دیا تھا۔ دو ہی تو سہیلیاں تھیں مگر ڈائننگ ٹیبل کھانوں سے سج گئی تھی۔ شہناز نے حسرت بھری نگاہ اس طعام پر ڈالی تھی۔ اس کا دھیان پھر رانو کی طرف چلا گیا تھا۔

''اماں جب تو آئے گی ناں تو میرے لیے گڑیا لانا۔'' رانو نے تپتے ہوئے چہرے کے ساتھ ایک آس سے کہا تھا۔

''ہاں میری بچی لاؤں گی۔'' اس نے بھی اسے تشفی دی تھی۔ رانو نے پھر آنکھ موند لی تھی۔

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ اور پریشے نے دل کھول کر سراہا تھا۔

''اِدھر آؤ، یہ لو اپنا انعام۔'' پریشے کے ہاتھ میں ہزار کا نوٹ تھا۔ شہناز کا دل جھوم اٹھا تھا۔

''ارے پاگل ہوئی ہو کیا؟ اتنے پیسے ان دو ٹکے کے لوگوں پر نچھاور کر دیں تو یہ سر پر چڑھ جائیں گے۔ تم ایسا کرو بس سو دو سو دے دو۔'' بیگم شاہنواز نے فوری ٹوکا تھا۔ پریشے نے کندھے اچکائے تھے اور اپنے پرس کو ٹٹولتے ہوئے سو کا نوٹ تلاش کر کے شہناز کو تھما دیا تھا۔

''سوری اتنی ہی رقم تھی۔'' شہناز نے دیکھا ان کا بیگ ہزار، ہزار کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

''بیگم صاحبہ..... رانو بیمار ہے اب میں جاؤں؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔ بیگم شاہنواز نے سر ہلا دیا تھا۔

''جانے سے پہلے اسلم سے بولو چائے بنا دے اور تم جلدی، جلدی برتن سمیٹ کر جاؤ۔''

''بیگم صاحبہ کیا میں تھوڑے چاول لے جا سکتی ہوں۔'' اس نے اپنی انا کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اپنی اولاد کے لیے۔

''ہاں بھئی لے جاؤ، میں تو دیکھ رہی تھی وہاں کونے میں کھڑی تم ہمارے لقمے گنتی جا رہی تھیں۔ شوہڑے لوگ کہیں کے۔'' بیگم شاہنواز نے تذلیل سے کہا مگر شہناز کو ذلت کی پروا کب تھی اس کے کانوں میں رانو کی آواز آئی تھی۔

''اماں آج کھانا ضرور لانا۔'' تو پھر کیسی ذلت کہاں کی ذلت..... لختِ جگر کا پیٹ تک لگا پیٹ آنکھوں کے سامنے تھا۔

❁ ❁ ❁

ناولٹ

خام خم

صائمہ قریشی

میں نے انتہائی بے دلی سے شیروانی کا اوپری بٹن کھولا، گہری سانس لے کر اپنے تنے ہوئے اعصاب کو بحال کیا، ہاتھ سے پیشانی کو مسل کر تیوریوں کو زائل کرنے کی بھی ایک کوشش کی، دل کو مسکرانے پر آمادہ کیا اور ہاتھ بڑھا کر دروازے کی ناب گھمائی اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

میری ہدایت کے مطابق یا شاید میری حد درجہ بیزاری کو دیکھ کر کمرے کو بہت سادگی سے سیٹ کیا گیا تھا، اگر سامنے بستر پر وہ سرخ جوڑے میں موجود نہ ہوتی تو یہ کمرا کسی بھی زاویے سے حجلۂ عروسی نہیں لگ رہا ہوتا، میں نے ایک بیزار نگاہ سے اس کی طرف دیکھا، ارادہ اسے نظر انداز کر کے گزر جانے کا تھا لیکن یک دم ایک مہک کا احساس ہوا ایک جانی پہچانی خوشبو کا۔ میں نے چونک کر دلہن کی طرف دیکھا، گھونگٹ نکالے بیٹھی دلہن کے ہاتھوں پر مہندی کی مہکار سے کمرا معطر تھا، میں برق رفتاری سے آگے بڑھا۔ جوں جوں اس کی جانب بڑھ رہا تھا خوشبو کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس کے پاس پہنچا اور بنا اسے دیکھے، ایک لفظ کہے بغیر اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

''یہ رنگ، یہ خوشبو، یہ ڈیزائن، کیسے فراموش کر سکتا تھا؟'' میں وارفتگی سے ان ہاتھوں کو دیکھے جا رہا تھا۔

''تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''بولو ناں؟'' اس نے سر جھکا لیا تھا، گویا اقرار سے

کترا رہی تھی میں بضد ہوا۔

"جب ہاتھوں پر آپ کے نام کی مہندی لگاؤں گی تب اس مہندی کا ڈیزائن اور رنگ بتائیں گے کہ مجھے آپ سے کتنی محبت ہے۔" شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا تھا۔

"یہ کیا بے ایمانی ہے۔" میں نے اس کے جواب پر اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا تو اس کی ہنسی کی جلترنگ نے مجھے مسحور کر دیا۔

"وہ ڈیزائن ایسا دلکش ہوگا، وہ رنگ اتنا دلنشیں ہوگا، وہ مہک ایسی انوکھی ہوگی کہ دیکھتے ہی آپ کو میری محبت کی گہرائی کا اندازہ ہوگا۔" اتنا کہہ کر اس نے آنچل میں چہرہ چھپا لیا تھا۔ میں مبہوت سا اس کی اس ادا کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

اب میں اس کے سامنے بستر پر دوزانو بیٹھا تھا، اس کے دونوں ہاتھوں کو تھامے میں نے اس کی ہتھیلیوں پر آویزاں مہندی کو دیکھا۔

وہ ڈیزائن دلکش تھا۔ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

وہ رنگ دلنشین تھا۔ مہندی کے ایسے انوکھے رنگ سے میں نا آشنا تھا۔ وہ مہک انوکھی تھی۔ ایسی خوشبو سے آج سے پہلے میں انجان تھا۔

مجھے اس کی محبت کی شدت کا اندازہ ہونے لگا تھا، میں دیوانہ وار اس کے ہاتھوں پر لگی مہندی کی خوشبو کو اپنے اندر اتارنے لگا۔

☆☆☆

برسوں سے یہ منظر دیکھ رہا ہوں، سورج کے ڈوب جانے سے آسمان کی وسعتوں میں عجب سا سکوت طاری ہو جاتا ہے، ویرانی، خاموشی اور اداسی۔ تھکے ہارے پرندے اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہوتے ہیں، کچھ چہکتے ہوئے، خوش اور سرمست..... معلوم ہوتا ہے کہ دن بھر کی محنت نے انہیں کامیابی عطا کی ہے اور کچھ کی پرواز میں ایک تھکان کا عنصر واضح ہوتا ہے۔

اتنی یاسیت کے باوجود شام کا یہ منظر میرے لیے تسکین کا باعث ہوتا، شام میں ایک عجیب سا سرور ہوتا ہے۔ یہ وقت میرے لیے پسندیدہ ترین پہر تھا۔ دن بھر کی تھکان کے بعد شام کی چائے کا جو لطف آتا تھا وہ میں کھڑکی میں کھڑے ہو کر ڈوبتے سورج کی لالی کے ساتھ اٹھاتا جاتا، ایک لذت بھری شام اور میں.....

سورج کے ڈوبتے ہی میں وہاں سے ہٹ جاتا، چائے کا مگ بھی خالی ہو چکا ہوتا اور میری تھکان بھی کسی حد تک کم ہو چکی ہوتی تھی۔

یوں ہی شب و روز گزر رہے تھے یا میں شاید گزار رہا تھا۔

جب بزنس گھر کا ہو تو سب سے چھوٹے بیٹے کے لیے ہی الگ ہوتے ہیں اور پھر اگر بیٹا ہونہار ہو تو لاڈ چار گنا بڑھ بھی جاتے ہیں، لائق فائق طالب علم تھا، ماں باپ کا فرمانبردار بھی تھا، کوئی بری لت بھی نہ تھی تو ایسے میں من مانیوں کا موقع مل جاتا ہے، ان دنوں پڑھائی، گھومنے پھرنے اور موج مستی کے علاوہ میری کوئی سرگرمی نہ تھی، مجھ پر کوئی بظاہر ذمے داری نہ تھی۔

مجھے سیاحت کا شوق تھا، نصابی سرگرمیوں کے علاوہ جب بھی وقت ملتا میں دنیا کھوجنے نکل جاتا، نئے، نئے لوگوں سے ملنا، ان کی عادات و اطوار کو جاننا، ان کے رہن سہن کا موازنہ کرنا..... مجھ پر جیسے ایک جنون سوار ہوتا۔ بہت کم وقت ہوتا تھا جب میں گھر میں پایا جاتا، گھر والوں کو وقت دینا مجھے دنیا کا مشکل ترین کام لگتا تھا، پڑھائی ختم ہوتے ہی مجھ پر دنیا کی سیر کا بھوت سوار ہونے لگا، اب میں قریبی علاقوں کے بجائے دور دراز علاقوں میں جانے لگا تھا، اپنے ہی وطن کے شمالی علاقہ جات جیسے ناران، کاغان، کشمیر، جھیل سیف الملوک، سوات، گلگت، خون کو منجمد کرتی سردی کے مزے لینا اور دونوں ہاتھوں میں چائے کے بڑے سے مگ کو دبوچ کر کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر شام کے منظر کا لطف لینا جیسے میرا محبوب مشغلہ تھا۔

میرے جنون کا آغاز اپنے ہی ملک سے ہوا تھا۔ ان دنوں میرا جنون بھی جوان تھا اور میرا خون بھی پُرجوش۔

چھ مہینے کے دورے کے بعد میں گھر لوٹا تو ممی، بابا اور بہن بھائی سے ملا۔ مختلف جگہوں سے خریدے گئے سب کے تحائف ان کو دے کر پچھلے چھ مہینے تک رابطہ نہ رکھنے کا گلہ دور کر دیا لیکن ممی راضی نہ ہوئیں، میں اچھا بھلا کسی چاق و چوبند گھوڑے جیسا تھا جانے کیوں ممی کو میں کمزور لگا۔

"کھانا نہیں کھاتے تھے کیا؟" ممی کی ممتا بھری آواز پر میں ہنس دیا۔

"ممی بھلا کھائے بغیر بھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے۔" میری ہنسی کو انہوں نے خفگی بھری نگاہوں سے دیکھا تو میں نے ان کے گرد بانہوں کو پھیلا کر لاڈ کیا۔

"چل ہٹ پرے۔" ممی نے میرے بازوؤں کو

دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا تو میں چیخنے لگا۔ ممی کا انداز ان کے الفاظ کی ایک فیصد بھی عکاسی نہیں کر رہا تھا۔ میری ہنسی پر وہ بھی مسکرا دیں۔

"جلدی گھر آجایا کر۔" ممی کی ممتا بھری التجا نے پل بھر کے لیے مجھے خاموش کر دیا۔

"ممی ایسا کریں میری شادی کروا دیں گھر میں واپس آنے کے لیے کوئی اٹریکشن بھی تو ہونی چاہیے ناں۔" میں اپنے ازلی شوخ و شنگ لہجے میں بولا۔

"یعنی ماں باپ اور بہن بھائی میں تمہیں کوئی اٹریکشن نظر نہیں آتی۔" اسی لمحے نور کمرے میں داخل ہوئی، اخلاقی لحاظ سے تو ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیے تھا کہ نور ہم چاروں میں سب سے بڑی تھی لیکن اس کے لاکھ نو کہنے، شور مچانے پر کہ چھوٹے بہن بھائی اس کو آپی، باجی کہیں، آپ جناب جیسے القاب سے مخاطب کریں ہمارے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی اور ہم پچاس لوگوں کے سامنے بھی دھڑلے سے اسے "نور تم یہاں آؤ، تم ایسے کرو......" وغیرہ، وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اس کی قہر آلود نظروں کو نظر انداز کر کے اسے مزید طیش دلاتے لیکن اثر کوئی نہ لیتے۔

"ماں باپ اور بہن بھائیوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے نور کی بات پر بھویں اچکا کر دیکھا تھا۔

"تم زیادہ ہی آوارہ گردی کے شیدائی نہیں ہوتے جا رہے ہو؟" میری بات کی وضاحت پر نور نے ہمیشہ کی طرح اپنا "بڑا پن" جھاڑا۔

"یہی تو دن ہیں گھومنے کے پھر کہاں ہم کہاں یہ فرصتیں۔" میں نے پھر شوخ لہجے میں کہا۔

"خواہ مخواہ کی فضول خرچیاں، خود کماؤ تو ایسے اڑاؤ ناں۔" وہ ہمیشہ مجھے یوں ہی سیر سپاٹوں سے روکے رکھتی تھی۔ اس کے خیال میں مجھے اب ذمے داری اٹھانی چاہیے اور وقتاً فوقتاً وہ ممی اور بابا کے کانوں میں بھی یہ بات ڈالا کرتی تھی۔

"کما بھی لوں گا ابھی کیا جلدی ہے۔" میں نے اسے پھر چڑایا۔

"شکر ہے تم میری ساس نہیں ہو، نہیں تو جینا دوبھر کر دیتیں۔" اس کے گھورنے پر میں نے ناک بھوں چڑھا کر اسے کہا۔

"دیکھا ممی آپ نے۔" وہ روہانسی انداز میں ممی کی شکایت کر... [illegible]

"ممی اس نوری کو اس کے والدین کو واپس کر دیں..." اس کی روک ٹوک پر ہم تینوں ڈھیٹ بن کر کہتے تو نور کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور پھر بس وہ وہ خطائیں بھی گنوا جاتیں جو ہم نے کبھی کی ہی نہیں ہوتیں۔

"لو حد ہوگئی ممی، بابا، اب بڑی بہن کو سوتیلی کہا جائے اور آپ دونوں خاموش رہیں گے؟" اس کے احتجاج بلند ہوتے تو ممی ہمیں ڈانٹ دیتیں۔ لیکن جو بھی تھا نور میں ہماری جان تھی۔ ہماری بہت لاڈلی بہن بہت پیاری اور وہ بھی جانتی تھی کہ فرحان، عندلیب اور سمیع اس سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات جو بعض اوقات ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہوتی تھی کہ ممی اور بابا اکثر فیصلوں میں ان کی مرضی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

فرحان، نور سے چھوٹا تھا پھر عندلیب اور پھر میں یعنی کہ سمیع...... فرحان، بابا کے ساتھ بزنس میں لگا تھا میرے نام کا بزنس بھی سیٹ تھا لیکن دیکھ بھال فرحان اور بابا کے ذمے تھی۔ عندلیب پڑھ رہی تھی اور میں بھی یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔

نور نے اکنامکس میں ماسٹرز کیا تو اس کے لیے رشتے آنے شروع ہو گئے تو ہمیں جیسے ایک بات مل گئی نور کو زچ کرنے کے لیے جب تک اس کو تنگ کر کر کے رُلا نہ دیتے ہمیں نہ آتا اور اس سب کا انجام ممی کی ڈانٹ پر ہوتا۔

"جب چلی جاؤں گی ناں تو لگ پتا جائے گا۔" بھرائی آواز میں نور ہمیں اپنی اہمیت کا احساس دلاتی تو ہم تینوں جو اس کو تنگ کرتے تھے یک دم اس کی ایموشنل بلیک میلنگ میں آجاتے۔ معافیاں تلافیاں کر کے نور سے ہی کچھ کھانے کے لیے بنوا کر پھر اس کو تنگ کرنے لگتے تھے۔

میری یوں تو تینوں سے دوستی تھی تینوں نے میرے لاڈ اٹھائے تھے پھر بھی نور سے میری ایک خاص دوستی تھی، مجھے لگتا تھا سمیع کمال کو اگر کوئی جانتا ہے تو وہ نور ہی ہے، جہاں میں اس کو خوب تنگ کرتا تھا وہاں میں اس سے باتیں بھی شیئر کر لیا کرتا تھا، یونیورسٹی کی، فرینڈز کی، لڑکیوں کی۔ کبھی وہ اچھا مشورہ دیتی تو کبھی دھمکیاں۔ مشوروں پر تو عمل کرنے کی کوشش کرتا اور دھمکیوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا تھا۔

میں کوئی عاشق مزاج لڑکا نہ تھا، مجنوں وغیرہ کا اسیر تو تھا... [illegible]

کو دوری پر رکھا ہوا تھا۔ میرے خیال میں محبت "فل ٹائم" جاب ہوتی ہے جس کو مکمل دلجمعی اور پوری بھری جیب سے نبھانا پڑتا ہے۔ میرے جیسا لاابالی لڑکا قطعی اتنی سنجیدگی سے محبت کو نہیں نبھا سکتا تھا۔ میں تو محبت کو پارٹ ٹائم نبھانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا تھا، یہ چھوٹی موٹی کہانیاں بھی سمیع کمال کے بس کی بات نہ تھیں، اپنے آپ کو محبت کے معاملے میں، میں نے نااہل قرار دے دیا تھا، یوں بھی مجھ پر میرے اپنے جنون مکمل طور پر حاوی تھے تو میں مزید کسی جنون کا بوجھ اٹھا نہ سکتا۔

ویسے میں کوئی بورنگ لڑکا بھی نہ تھا، اپنے محدود حلقہ احباب میں مجھے اچھی خاصی اہمیت حاصل تھی، میں گائی "ان" اور "ڈیمانڈنگ" کیریکٹر تھا، بس میرے جنون الگ تھے، میرے شوق دوسرے تھے۔

میری بزنس مینجمنٹ کی ڈگری بھی مکمل ہو چکی تھی میرا ارادہ اب ورلڈ ٹور کا تھا۔ مجھے کسی قسم کی اجازت کی بھی ضرورت نہ تھی اور پیسوں کی بھی کمی نہ تھی، اس معاملے میں میں بہت خوش قسمت تھا۔ بابا اور ممی نے کبھی ایسی روک ٹوک نہیں کی جو ہمیں بغاوت پر اکسانے لگتی لیکن ان کا پیار اور لگاؤ ہمیں کہیں جانے نہ دیتا۔ ورلڈ ٹور کا پروگرام بناتے، بناتے اچانک میں نے سوچا کہ اگلے چھ ماہ تک میں بابا کی مدد کروں گا، ممی کی شکایت دور کروں گا۔ نور اور عندلیب کو خوب تنگ کروں گا۔ میرے اس فیصلے سے سب سے زیادہ خوشی نور کو ہوئی تھی، کیوں نہ ہوتی اس کی تو دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی اور پھر میں نے بھی تھوڑی سی چالاکی دکھا کر ساری بات اسی پر ڈال دی۔

"سمیع کمال تم اتنے فرمانبردار ہو تو نہیں پھر یہ اچانک کی تبدیلی؟" نور نے تشویش ناک نگاہوں کو مجھ پر مرکوز کیا۔

"میں نے سوچا تم بڑی ہو تو یقیناً ٹھیک ہی کہہ رہی ہو گی تمہاری بات مان کر دیکھ لیا جائے۔ کیا پتا فائدہ ہی ہو جائے۔" اپنے الٹرا انداز سے اس کو زچ کرنا مجھے بہت بھاتا تھا۔

"سمیع کمال تم ناں....."

"سمیع کمال تم بہت اچھے ہو۔" وہ کچھ کہتے، کہتے رکی تو میں نے اس کا جملہ مکمل کیا جس پر وہ پیر پٹختی ممی کے پاس جا کھڑی ہوتی۔

میں نے بابا اور فرحان کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ چند ہی دنوں میں مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ ذمے داریاں نبھانا واقعی دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس وقت اگر کوئی میرا حوصلہ بڑھا رہا تھا تو وہ میری بہنیں ہی تھیں۔ ان کے لاڈ پیار پر میں نے اب ان دونوں کو تنگ کرنے کا ارادہ ترک کرنے کا سوچ لیا تھا۔

ابھی میں آفس کے وقت کی پابندی پر مکمل طور پر پابند نہ ہوا تھا کہ اس روز شام کی چائے پر جب ہم سب ساتھ تھے تو ممی نے اعلان کر دیا کہ نور کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ میں نے یک دم نور کو دیکھا اس کی نظریں جھکی ہوئی چہرے پر شرم و حیا کے رنگوں کا حسین امتزاج اس لمحے میری بہت پیاری نور کو بہت دلکش بنا رہا تھا۔

"سمیع کمال کیا سانپ سونگھ گیا ہے؟" عندلیب نے میرے کھوئے انداز پر ہنس کر کہا۔

"مجھے کسی نے بتایا کیوں نہیں؟ نہ کسی نے مشورہ لیا؟ مانا میں سب سے چھوٹا ہوں لیکن کمال ہاؤس کا فرد تو ہوں ناں اور اب تو میں نے بھی بزنس سنبھالا ہوا ہے۔" نہ جانے کیوں مجھے غصہ آنے لگا تھا، دراصل یہ غصہ نہیں نور کی رخصتی کا منظر یک دم ہی میری آنکھوں کے آگے لہرانے لگا تھا، دل میں اچانک اس کے لیے بہت سارا پیار جاگنے لگا تھا جس کو چھپانے کے لیے میں نے ماتھے پر بل ڈال لیے۔ یوں بھی میں برملا محبت کا اظہار کرنے والوں میں سے نہ تھا، میرے لیے سب بہت خاص تھے اور میں جانتا تھا کہ سب یہ بات جانتے ہیں پھر میں کیوں خواہ مخواہ جتایا کروں! مجھے اعتراض نور کا رشتہ طے ہونے پر نہیں مجھے لاعلم رکھنے پر تھا، آخر میں بھی تو نور کا بھائی تھا.... بے شک چھوٹا تھا، بے شک اتنا ذمے دار نہ تھا، کیا تھا جو اس سے لڑائی کرتا تھا گھر والوں کو مجھے میرے حق سے محروم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اپنے تاثرات چھپانے کے چکر میں بہت سی منفی سوچیں مجھ پر حاوی ہونے لگی تھیں۔ میری اس شکایت پر سب نے حیرانی سے مجھے دیکھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ نور میری اس شکایت پر مسکرانے لگی تھی۔ اگلے لمحے میں نے وہاں سے واک آؤٹ کر کے سب کو مزید حیران کر دیا۔

☆☆☆

"کیا ہوا؟ میرا راجا بھیا کیوں منہ بسورے بیٹھا ہے؟" میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب کسی سے بات نہیں کروں گا، یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اب نور کی شادی میں شرکت ہی نہیں کروں گا۔ ورلڈ ٹور کا جو پروگرام ترتیب دے رہا تھا اس پر عمل کرنے کے لیے کمرے سے واک آؤٹ کرتے ہی سوچ لیا تھا، انہی منفی سوچوں کے زیر اثر میں نہ جانے کیا، کیا سوچے جا رہا تھا کہ نور کی

مخصوص شائستہ آواز پر میں نے نروٹھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے چلتی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی کسی بچے کی طرح مزید منہ لٹکا کر پہلو بدل کر رخ موڑ لیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو میں ایسے ہی تم سے مشورہ کیے بنا شادی کے لیے راضی ہو جاؤں گی؟" نور نے میرے بالوں کو منتشر کرتے ہوئے ملائمت سے پوچھا۔ میں نے شکایت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

"می نے صرف ایک بات کی ہے، ابھی کچھ فائنل نہیں ہوا ہے۔" وہ میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر وضاحت دینے لگی تھی لیکن اس کی نگاہیں یک دم ہی جھکی تھیں، لاکھ پُراعتماد سہی، ہزاروں بار کہا کہ "میں بڑی ہوں" لیکن میرے سامنے اپنی شادی کی بات کرنے پر نور کا شرم سے گلنار چہرے نے میرا سر فخر سے بلند کیا تھا۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو ناں؟" میں جانتا تھا وہ اس وقت صرف مجھے بہلا رہی ہے، میرے اعتراض پر مجھے راضی کر رہی ہے جبکہ حقیقت یہی تھی کہ اس کے اور عمار بھائی کے رشتے پر سب متفق تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے بھی ایک بے ضرری ضد چھوڑ دی اور اگلے پل واپس اپنی "ڈھیٹ جون" میں لوٹ آیا اور نور کو تنگ کرنے لگا۔

"میری پیاری بہنیا بنے گی دلہنیا، سج کے آئیں گے دولھے راجا۔" میں باقاعدہ بھنگڑا ڈالتے نور کے اور گرد گھومنے لگا۔

میرے گانوں کی آواز سن کر عندلیب اور فرحان بھی آگئے تھے اور پھر..... جو دھمال مچی کہ آخر میں می اور بابا نے ہم سب کی بینڈ بجادی۔

☆☆☆

ان دنوں میرے شب و روز ایک مخصوص ڈگر پر نہایت مسبک رفتاری سے گزر رہے تھے۔ زندگی میں کوئی ہلچل نہ تھی، اپنے شوق بھی میں پس پشت ڈال کر آفس اور گھریلو زندگی گزارنے لگا تھا، مجھ جیسا لاابالی، ہمہ وقت ہنگاموں کا شیدائی لڑکا ان دنوں ایک "ٹیپکل روٹین" میں گھرا شدید قسم کی بوریت کا شکار ہو رہا تھا۔

طبیعت میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا آفس میں صبح سے شام کرنے کے علاوہ میرے کوئی مشاغل نہ تھے۔ زندگی یوں تو مزے میں تھی، کوئی تشنگی نہ تھی لیکن میں بور ہونے لگا تھا اس روٹین سے جھنجلانے لگا تھا کہ انہی دنوں نور کی شادی کی تیاریاں شروع ہونے لگیں تو کمال ہاؤس میں بھی ذرا ہلچل مچنے لگی اور مجھے بھی اپنی بورنگ صبح، شام میں ذرا سا ہلا گلا مچتا محسوس ہوا۔ ہم بھی رخصتی کے دکھی گیت گانے لگتے تو کبھی مستی بھرے گانوں سے نور کو تنگ کرنے لگتے۔ گھر کی پہلی شادی تھی اور یوں بھی لڑکی کی شادی کی رونق ہی الگ ہوتی ہے، عندلیب اور نور کے بازاروں کے چکر میں زیادہ تر میری ہی شامت آئی رہتی تھی۔

"ایک تو مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ میں ہی سب کو کھلے کاموں کے لیے کیوں میسر نظر آتا ہوں؟" میں ابھی، ابھی آفس سے لوٹا تھا ابھی ٹھیک سے فریش بھی نہ ہوا تھا کہ نور آدھمکی۔

"سمیع پلیز چلے چلو ناں، دیکھو پھر کب میں تمہیں کوئی کام کہہ سکوں گی۔" وہ بھی بڑی تیز تھی فٹ سے بلیک میلنگ پر اتر آئی۔

"کہاں جانا ہے اب؟" اس کی مسکین شکل کو قہر آلود نظروں سے دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"سمیع وہ دراصل....."

"دیکھو میں پارکنگ میں گاڑی روکوں گا اور کوئی بیگ بھی نہیں اٹھاؤں گا۔" عندلیب کچھ بولنے ہی والی تھی کہ میں نے پہلے ہی وارننگ دے دی۔ ہفتے بھر سے شاپنگ کے دوران اپنی درگت بنتے دیکھ چکا تھا اس لیے پہلے سے طے کرنے لگا تھا۔

"ہم شاپنگ کرنے نہیں جا رہے سمیع کمال۔" نور میرا پورا نام تبھی بلاتی تھی جب اسے میری کوئی بات بری لگتی تھی اور اکثر وہ میرا پورا نام ہی بلا رہی ہوتی تھی اس لیے مجھے اب حیرت نہیں ہوتی تھی۔

"تو کہاں جانا ہے؟" میری حیرت بجا تھی۔

"ہم نے مہندی والی کا پتا کرنا ہے۔" عندلیب نے جواب دیا۔

"ہیں..... مہندی والی کا پتا کرنے؟" مجھے واقعی حیرانی ہوئی تھی۔

"سمیع کمال۔" نور نے دانت پیس کر میرے حیرت زدہ چہرے کو دیکھا۔

"سمیع کمال تم اتنے نا سمجھ لگتے تو نہیں۔" نور نے چادر کو اچھی طرح اوڑھ کر طنزیہ کہا۔

"اس میں نا سمجھی والی کیا بات ہے؟ مہندی والی کا کہاں سے پتا کرنا ہے وہی تو پوچھا ہے؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"ذفرانسان نور کی شادی پر جو مہندی لگائے گی اس کی طرف جاتا ہے۔" عندلیب نے خشمگیں نگاہیں مجھ پر مرکوز کر کے بتایا۔

"تو پتا کرنے کی کیا بات ہے، جس پارلر سے تیار ہو گی وہاں سے مہندی بھی لگوا لیتا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"سبیح تایہ لڑکی بہت مشہور ہے، اس کی مہندی بہت انوکھی ہوتی ہے۔" عندلیب نے مجھے بتایا۔

"انوکھی کیسے؟ اب کیا وہ خود مہندی بنا کر لگائے گی؟" میں نے تمسخرانہ انداز میں تپ کر کہا۔

"ہاں سبیح کمال، ایسا ہی ہے۔" اب کے نور بولی۔

"یار ایک تو تم مجھے سبیح کمال کہنا بند کرو اب ایسا بھی کیا کہ۔۔ "سبیح کمال، سبیح کمال" کیے جا رہی ہو۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا تو نور زیرِ لب مسکرا کر رہ گئی۔

"کیا واقعی؟" ان دونوں کی مہندی خود بنانے والی اطلاع میرے لیے نئی تھی تو میرا چونک جانا بھی لازمی تھا۔

"ہاں واقعی اور اب مہربانی فرما کر چلو تاکہ بروقت اس کے ساتھ وقت طے کر لوں یہ نہ ہو عین وقت پر وہ مصروف ہو۔" نور نے مزید کوئی وضاحت دینے کے بجائے جلدی، جلدی کا شور مچا دیا تو چاروناچار مجھے ان کے ہمراہ روانہ ہونا پڑا۔

☆☆☆

گلی میں اینٹیں لگی تھیں، درمیان میں ایک نالی بنی ہوئی تھی جہاں اردگرد کے سارے گھروں کا گندہ پانی یقیناً ہر وقت بہتا رہتا تھا۔ گلی میں اتنی جگہ نہ تھی کہ گاڑی آگے تک جاتی، میں نے گاڑی کو گلی کے نکڑ پر پارک کیا، سوچا تھا کہ نور اور عندلیب کے ساتھ نہیں جاؤں گا لیکن ایک تو شام کا وقت تھا دوسرے علاقہ میرے لیے نیا تھا اس لیے گاڑی پارک کر کے میں بھی ان دونوں کے ہمراہ چل پڑا۔

"خانم یہیں ہوں گی؟" بوسیدہ در و دیوار کی وہ ایک عام سی چار دیواری تھی، لکڑی کے گیٹ پر لگی زنجیر کو پکڑ کر دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھولنے والا ایک لڑکا تھا۔ میرے لیے پہلی حیرت کی بات تو "خانم" تھی۔ اور پھر یہ جگہ، گھر ایسا نہ تھا کہ لگتا کہ کوئی مشہور ہستی یہاں رہ سکتی ہے۔

"آپ کون ہیں؟" اس لڑکے نے ان دونوں کو بغور دیکھا، مجھے بھی ایک نگاہ دیکھا اور تشویش ناک لہجے میں پوچھنے لگا۔

"خانم کو بلا دیں، ہم نے ان سے بات کرنی ہے۔" نور نے ذرا رعب دار آواز میں کہا تو وہ لڑکا بنا کچھ کہے اندر چلا گیا۔ میرے ماتھے کے بل مزید گہرے ہوئے تھے، نور نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تسلی دی۔

"السلام علیکم۔" میں رخ موڑے کھڑا تھا کہ ایک اجنبی نسوانی آواز پر یک دم پلٹا۔

"وعلیکم السلام۔" نور نے جواب دیا جبکہ عندلیب نے فقط سر ہلایا تھا۔ ایک بڑی سی مختلف رنگوں کی چادر میں سر تا پیر لپٹی اس لڑکی نے میری طرف دیکھا تو میں جو یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا سٹپٹا کر نگاہیں پھیر لیں۔

"آپ کون ہیں؟" اس نے مدھم آواز میں پوچھا۔

"ہم نے مہندی کے لیے بکنگ کروانی ہے۔" عندلیب نے اگلے لمحے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"کیا آپ ہی خانم ہیں؟" نور یقیناً اس کی صورت سے انجان تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے دیکھا، دھان پان سی لڑکی اور اتنا بھاری بھرکم نام اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات کہ وہ مشہور بھی تھی۔ جبکہ حلیے سے وہ نہایت عام سے بھی عام لگ رہی تھی۔

"شادی کب ہے؟" وہ بہت مختصر سی بات کر رہی تھی، مجھے عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی جھجک کی وجہ میری وہاں موجودگی ہے۔

ایک دم مجھے احساس ہوا اس میں تو اخلاق نامی کوئی چیز نہ تھی، بھلا کوئی یوں دروازے میں کھڑے ہو کر اتنی اہم بات کرتا ہے؟ نور اور عندلیب اسے ساری تفصیل سے آگاہ کرنے لگیں تقریباً دس پندرہ منٹ تک ہم وہاں دروازے پر یوں ہی کھڑے رہے۔ نور نے اسے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا اور وقت وغیرہ مقرر کر کے ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔

"اس کا رویہ انتہائی غیر اخلاقی تھا۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے اپنے نادر خیالات کا اظہار کیا۔

"کیوں؟ تم کیا امید لگا کر آئے تھے کہ وہاں تمہاری خاطر تواضع کی جائے گی؟" عندلیب نے بھویں سکیڑ کر مجھے دیکھا تھا۔

"خاطر مدارات نہ سہی لیکن کچھ تو اخلاقیات نبھانی چاہیے تھی۔" میں اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

"اسے اجازت نہیں ہے اس لیے اس نے ہمیں اندر نہیں بلایا، وہ کہیں بھی اکیلی نہیں جاتی ہے۔ اپنی ماں کو ہمیشہ ساتھ رکھتی ہے۔" نور نے میری بات کا جواب دیا تو میں نے چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پہلی نظر میں ہی رائے نہیں قائم کر لینی چاہیے

دوسروں کے حالات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنے چاہیے۔" نور نے ہمیشہ کی طرح فلسفہ جھاڑا تو میں نے اب خاموش ہوجانے میں ہی عافیت جانی۔

"اور ہاں سمیع، خانم کو پک اینڈ ڈراپ ہم نے کرنا ہے تو چند دن تک تمہیں اور عندلیب کو آنا پڑے گا۔" میں گاڑی چلا رہا تھا کہ نور کے نئے حکم پر میں بلبلا کر رہ گیا لیکن انکار نہ کرسکا۔

"اچھا....." فرمانبرداری کی انتہا پر نور نے اچٹتی نگاہوں سے دیکھا لیکن میں سپاٹ تاثرات کے ساتھ ڈرائیونگ کرتا رہا۔

بہر حال ہم وہاں سے روانہ ہوکر گھر آچکے تھے، عندلیب اور نور اپنے، اپنے کاموں میں مصروف ہونے لگی تھیں تو میں بھی اپنی روٹین میں مصروف ہونے لگا... میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ نور کی شادی سے فارغ ہوتے ہی کچھ عرصے تک کے لیے آفس سے چھٹی لے کر اپنے ادھورے جنون کو پورا کروں گا۔

☆☆☆

آج کل ویسے بھی دن بے حد مصروف تھے، آفس میں چند تبدیلیوں کے باعث دن بھر سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ہوتی تھی اور پھر نور کی شادی کے دن بھی قریب آرہے تھے، اس روز میں دوپہر کو گھر آگیا تھا، بہت دنوں سے مکمل آرام میسر نہ ہوا تھا ایک دو دن میں نور کی شادی کی تقریبات بھی شروع ہونے والی تھی۔ میں کچھ دیر سکون سے سونا چاہتا تھا تو میں اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ میری شروع سے عادت تھی میں سونے سے پہلے کمرے کا دروازہ بھی لاک نہیں کرتا تھا، کہیں بھی ہوتا میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہی ہوتا، عجیب سا ایک واہمہ تھا کہ ایسے ہی سوئے ہوئے اچانک میری موت ہوگئی تو اگر دروازہ بند ہوا تو کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔ لیٹتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی جو اس بات کی غماز تھی کہ تھکان اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن نہ جانے کیوں ذہن میں ایک ہلچل سی مچنے لگی تھی، لاشعور میں کچھ تھا جو ذہن کو جگائے رکھے ہوئے تھا۔

میں نے ذہن کو تھپکی دے کر سلانا چاہا۔ بہ مشکل آدھا گھنٹا گزرا ہوگا کہ چند گنگناتی چوڑیوں کی چھنکار نے سوئے ذہن کو پھر اسے بیدار کردیا۔

"آپ ادھر ہی رکیں میں کمرے میں دیکھ کر آتی ہوں۔ یہ آواز عندلیب کی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور پھر سونے لگا۔

تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ ایک عجیب سی خوشبو نے مجھے پھر جگا دیا۔ عندلیب اور نور کی مدھم آوازیں جو میرے کمرے کے کھلے دروازے کی بدولت مجھ تک پہنچ رہی تھیں یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی مدھم باتوں اور ہنسی نے مجھے ڈسٹرب کردیا۔ اور میں حیران بھی تھا کہ یہ مہک کیسی ہے؟ میں نے تکیے سے چہرے کو ڈھانپ کر پھر سونے کی کوشش کی لیکن وہ خوشبو اتنی تیز تھی کہ تکیے سے بھی میری ناک تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے جھنجلا کر تکیے کو دور پھینکا اور اٹھ کر باہر نکلا۔

پاؤں میں سلیپرز پہن کر پیر گھسیٹتا باہر نکلا اور بنا سوچے جارحانہ انداز سے ساتھ والے کمرے میں جہاں عندلیب اور نور تھیں داخل ہوگیا۔

"کچھ خدا کا خوف ہے کہ نہیں، جانتی بھی ہو کہ میں سو رہا ہوں پھر بھی بک، بک کیے جارہی ہو اور ایسی کیا خوشی ملی کہ ہنسی نہیں رک رہی ہے؟" خلافِ معمول میں انتہائی بدمزاجی سے انہیں تنبیہ کرنے لگا تھا۔

"سمیع کمال....." حسبِ معمول نور کی آواز آئی۔

"اخلاقیات کہاں رکھ آئے ہو؟" وہ قہر آلود نگاہیں مجھ پر مرکوز کیے پوچھنے لگی۔ میں نے آبرو اچکا کر اسے دیکھا تو یک دم نظریں اس کے پیچھے بیٹھی اسی حلیے میں ملبوس خانم پر پڑی۔

"اوہو تو یہ یہاں آچکی ہیں۔ اسے تو مجھے لینے جانا تھا لیکن نور نے تو مجھے کچھ نہیں کہا۔" میں نے ذہن پر زور ڈالا کہ کہیں میرے ذہن سے نکل نہ گیا ہو، جب یقین ہوگیا کہ میں نے کوئی حکم عدولی نہیں کی تو پُرسکون سانس خارج کی، یقیناً اس کے سامنے نور کو میرا تلخ رویہ گراں گزرا تھا تبھی آستینیں چڑھائے میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دیکھا وہ نظریں جھکائے اپنے سامنے رکھی پرات میں بے شمار پتوں کو سیٹ کررہی تھی کمرے میں پھیلی خوشبو بہت مسحور کن تھی۔ پورا کمرا ان پتوں کی مہک سے معطر تھا۔ ایک طرف کرسی پر بیٹھی عورت یقیناً اس کی ماں ہوگی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے نور کو دیکھا جو مجھے یوں اسے گھورنے پر آگ بگولہ ہوئی جارہی تھی۔

"یہ گھاس کھاتی ہے کیا؟" مجھے شرارت سوجھی۔

"سمیع کمال!" نور دانت پیس کر بولی۔

"یہ مہندی کے پتے ہیں، خانم کی یہی خصوصیت ہے

کہ یہ مہندی خود بنا کر لگاتی ہے۔" نور نے اس کے سامنے رکھے ہوئے پتوں کی حقیقت بتائی تو میں جو خود مہندی بنا کر لگاتی ہے" کو محض ایک افواہ سمجھ رہا تھا حقیقتاً حیران رہ گیا۔ میں نے دیکھا اس کے پاس ایک بہت خوب صورت بوری نما بیگ رکھا تھا، جس پر ہاتھوں سے بہت خوب صورت بیل بوٹیاں بنی تھی، بیگ پر بنے پتوں کا ڈیزائن مہندی کے پتوں کا تھا، پھولوں کا رنگ گہرا اورنج اور سرخ رنگ کو ملا کر سجایا گیا تھا۔ اس بیگ میں مہندی کے بہت سے پتے پڑے تھے، وہ مہندی کے پتوں کو نکال کر ان کو عرقِ گلاب سے صاف کر رہی تھی، پورے کمرے میں اس قدر پیاری اور انوکھی مہکار تھی کہ وہاں سے نکلنے کا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ میری محویت سے خانم کچھ جھجک کا شکار ہو رہی ہے، نہ جانے کیوں مجھے یہ سب بہت دلچسپ لگ رہا تھا، میری نظریں اب مہندی کے پتوں پر نہیں خانم کے چہرے کے گرد منڈلا رہی تھیں۔

"کیا اسے مجھے پک کرنا تھا؟" بلا ارادہ ہی میں نے نور سے دریافت کیا۔

"ہاں کرنا تو تھا لیکن خانم کا میسج آیا تھا کہ وہ خود آجایا کرے گی لیکن شاید واپس گھر اسے ڈراپ کرنا پڑا کرے گا۔"

"ویسے کتنا عرصہ لگے گا اسے مہندی بنا کر لگانے میں؟" میں نے شرارت بھری نظر سے نور کو دیکھ کر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"اس کا اپنا کوئی طریقہ کار ہے جو سات دن پہلے شروع کرتی ہے۔" نور نے میرے طنزیہ تاثرات پر گھور کر کہا۔

"سمیع کمال تم جاؤ اب۔" کافی دیر کے بعد نور میری طرف متوجہ ہوئی اس کی تنبیہ پر مجھے مجبوراً وہاں سے جانا پڑا۔ جاتے، جاتے بھی میں نے ایک نظر خانم پر ڈالی، نہیں وہ کوئی ماورائی حسن کی مالک نہ تھی لیکن اس میں ایک ماورائی کشش ضرور تھی۔ بہرحال میں وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

اور پھر نور کی شادی کے ہنگامے روز بروز زیادہ ہوتے گئے، میں خانم کو ایک عورت کے ساتھ اپنے گھر اکثر دیکھنے لگا، اس سے بات کی کوشش کی لیکن ناکام رہا، وہ دلہن کو مہندی لگانے کا جیسے پورا کورس کرتی تھی، سات دن پہلے اس کا کام شروع ہو گیا تھا۔ نور کو سات دن تک کوئی کام نہیں کرنا تھا، صبح اور شام خانم خود آکر اس کے ہاتھوں اور پاؤں کو فقط عرقِ گلاب سے دھو کر وسلین (Vaseline) لگاتی تھی۔

خانم کے انوکھے طریقۂ کار پر میری حیرتوں میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا، ایک بڑی سی چادر اس نے لپیٹ رکھی تھی، عام سے حلیے میں ملبوس خانم اپنے آپ میں بہت خاص لگ رہی تھی۔ کمرے کے درمیان میں بہت خوب صورت دری (جو خانم ساتھ لائی ہوئی تھی) کو بچھا کر اس نے اپنا سارا سامان اس پر رکھا ہوا تھا۔ آج کی رسم صرف اور صرف خانم کی تخلیق کردہ رسم تھی۔ مہمان عورتوں کی تیاری دیکھنے لائق تھی، میک اپ، جیولری، رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس ساری مہمان خواتین اپنی امارت کا منہ بولتا ثبوت پیش کر رہی تھیں، ان کے انداز میں ایک غرور تھا، نور اور عندلیب کی اہمیت نمایاں تھی اور کیوں نہ ہوتی آخر وہ "کمال ہاؤس" کی بیٹیاں تھیں۔

آج اس کا مہندی بنانے کا دن تھا۔ اب اسے سات سہاگن عورتیں درکار تھیں، جن کے ہاتھوں پر مہندی کے پتے رکھ کر پھر ان پتوں سے دلہن کی مہندی تیار کی جاتی، مہمانوں میں سات سہاگنوں کو ڈھونڈنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

"اس گلاب کے عرق میں اپنے، اپنے ہاتھ دھو لیں لیکن ہاتھوں کو صاف نہیں کرنا ہے۔" خانم نے ایک پرات میں عرقِ گلاب ڈال کر سب کو کہا۔ تو خانم کے اردگرد جمع ان ساری عورتوں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

"دایاں ہاتھ آگے کریں۔" اس نے کہا تو سب عورتوں نے وہی کیا جو اس نے کہا، اس نے مہندی کے پتوں کو ان عورتوں کے عرقِ گلاب سے تر ہاتھوں پر رکھنا شروع کیا۔

پتوں کو اٹھاتے ہوئے چند پتے نیچے گرے تو خانم نے ان کو اٹھا کر بجائے ان کے ہاتھ پر رکھنے کے ایک دوسرے بیگ میں ڈال دیا۔

"کوئی بھی پتا نیچے سے اٹھا کر سہاگنوں کے ہاتھ پر نہ رکھنا۔" اس کے کانوں میں نانی اماں کی آواز گونجی تو اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری تھی۔

وہ ایک بار پھر گلاب کا عرق ان پتوں پر چھڑکنے لگی۔ اس کا یہ سارا طریقۂ کار اتنا نارمل نہیں تھا کہ آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ میں اپنے سارے کام چھوڑ کر کمرے کی کھڑکی کے باہر کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ان عورتوں کے ہاتھوں پر سے مہندی کے پتے اٹھا کر ایک ترتیب سے رکھے۔ ایک کونے میں رکھی کرسی پر اس کی ماں بیٹھی تھیں، میری نظر ان پر پڑی تو ان کے انداز میں مجھے ایک بے چینی سی نظر آئی۔ وہ بار، بار خانم کی طرف دیکھ رہی تھیں اور کوشش کر رہی تھیں کہ خانم ان

کی طرف متوجہ ہو لیکن خانم اپنے کام میں مگن تھی۔

دو موٹے، موٹے سنگ مرمر اوپر نیچے رکھے تھے، اوپر والے پتھر کے درمیان ایک بڑا سا سوراخ تھا اور ایک طرف ڈنڈا لگا تھا جہاں سے پکڑ کر اس کو گھمایا جاتا تھا نور کو لگانے والی مہندی کے پتوں کو خانم پتھروں کے درمیان بنے سوراخ میں ڈالنے لگی، عرق گلاب سے تر مہندی کے پتوں کو اس نے پیسنا شروع کیا تو ہر طرف خوشبو پھیل گئی، وہ دونوں ہاتھوں سے اس ہینڈل سے پتھر کو گھمانے لگی تھی اور سب انہماک سے اسے دیکھ رہے تھے، اتنے بھاری پتھر ایک دھان پان نرم و نازک دوشیزہ کے لیے گھمانا یقیناً ایک کٹھن کام ہی تھا لیکن اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ تھا، ایک بہت ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیے رکھا تھا، میرا جی چاہا میں آگے بڑھ کر اس کی مدد کروں۔ مہندی کی خوشبو کو پاس ہو کر محسوس کروں۔ اپنے اس خیال نے مجھے ایک راحت کا احساس دلایا تھا، دل میں ایک عجیب طرح سی ہلچل مچی تھی۔

مسلسل پیسنے سے مہندی کے پتوں کا ایک لیپ (paste) تیار ہو رہا تھا اور یہی تو مہندی تھی، خانم نے اپنے بیگ سے ایک چمچ نکالی، چاندی کا چمکتا چمچ، جس کے سرے پر مور کے رنگین پر آویزاں تھے، ایک گہرے سرخ رنگ کی پلیٹ نکال کر چمچ سے تیار ہونے والی مہندی کا لیپ پلیٹ میں ڈالنے لگی اور اپنی پوروں کو عرق گلاب میں ہلکا سا گیلا کر کے ایک بار پھر مہندی کے پیسٹ پر چھینٹے مارے اور باقی کے پتوں کو مزید مہندی بنانے کے لیے سنگ مرمر کے پتھر پر بنے سوراخ میں ڈالنے لگی۔

میری سرسری نظروں میں یک دم ہی بہت سارے رنگین ستارے جھلملانے لگے تھے۔ میری نگاہیں اسی پر تھیں خانم نے ماں کو دیکھا تو ماں نے اشارے سے اسے پاس بلایا تو وہ آدھے پسے مہندی کے پتوں کو وہیں چھوڑ کر اٹھ کر ماں کے پاس گئی۔ اس کی ماں کے چہرے پر غصیلے تاثرات اور خانم کا خاموشی سے اسے دیکھنا مجھے بہت کھٹکا تھا۔

''کیا بات ہو سکتی ہے؟'' اور نہ جانے کیوں مجھے اس کی ماں کی غصیلی نظریں اچھی نہیں لگی تھیں۔ میں من ہی من برہم ہوا اور قیاس آرائیاں بھی شروع کیں۔

''سمیع تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' نور کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ ناگواری سے مجھے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''کچھ خاص نہیں بس دیکھ رہا تھا کہ مہندی کیسے بنتی ہے۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''کیا تم خانم اور اس کی ماں کو ڈراپ کر سکتے ہو؟'' نور نے مصروف انداز میں مدد طلب نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ میری نظر خانم پر پڑی جس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔

''ایک دو کام ہیں، کیا وہ انتظار کر سکتی ہیں؟'' مجھے لگا کہ اگر میں نے ایک دم ہامی بھر لی تو کہیں میری دعا قبول ہونے کی خوشی پکڑی نہ جائے۔

''نہیں، انتظار نہیں کر سکتے، ہم خود ہی چلے جائیں گے۔'' خانم نے میری آواز سن لی تھی۔

میں نے دیکھا تو اس کے چہرے پر پریشانی صاف ظاہر تھی۔

''چلو میں چھوڑ دوں گا۔ آپ آئیں، میں گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں۔'' مبادا نور کسی اور کو ہی کہہ دے میں نے یک دم کہا تو اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

اور میں خوش تھا کہ مجھے اس سے بات کا موقع مل جائے گا۔

''میرا نام سمیع کمال ہے اور میں نور کا چھوٹا بھائی ہوں، بزنس مینجمنٹ میں ماسٹرز کیا ہے، مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے، نت نئی چیزوں کے بارے میں جاننے کا شوق ہے اور آج کل مہندی میں دلچسپی ہو رہی ہے۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی اس سے پہلے کہ یہ سفر تمام ہو جاتا میں نے انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اپنا تعارف کرا دیا اور آخر میں ہلکا سا مذاق بھی کیا جس پر خانم دھیرے سے مسکرائی، میرا جی چاہا کہہ دوں اور مہندی لگانے والی میں بھی دلچسپی ہو رہی ہے لیکن..... یہ مذاق نہیں تھا اس لیے محض سوچ کر ہی رہ گیا۔

''مہندی سے عشق مجھے وراثت میں ملا ہے، میرے گھر میں مہندی کا پودا میری محبت ہے۔'' میں ابھی لفظوں کو جوڑ ہی رہا تھا کہ خانم بولی۔

شاید وہ جان گئی تھی کہ میں اس کے ایسے مہندی لگانے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔

''ایک انوکھا عشق اور لاجواب محبت۔'' میں نے.... بے اختیار سراہا، گاڑی کی پچھلی سیٹ پر وہ اس انداز سے بیٹھی تھی کہ بیک ویو مرر میں اس کا عکس مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی کلائی کی چند چوڑیوں کی کھنک سے مجھے محسوس ہوا تھا کہ اسے یہ الفاظ اچھے لگے ہیں۔

''میری نانی اماں مہندی لگایا کرتی تھیں۔ یہ خالص

مہندی ہے۔" مجھے محسوس ہوا اس نے اپنی پوروں پر مہندی کے رنگ کو دیکھ کر مجھے مہندی سے جڑی محبت کے بارے میں بتایا۔

"گھر میں لگا پودا میری نانی اماں کا ہے، ان کی محبت کی نشانی۔" وہ آہستگی سے ہنسی تھی۔

"مہندی سنت ہے، ہمارے رسول ﷺ نے مہندی کو پسند فرمایا ہے، مہندی عورت کا گہنا ہے، عورت کی پہچان ہے۔" خانم کے لہجے میں مہندی سے عشق کی جھلک نمایاں تھی۔

"آپ کی اس ساری کارروائی...... میرا مطلب ہے مہندی بنانے کے عمل میں سات کا ہندسہ کثرت سے گنا جا رہا تھا، ایسا کیوں؟" کافی دیر سے مچلتے سوال کو بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"تین، پانچ، سات، نو، گیارہ...... طاق ہندسے اچھے شگون کی علامت ہیں۔" مسکراتے لہجے میں اس نے بتایا

"تو سات کا ہندسہ ہی کیوں؟" میں کسی بھی طرح اس سے باتیں کرتے رہنا چاہتا تھا۔

"دلہن کے سنگار میں مہندی کی بہت اہمیت ہے، مہندی کے بغیر دلہن بہت پھیکی لگتی ہے، اس پھیکے پن کو دور کرنے میں، شادی بیاہ کے کشٹل میں بہت زیادہ دیر لگ جائے تو لوگ تنگ پڑ جاتے ہیں، سب جلدی، جلدی ہو جائے تو بھی بہت افراتفری مچی رہتی کوئی لطف نہیں لے سکتا، سات ایسا نمبر جو ہر لحاظ سے قابل قبول ہے۔ اور نانی اماں نے کہا تھا مہندی لگانے میں بہت افراتفری نہ مچانا بس اتنی دیر لگانا کہ مہندی ہی سوکھ جائے۔" وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔

"دلہن کی مہندی محبت سے لگا کر اس کی زندگی میں رنگ بھرنا، اسے خوشی دینا بس یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔" مسکراتے اور کچھ پُرجوش لہجے میں خانم نے مجھے بتایا تو حقیقتاً اس سے یہ ساری تفصیل سننا مجھے اچھا لگا تھا، میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے میرا کام عشق کی حد تک پسند ہے۔" میرے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی اس نے مزید بتایا اور اس کے انداز، جنونی طریقہ کار اور انہماک سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا عشق سچا ہے۔ محسوس ہو رہا تھا کہ مہندی کا ذکر کرنا اسے خوشی سے دوچار کر رہا ہے۔

"ذرا تیز گاڑی چلاؤ۔" میں مزید کچھ پوچھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی ماں کی آواز ابھری جو اچھی خاصی جھنجلائی ہوئی تھی۔

اس کی چوڑیوں کی کھنک نے پھر فضا میں ہلچل مچا دی اور میں جان گیا کہ اس نے اپنا ہاتھ ماں کے گھٹنے پر رکھ کر اسے حوصلہ دیا تھا۔

"گھر کیوں جلدی جانا ہے؟" میں یہ تو قطعی نہیں پوچھنا چاہتا تھا نہ جانے کیوں میں پوچھنے لگا۔

"ابا گھر آ گئے تو شور کریں گے۔" خانم نے سر جھکا کر کہا۔ میں نے بیک ویو مرر میں لپک کر اسے دیکھنا چاہا لیکن وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کچھ دیر پہلے والی خوشی اس کے انداز میں اب مدھم پڑ گئی تھی۔

"یہ لو، یہ ابا کو دینا وہ پھر ڈانٹیں گے نہیں۔" میں اپنا والٹ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا، ڈرائیونگ کرتے، کرتے میں نے والٹ سے دو ہزار روپے نکال کر اس کی جانب بڑھائے، میں اسے مشکلوں سے بچانا چاہتا تھا، مختصر سے سفر کے دوران پہلی بار اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا میں جو پہلے ہی شیشے میں اس کے عکس کو کھوج رہا تھا اس کے دیکھنے پر چونک گیا اس کی نگاہوں میں شکایت بھی تھی اور تشکر بھی۔ ایک بھی لفظ کہے بنا اس نے دو ہزار لے لیے اور میں پھر سے ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے اتنی تسلی ہو گئی کہ موقع ملتے ہی اس سے دوستی ہو جائے گی۔

ان دونوں کو گلی کے نکڑ پر اتار کر میں جب تک وہ نظر آتی رہیں وہاں ہی رکا رہا......

☆☆☆

"تمہیں کیا ضرورت تھی کسی بھی اجنبی سے بے تکلف ہونے کی؟" اماں کی قہر آلود نظروں کے ساتھ ادا کیے گئے الفاظ میرے لیے تکلیف دہ تھے لیکن میں نے ہمیشہ کی طرح خاموشی اختیار کیے رکھی۔

مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میری ایک بہت بڑی ذمے داری ہے جسے مجھے بنا کسی جھنجلاہٹ یا تلخی سے نبھانا ہے، جن دنوں میں مہندی کے فنکشن پر کام کر رہی ہوتی ہوں مجھے کوئی بات بری نہیں لگتی ہے، میں اداس نہیں ہوتی ہوں، میں کسی بات پر بیزار نہیں ہوتی، میں مہندی کے رنگ کو محبت اور برداشت سے سجانا چاہتی ہوں، دلہن کے ہاتھوں پر بنائی گئی بیل بوٹیوں کو مسکراہٹوں سے سینچنا چاہتی ہوں۔

"اب اپنے ابا کو کچھ نہ بتانا۔" میری خاموشی پر اماں پھر گویا ہوئی۔

"زندگی بھی عجیب [illegible]

''ابا یہ دو ہزار۔'' گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے مٹھی میں دبے دو نوٹ ابا کی طرف بڑھائے تو ابا (جو بقول ماجد بہت غصے میں ہے جلدی آؤ) نے جھٹ پٹ جھپٹ لیے اور کچھ بھی کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تو میں بے اختیار سجاح کمال کی مشکور ہونے لگی۔

''تیرا دماغ چل گیا ہے کیا؟'' میں کمرے میں داخل ہوئی ابھی اپنی چادر کو ڈھیلا کیا ہی تھا کہ اماں وارد ہوئیں ان کے شعلہ بیان لہجے پر میں نے متعجب نظروں سے انہیں دیکھا۔

''سارے پیسے ابا کو کیوں دے دیے؟ کیا میں نہ نظر آئی تجھے؟'' اماں نے انتہائی سفاکی سے مجھے دیکھ کر کہا۔

''اماں ابھی اور پیسے بھی ملیں گے تو وہ آدھے آپ لے لینا۔'' اپنے لہجے کی اکتاہٹ کو مسکراہٹ میں لپیٹ کر میں نے بشاش لہجے میں کہا۔

''اونہہ'' اماں نے نخوت سے کہا۔

''اور کل تجھے اکیلے جانا پڑے گا، میں نوکرانی نہیں لگی تیری جو ہر جگہ تیرے ساتھ، ساتھ منڈلاتی پھروں۔'' اماں کا لہجہ ابھی تک نارمل نہیں ہوا تھا اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ اماں کا غصہ وقتی ہے۔

''ٹھیک ہے اماں۔'' میں نے بجائے کسی بحث کے اماں کی بات کی لاج رکھ لی تو اماں اب مجھے تفتیشی نگاہوں سے گھورنے لگیں۔

''تو ایسا کر ناپو کو ساتھ لے جانا، اکیلی نہ جانا۔'' اماں نے باہر قدم بڑھائے اور چند لمحوں بعد رک کر پلٹ کر مجھے دیکھا اور پروین کو ساتھ لے جانے کا کہہ دیا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پروین میری چھوٹی بہن جو ہمیشہ اسکول جانے کے نام سے چڑتی تھی۔ دس سال کی تھی اور اماں کی ہر وقت کی ڈانٹ پھٹکار اس کا نصیب تھی، اماں کی بھی غلطی نہیں تھی جب دنوں گھر میں چولھا نہ جلے تو طبیعت میں ایک چڑچڑا پن آ ہی جاتا ہے، ابا معمولی سی مزدوری کرتے تھے، اماں، ابا پر ہم تین بہن بھائیوں کی ذمے داری تھی، میں سب سے بڑی تھی تو اس لحاظ سے مجھے یہ بھی احساس دلایا جانے لگا کہ میری ذمے داری بھی زیادہ ہے، چھوٹی سی عمر میں مجھے بہت سارے کام سکھا دیے گئے تھے۔

میں نانی اماں کی لاڈلی تھی اور ان کے ساتھ وقت بھی زیادہ گزارہ تو ان سے بہت سی باتوں کو سیکھ لیا۔ نانی اماں بہت

غزل

جھوٹے تھے وہ سارے قصے جھوٹے سب افسانے تھے
جذبے جن کے نام کیے تھے وہ ہم سے بیگانے تھے

لفظ و بیاں کا پاس نہیں تھا، دل میں جب عیاری تھی
اہلِ وفا کے قول سنہرے کیا تجھ کو دُہرانے تھے

کیا بتلائیں کیا گزری تھی جب ہم کو معلوم ہوا
جن کو حقیقت ہم نے سمجھا وہ تو سب افسانے تھے

اشکوں سے کیا آگ بجھے گی، عشق تو نام ہے جلنے کا
ہم تو چلے ہیں انگاروں پہ آبلے تو پڑ جانے تھے

ہم کیا جانیں دل میں تیرے کس دولت کی چاہت تھی
اپنے پاس تو مہر و وفا کے کچھ انمول خزانے تھے

رسمِ وفا ہم نے ہی نبھائی اور ہم ہی بدنام ہوئے
حسن و عشق کی اس دنیا میں ہم ایسے دیوانے تھے

یمنیٰ جی اس دل سے کہو اب پچھتانے سے کیا حاصل
گل کی خاطر گلشن چاہا، قسمت میں ویرانے تھے

کاوش: یمنیٰ احمد، کراچی

محبت کرنے والی اور بہت صابر و شاکر عورت تھیں جبکہ اماں تو ان کے بالکل ہی برعکس تھیں۔ نانی اماں کی عادت کا تو ایک فیصد حصہ بھی اماں نے نہیں اپنایا۔ لیکن شاید اماں اور نانی اماں کے حالات بہت مختلف تھے۔ وہ محبتوں میں، خوابوں میں رہنے والی تھیں اور اماں کچھ حقیقت پسند طبیعت کی مالک تھیں۔

نانی اماں کا کل اثاثہ مہندی کا یہ پودا تھا جو نانا جان نے انہیں تحفے میں دیا تھا۔ محبت کے پہلے تحفے میں نانی اماں کی جان بستی تھی، بہت مدت تک انہوں نے اس کی حفاظت کی تھی۔ نانی اماں کی زندگی کا بہت سارا حصہ اس پودے کے ساتھ جڑا تھا، بہت سی یادیں، بہت سارا پیار اس پودے کی جڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد نانی اماں کا انتقال ہو گیا تھا، انہوں نے لفظوں میں کچھ نہ کہا تھا لیکن مجھ سے محبت کی اس نشانی کی حفاظت کا عہد نانی اماں نے خاموشی کی زبان میں لے لیا تھا۔ مجھے مہندی سے محبت تھی، اس کی خوشبو میں مجھے نانی اماں کی محبت کی داستان نظر آتی تھی۔

"خانم پتر محبت کی نشانی کی حفاظت کرنا ہی محبت کی میراث ہے، یہ سب کچھ نہیں ہوتا، دل میں خوشی ہونی چاہیے پتر اور خوشی محبت میں ہی ہے۔ اس محبت میں جس میں فقط چاہنا ہی شرط ہے کسی آسائش کا ہونا نہ ہونا محبت کا اصول نہیں ہے۔" نانی اماں کی باتیں مجھے اکثر یاد آتی تھیں۔

"سمیع کمال کون ہے؟ میں نہیں جانتی لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے وہ میری زندگی میں شامل ہو رہا ہے محض چند دن کی سرسری ملاقات اور اس کی نظریں مجھے احساس دلا رہی تھیں کہ سمیع کمال کا تعلق بھی مہندی کے اس پودے سے ہے، محبت سے ہے، میرے خوابوں میں سمیع کمال کا بھی حصہ ہے۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ سمیع اور خانم کے درمیان کوئی تعلق جنم لینے لگا تھا۔"

☆☆☆

"سمیع پلیز میری مدد کردو۔" میں گھر میں داخل ہوا تو عندلیب کی منت بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"کہاں ہو تم؟" میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی تو میں نے آواز دے کر پوچھا۔

"نور کے کمرے میں ہوں آجاؤ یہاں۔" اس کی آواز آتے ہی میں نے نور کے کمرے میں قدم رکھا، عندلیب اور نور بیٹھی خانم کی بکھری ساری چیزیں سمیٹ رہی تھیں، میرا دل ایک بار پھر دھڑکنے لگا تھا۔ اس خوشبو میں مجھے خانم کی خوشبو بھی محسوس ہونے لگی تھی، میں جو نور اور عندلیب کے کام نہایت بے دلی سے کیا کرتا تھا یہ کام بہت گرم جوشی سے کرنے لگا۔

"تم یہ پڑیاں سائڈ پر رکھ دو باقی ہم سمیٹ رہی ہیں۔" نور نے بنا میری طرف دیکھے کہا تھا۔ اس کا مجھے نہ دیکھنا ہی میرے لیے بہتر تھا ورنہ وہ اس لمحے میرے چہرے پر صاف دیکھ پاتی کہ خانم دل میں آبسی ہے۔ میں نے بہت محبت سے، احترام سے خانم کی ساری چیزوں کو دیکھا۔ ان سنگ مرمر کے پتھروں کو سمیٹ کر سائڈ پر کیا تھا، اس پل ان سے اٹھتی مہک نے ایک بار پھر مجھے معطر کیا تھا۔

اور پھر میں اپنی دیگر مصروفیات کو پس پشت ڈال کر اپنی ساری توجہ خانم کی طرف مبذول کرنے لگا، اپنی زندگی کے اس تغیر پر میں خود بہت حیران تھا۔ شب و روز میں ایک انوکھا لطف محسوس ہونے لگا تھا، کام کرنے کے دوران بھی میں خوابوں میں رہنے لگا تھا۔ میں سمیع کمال..... یعنی کہ میں؟ مجھے..... محبت ہوگئی تھی۔ میں نے یہ اعتراف کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

خانم ایک بار پھر ہمارے گھر آئی ہوئی تھی۔ سات دن مہندی لگانے میں صرف کیے اور جاتے ہوئے "کمال ہاؤس" کے سمیع کمال کو اپنے حصار میں جکڑ کر چھوڑ گئی تھی۔

نور کے ہاتھوں پر لگی مہندی خانم کی محنت اور محبت کا منہ بولتا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ ہر کسی نے تعریف کی، خانم اور اس کی ماں کو بہت کچھ دیا دلایا گیا۔ خانم خوش تھی جبکہ میں..... میں واقعی بدل گیا تھا وہ چلی گئی۔ اسے اب کسی اور دلہن کے ہاتھوں کو سجانا تھا، کہیں اور، کسی اور کی زندگی میں محبت کے رنگوں کو بکھیرنا تھا۔

کچھ لوگ بھول جاتے ہیں، کچھ یاد رہ جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ میرے شب و روز بھی بدل گئے تھے، کچھ نور کے چلے جانے سے اور کچھ خانم کے آ کر بھی نہ آنے سے۔

☆☆☆

"مجھے تو وہاں سے آنا ہی تھا۔ میرا وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ سمیع کمال تم کیا تھے؟ تم کیا ہو سمیع کمال؟ تمہاری نظریں تو مجھے روک رہی تھیں لیکن..... تم سمیع کمال..... تم نے مجھے نہ روکا..... تو مجھے تو واپس آنا ہی جانا تھا۔ میں وہاں رک نہیں سکتی تھی۔ میری زندگی کی یہ پہلی دلہن تھی جسے مہندی لگا کر میں خود بھی بدل گئی تھی، میں صرف دوسروں کی زندگی میں رنگ بکھیر رہی تھی۔ اس دلہن کے بعد نہ جانے کیوں..... میرے دل میں بھی ارمان جاگا، محبت کی چاہ کا، اپنے ہاتھوں پر بھی مہندی رچانے کا۔" اپنی زندگی میں بھی اس مہکار کی خواہش جاگی۔

"سمیع کمال..... سمیع کمال..... سمیع کمال....." میں بار بار اسے کیوں پکار رہی تھی میں نہیں جانتی۔

نانی اماں نے کہا تھا کہ سچی محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے، آپ کی پکار پر محبوب کے دل میں ہلچل ضرور ہوتی ہے، سچے من کی سچی پکار اللہ میاں ضرور سنتے ہیں۔

پھر میں بھی اللہ میاں سے سچے من سے ایک سچی پکار کر کے بے فکر ہوگئی۔

☆☆☆

دعائیں اتنی جلدی قبول ہو جاتی ہیں میں نے کبھی سوچا تھا نہ دیکھا تھا۔ میں اپنے آفس سے اپنی گاڑی میں نکلا، شدید گرمی نے بے حال کر رکھا تھا، میں نے گاڑی کا اے سی

آن کیا تو رگ و پے میں ایک تسکین کا احساس گردش کرنے لگا۔ میں نے گہری سانس لی اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ مین روڈ پر میں نے دائیں طرف مڑنے کے لیے سگنل دیا اور جیسے ہی مڑنے لگا سڑک کنارے مجھے وہ نظر آئی۔

سفید چادر میں ملبوس، پریشان حال، پاؤں میں نیلے رنگ کی ہوائی چپلیں، ہاتھوں میں ایک بڑا سا بیگ۔ وہ شاید کسی رکشے کی منتظر تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی بچی بھی تھی، میں نے جیسے ہی ٹرن لیا اگلے پل گاڑی اس کے سامنے جا کھڑی کی۔

شیشہ نیچے کرتے ہی میں نے اسے دیکھا وہ بچی کا ہاتھ پکڑ کر بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔ میں نے سن گلاسز اتار کر مسکراتی نظروں سے دیکھا تو ایک دم اس کے چہرے پر مجھے ایک سکون سا نظر آیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے جہاں مجھے حیران کیا تھا وہاں بے تحاشا خوشی سے بھی نوازا تھا۔

"آپ کیسی ہیں؟" میں نے پوچھا تو بجائے کوئی جواب دینے کے اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی خیریت بتائی۔ دل ایک پل کے لیے خوش فہم ہوا کہ اسے خوشی اتنی زیادہ ہے کہ الفاظ ہی ساتھ چھوڑ گئے۔

"آئیں، میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔" میں نے آفر کی تو اس کے ساتھ کھڑی لڑکی نے سر گھما کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آ جائیں......" اسے کشمکش میں جتلا دیکھ کر مجبوراً مجھے گاڑی سے باہر آ کر دروازہ کھولنا پڑا۔

"چلیں چلو ناں باجی، باہر بہت گرمی ہے۔" اس لڑکی نے اس کا ہاتھ کھینچا تو خانم نے حیرانی سے فرنٹ سیٹ والے کھلے دروازے کو دیکھا۔

"تم ادھر بیٹھو، آپ آگے بیٹھ جائیں۔" میں نے دونوں کو باری باری دیکھ کر کہا۔

کچھ جھجکتے ہوئے وہ فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی تھی۔ میں نے دروازہ بند کیا سرشار ہو کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"کیسی ہیں؟" ایک نظر اسے دیکھ کر میں نے پھر پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بہت سرسری سا بی ہیو کر رہی تھی۔ شاید اس کی جھجک کی وجہ وہ بچی تھی۔

میں نے بیک ویو مرر سے دیکھا وہ بچی اے سی کی ٹھنڈک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب سورج کی ساری گرمائش زائل ہو گئی تو اس نے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی

پشت سے سر ٹکا دیا۔

"آپ کا کاروبار کیسا جا رہا ہے؟" میں نے شریر لہجے میں پوچھا تو خانم بھی مسکرا دی

"بہت اچھا...... اسی کی تیاری میں مصروف ہوں۔" خانم اپنی گود میں رکھے بیگ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"واہ، ماشاء اللہ، مطلب خوب رنگ بھرے جا رہے ہیں۔" میں نے ڈرائیونگ کرتے اس کی طرف دیکھ کر ذومعنی انداز میں آہستگی سے کہا۔

"میرا تو کام ہی یہی ہے۔" وہ اب گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کاش......" میں نے دھیرے سے کہا تو خانم چونک گئی۔

"شادی میں دولہا کو بھی مہندی لگانے کی باقاعدہ ایک رسم ہونی چاہیے۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"مہندی تو صرف دلہن کا سنگار ہے۔" وہ دھیمی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر میری بات سے لطف اندوز ہوئی۔

"دولہے کا بھی تو کوئی سنگار ہونا چاہیے ناں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ کر استفسار کیا تو وہ شپٹا کر رہ گئی۔

"سہرا دولہا کا سنگار ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں ایک مسکراہٹ واضح تھی، میں اس کا جواب سن کر متاثر ہو گیا۔

ہمارے درمیان چھوٹی، چھوٹی معنی خیز باتوں کا تبادلہ ہوتا رہا جو بہت فرحت بخش تھا۔ تقریباً بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد میں ان دونوں کو اسی گلی میں ڈراپ کر رہا تھا۔ وہ بچی گاڑی رکتے ہی نکل گئی، خانم نے بیگ اٹھایا، میں اسی کو دیکھ رہا تھا کہ اس نے الوداعی نظر مجھ پر ڈالی۔ ان نگاہوں میں بہت سے سوال پنہاں تھے، شناسائی کے رنگ، ایک پہچان کی رمق اور رک جانے کی آس، روک لینے کی امید......

میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ذرا سی جھجک کے بعد اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا، یوں ہمارے درمیان ایک معاہدہ نہایت خاموشی سے طے پا گیا...... اور پھر ہماری اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں، محبت بڑھنے لگی۔

☆☆☆

میری لگائی ہوئی مہندی اب مزید نکھرنے لگی تھی، رنگ سنورنے لگے تھے۔ ان رنگوں میں اب محبت...... میری اپنی محبت کا رنگ بھی شامل ہونے لگا تھا۔ وہ کام جو پہلے میں نانی اماں کی داستان محبت کی بنیاد پر کیا کرتی تھی اب اپنی محبت

[illegible]

ساری تشنگی مٹ گئی، سارے رنگ نکھر گئے۔

اماں اب بھی ویسی ہی تلخ تھیں اور ابا بھی اپنے معمول سے نہ ہٹے تھے، بیوٹی اسکول جاری تھی لیکن اماں کی وہی ڈانٹ اس کا نصیب تھی لیکن میں...... میں بدل چکی تھی، سمیع کمال کی محبت نے مجھے بدل دیا تھا، میں اب مہندی لگانے میں بھی ماہر ہوتی جا رہی تھی، میں جب بھی کسی دلہن کو مہندی لگاتی سمیع کمال سے ملاقات ہوتی، مہندی لگانے کا عمل شروع کرنے سے پہلے اور بعد کی ہر ایک تفصیل اسے بتایا کرتی تھی۔

"خانم تم سب کو مہندی لگاتی ہو، اتنے اچھے ڈیزائن بناتی ہو، اتنا گہرا رنگ آتا ہے۔" دلہن کو مہندی لگانے کے سات دن مکمل ہوئے تو سمیع نے میرے ہاتھوں کی پوروں پر مہندی کے رنگ کو دیکھ کر کہا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

"کچھ ڈیزائن، کچھ رنگ میرے لیے بھی بچا کر رکھو۔" سمیع نے ذو معنی بات کی تھی۔

"تمہارے لیے؟" میں سمجھ تو گئی تھی لیکن...... اس کے منہ سے لفظوں کا اقرار اچھا لگتا تھا۔

"کیوں، کیا میرے نام کی مہندی نہیں لگاؤ گی؟" سمیع نے بہت محبت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"لگاؤں گی۔" دل یک دم دھڑکا تھا۔

"لیکن وہ ڈیزائن بہت دلکش ہوگا، میں نے جتنی بھی دلہنوں کو مہندی لگائی ان سب کے ڈیزائن سے انوکھا، اس مہندی کا رنگ ایسا نہیں ہوگا......" میں نے اپنی پوروں کو اس کے سامنے کر کے کہا۔

اس مہندی کی خوشبو بھی ایسی نہیں ہوگی بہت الگ ہوگی بہت دلفریب، بہت دلکش، دل میں اتر جانے والی......" میں نے بہت محبت سے سمیع کو بتایا تو اس کے چہرے پر ایک بہت دلچسپ تاثر ابھرا۔ اس کی بہت گہری اور جاں نثار نظروں نے مجھے نروس کر دیا۔

"کتنی محبت ہے اس دل میں؟" میرے ہاتھ کو تھام کر سمیع نے اس لمحے دل کو دھڑکا دیا تھا۔

"تمہارے نام کی مہندی تمہیں سب بتا دے گی۔" میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچا۔ اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"یہ ہے ایمانی ہے۔" وہ اقرار کر رہا تھا۔

"یہی تو محبت ہے۔" میں کھلکھلا کر ہنسی تھی، اس کے ساتھ مجھے خود اپنی ہنسی میں ایک خوشی رقص کرتی محسوس ہوتی تھی، ایک سکون کا احساس ہوتا تھا۔

☆☆☆

چائے، سگریٹ، رت جگے اور شاعری
محبت کی دیسی دوائیں ہیں

آج کل میں ان دیسی دواؤں کے زیر اثر تھا، سارے شوق بالائے طاق رکھ کر بس تصور خانم میں دن سے رات کرنا میرا مشغلہ تھا۔ مہندی کی خوشبو، وہ رنگ، وہ دلکش بیل بوٹے، وہ خواب، کھانے کا ہوش نہ کچھ پینے کی خبر، سب کچھ میری روٹین، میری نیچر، میرے ماحول کے برعکس ہو رہا تھا، گھر میں ہونے کے باوجود گھر والوں سے لاتعلقی بھی عروج پر تھی۔

"یہ میں کیا سن رہی ہوں سمیع کمال؟"

"مجھے کیا پتا......" میں نے کسلمندی سے کندھے اچکائے تھے۔

"سمیع کیا ہو گیا ہے یار؟ تم اتنے سست اور بور نگ کب سے ہو گئے؟" ان دنوں نور آئی ہوئی تھی اور باقی سب کی طرح میں اس کو بھی مکمل نظر انداز کر رہا تھا کہ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے قہر آلود نظروں سے وہ مجھے گھور کر مجھ سے میری اس حالت کا سبب جاننے کے لیے وارد ہوئی تھی۔

"پیار ہوا، اقرار ہوا......" میں نے بے دلی سے انتہائی بھدی آواز میں اپنی حالت کا سبب بتانے کی کوشش کی تو نور کے قہقہے پر میں نے منہ بسور کر اسے دیکھا۔

"پیار، اقرار اور سمیع کمال......؟" نور زور سے ہنسی تھی۔

"اس سے بڑا کمال آج کی صدی میں نہیں ہوگا۔" نور مسلسل میرا مذاق اڑانے میں لگی ہوئی تھی۔

"ہم نے تمہیں بھیجا تھا کہ اس ڈفر کی اس بیزاری کا سبب پتا کرو، تم اس کو ایسے ہی چھوڑ کر خود قہقہے لگانے میں لگی ہو۔" عندلیب بھی نازل ہو گئی تھی۔

"تم ٹھیک ہو نور؟ ایڈجسٹ ہو گئی ہو؟" میں نے ان دونوں کی ساری شرارت کو نظر انداز کر کے نور سے پوچھا۔

"آ...... خا...... بہت جلدی نہیں یاد آ گیا؟" نور نے یک دم میری کاہلی اور لاتعلقی پر چوٹ کی۔

"مصروفیت......"

"کہاں کے وزیر اعظم لگ گئے ہو جو ایسی مصروفیت آڑے آ گئی کہ میری خیریت بھی نہ پوچھ سکے؟" نور تو آج

سارے گلے شکوے ایک ساتھ کرنے کے ارادے سے کمر کس کر آئی تھی، اب میں اسے کیا بتاتا کہ کہاں کا عہدہ سنبھالا ہے۔

"بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟" عندلیب نے اسے اشارہ کیا تھا تو نور نے مجھ سے پھر پوچھا۔

"تم ہی پوچھ سکو تو مانیں، ہم تو مغز کھپا، کھپا کر اب عاجز آ چکے ہیں۔" عندلیب نے اکتائے لہجے میں کہا تو نور نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

"اچھا میں چائے بنا رہی ہوں تو ساتھ کچھ کھانے کو بھی لاتی ہوں تب تک تم ذرا اس کے کس بل نکالو۔" عندلیب نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

"بتاؤ گے کیا تکلیف ہے؟" اب کے نور قدرے رعب دار آواز میں بولی

"کچھ بھی تو نہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے صاف مکر جانا چاہا۔

"تم اتنا اچھا جھوٹ نہیں بول سکتے سمیع۔" مجھے خود بھی اندازہ تھا کہ میرا لہجہ چغلی کھا رہا تھا اور نور تو ویسے بھی مجھے سمجھ جانے کی دعویدار تھی۔

"سمیع..... جاب تو ٹھیک ہے؟" نور نے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر.....؟" نور نے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"سب سے اتنے لاتعلق کیوں ہو گئے ہو؟" نور جانچتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ارے یار کہاں لاتعلق ہوں؟ ایسے ایک ہی بات کی رٹ لگا رکھی ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں مسلسل انکاری تھا۔

"ایسی بات کیسے نہیں ہے سمیع؟ جب کہیں کوئی تبدیلی آتی ہے تو سب کو نظر آ جاتی ہے، محسوس ہو جاتی ہے، ممی کتنی پریشان ہو رہی ہیں تم گھر والوں کو صحیح وقت دے رہے ہو نہ اپنا ہوش ہے۔" میرے مسلسل انکار سے نور زچ ہونے لگی تھی۔

نور ٹھیک کہہ رہی تھی میں ان دنوں خانم کے خیالوں میں، اس کی باتوں میں اس قدر محو تھا کہ مجھے دنیا کا کوئی ہوش نہیں تھا۔

"نور....." کچھ ہی دیر میں عندلیب چائے کے ساتھ دیگر چیزیں ٹرے میں سجائے کمرے میں داخل ہوئی۔

"یار تمہارے پاس اس لڑکی کا نمبر ہو گا؟" نور کی سوالیہ نظروں پر عندلیب نے کہا۔

"کون سی لڑکی کا؟" اس کے بے تکے سوال پر جہاں میں مسکرایا تھا وہاں نور نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔

"یار وہی جس نے تمہیں مہندی لگائی تھی۔" عندلیب کی بات سے میرا دل زور سے دھڑکا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا۔

"نہیں، میرے پاس تو نہیں ہے، کیوں چاہیے؟" نور نے چائے کا کپ اٹھا کر کہا۔

"کالج میں کسی کو مہندی لگوانی ہے اور یار وہ..... کیا نام تھا اس کا؟ ہاں خانم تو کافی مشہور ہو رہی ہے، بہت اچھی مہندی لگاتی ہے۔" عندلیب نے تعریف کی تو میرا سر خواہ مخواہ ہی فخر سے بلند ہونے لگا۔

"تم کیوں مسکرا رہے ہو؟" نور نے متعجب لہجے میں مجھ سے پوچھا تو میں چونک گیا، مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ در آئی ہے۔

"نہیں کچھ نہیں۔" میں نے بھی اپنا چائے کا کپ اٹھا کر کہا۔

"تم ہمارے ساتھ گئے تھے ناں اس کے گھر؟ یاد ہو گا تمہیں؟" عندلیب نے مجھ سے پوچھا تو میں یک دم گڑبڑا گیا۔

"مجھے نہیں یاد۔" میں ایک بار پھر مکر گیا۔

پھر ہم تینوں خانم کو یاد کرتے ہوئے چائے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ جب جب نور اور عندلیب اس کی تعریف کرتی میری دھڑکنیں منتشر ہوتیں، خوشی محسوس ہوتی اور اپنی محبت کی چوائس پر فخر ہوتا۔ میں نے خانم کے ذکر کے دوران حتی الامکان اپنا لہجہ سرسری رکھنے کی کوشش کی تھی۔ جب تک چائے پیتے رہے ماحول خوشگوار رہا بہت ساری باتیں بھی ہوئیں، میں نے حسب معمول ان دونوں کو تنگ بھی کیا اور ہمیشہ کی طرح ان کو وقت دے کر زیادہ تو نہیں لیکن کافی حد تک ان کے گلے دور کر دیے تھے۔

☆☆☆

اس دن کی جھاڑ، عندلیب اور نور کی مشترکہ ڈانٹ کے بعد میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ نور آئی ہوئی ہے تو اس کے کانوں میں یہ بات ڈال دوں گا اور اب میں موقع کی تلاش میں تھا اور خانم سے ملاقات بھی ضروری تھی۔ میں "کمال ہاؤس" میں خانم کا نام لینے سے پہلے اس سے اس بات کی اجازت لینا چاہتا تھا کیونکہ میں اس کے حالات بھی جانتا تھا، میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میری محبت اس کے لیے کسی قسم کی کوئی مشکل پیدا کر دے۔ دو دن کے بعد ہماری ملاقات

سحر تیج تھی۔ آج کل نور کی آمد کی وجہ سے میرے دن بھی کچھ مصروف تھے اور میں اب اپنے آپ میں کچھ محتاط بھی ہو گیا تھا، کوشش کر رہا تھا کہ جب میں کمال ہاؤس میں موجود ہوں تو ذہنی طور پر بھی وہاں ہی پایا جاؤں۔ مجھے علم تھا کہ ان دنوں خانم کسی دلہن کے ساتھ اس کی زندگی میں رنگ بھرنے میں مصروف ہے، بہرحال دو دن ہیں یقیناً جلدی گزر جائیں گے۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

"میں تم سے سیٹنا چاہتا ہوں۔" ویسے تو سچے جذبوں کو کسی قسم کی لفاظی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اچھے دنوں سے شاعری پڑھ، پڑھ کر مجھ میں اب لفظوں سے بھی زیر کرنے کا ہنر آ گیا تھا، خانم کے سامنے آتے ہی میں نے بے قراری سے کہا۔

"کب تک تمہارے ہاتھوں پر صرف دوسروں کو لگائی گئی مہندی کے دھبے دیکھتا رہوں۔" حسب معمول دلہن کو مہندی لگانے کے بعد اس کے اپنے ہاتھوں پر بھی مہندی کے دھبے پڑے ہوئے تھے، میں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر کہا تو وہ مسکرانے لگی۔ قوس قزح کے دلنشیں رنگوں میں لپٹی ایک دلکش، شرمگیں مسکراہٹ نے مجھے مسحور کیا تھا۔

"یہ دھبے نہیں، محبت کے رنگوں کا عکس ہے۔" خانم نے دونوں ہتھیلیوں کو میرے سامنے ہوا میں بلند کر کے ان دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور مدھم آواز میں کہا۔ میں نے اپنے سامنے اس کی ہتھیلیوں کو دیکھا جہاں جابجا مہندی کے رنگ نمایاں تھے، ان کے درمیان خانم کا مسکراتا چہرہ --- میں یک ٹک دیکھتا چلا گیا اور پھر اس کی بلند ہوئی ہتھیلیوں سے اپنی ہتھیلیاں ملا دیں، اس کی پلکیں جھک گئیں۔

"میں گھر میں اب تمہارا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

"مجھے ایسے چھپ چھپا کر ملنا اب اچھا نہیں لگتا ہے۔" ہماری ملاقات پارک میں ہوتی تھی، اب ہم ایک مخصوص بینچ پر براجمان تھے کہ میں نے خانم کی طرف رخ پھیر کر بیٹھتے ہوئے کہا اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ اس کے لبوں کی مسکان، لرزتی پلکیں اور شرمگیں انداز مجھ تک اس کا اقرار پہنچ گیا تھا۔ اس دن میں بہت خوش تھا، اتنا خوش کہ مجھے اپنے ہاتھ سے اپنی دھڑکنوں کو قابو کرنا پڑا مبادا کوئی اس تیز رفتاری کی زد میں نہ آ جائے۔

☆☆☆

نور کے واپس سسرال جانے سے ایک دن پہلے میں نے اسے اپنی محبت کی کہانی سنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پہلے تو وہ شرارتی جملے بازی سے مجھے چھیڑنے لگی۔ وہ اس کا نام جاننے پر مصر تھی میں نے اس کے ذوق تک خانم کا نام راز میں ہی رکھا تھا۔ یہی سوچا تھا کہ اگر تو نور نے خوشی کا اظہار کیا تو خانم کا نام لوں گا نہیں تو بات کو ٹال دوں گا۔

"اچھا تو اس لیے اتنی گہری خاموشی اختیار کی گئی تھی۔" نور نے معنی خیز مسکراہٹ سے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

"تو بتاؤ اب کون ہے وہ چڑیل جس نے مسیح کمال کو قید کر لیا؟" نور نے مجھے چھیڑنے کی خاطر چڑیل کا لفظ استعمال کیا تھا لیکن اس پل نور کے تجسس رویے کی وجہ سے میں بہت خوش تھا اس لیے بالکل بھی برا نہیں منایا اور شرارت میں مسکرا کر اس کا ساتھ دیا۔

"لیکن ایک بات یاد رکھنا، اب فرحان کا نمبر ہے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔" حسب عادت نور نے رعب جھاڑا۔

"کیوں جب بڑی بہن سے پہلے چھوٹی بہن بیاہی جا سکتی ہے تو بڑے بھائی سے پہلے چھوٹا بھائی کیوں نہیں؟" میں جراح کرنے لگا تھا۔

"زمانے کے انداز اور ہیں اور "کمال ہاؤس" کے انداز الگ---" نور نے شیخی بگھاری۔

"اچھا ایک "چھلا" تو پہنا ہی سکتے ہیں ناں؟" میں نے پُرامید، التجائیہ اور شریر نظروں سے نور کو دیکھا تھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" نور دانت پیس کر بولی۔

"اب بتاؤ بھی کون ہے وہ اپسرا جس کی زلفوں کے اسیر ہو گئے ہو؟ کہاں ملی؟ کیسی ہے؟ مجھ سے کب ملوا رہے ہو؟" نور کی بے چینی اب دیکھنے لائق تھی۔

"تم مل چکی ہو---" میں نے لب بھینچ کر مسکراہٹ دبائی۔

"کون؟" نور ذہن پر زور ڈال کر بولی

"خانم---" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا نام لیا۔

"خانم؟" یک دم ہی نور کے چہرے پر الجھن نظر آنے لگی تھی۔

"کون خانم؟ میں تو...... نہیں جانتی......" نور نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ میں ابھی تک خاموش تھا۔

"کس کی بات کر رہے ہو مسیح؟" نور نے بے حد سنجیدگی سے مجھ سے پوچھا وہ متذبذب تھی۔

"وہ...... خانم جو---"

''خانم مہندی لگانے والی؟'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی نور کو یاد آ گیا کہ خانم کون سی ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات پر سو فیصد سچ ہونے کی مہر ثبت کی۔

''تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟ حواسوں میں تو ہو؟ یہ کیا بکواس ہے؟'' یک لخت ہی نور کے مزاج بدل گئے تھے، میں نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' اس کے ایک دم بگڑ جانے والے تیوروں نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔

''مطلب تم سمجھاؤ مجھے سمیع کمال۔'' نور کے چہرے پر چند لمحے پہلے والی گرم جوشی اور خوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔

''دنیا میں کیا لڑکیوں کا کال پڑ گیا تھا یا.....؟''

''یا.....نور تم کیا کہہ رہی ہو..... کیا دماغی تم.....؟''

''تمہارا معیار ایسا؟ اتنا ڈاؤن تو کبھی نہیں رہا سمیع کمال۔'' نور کی باتوں، اس کی بے یقینی نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔

''تم نے تو میری ساری خوشی کو ملیا میٹ کر دیا سمیع۔'' نور نے دائیں بائیں سر ہلا کر یاسیت آمیز لہجے میں کہا۔

''نور..... میں نے تمہاری خوشی ملیا میٹ کی؟ اور تم اب کیا کر رہی ہو؟'' میں کنگ ہو چکا تھا۔

''کہہ دو سمیع کمال کہ تم مذاق کر رہے ہو۔'' نور کسی طور یقین کرنے کو تیار نہ تھی اور مجھے اس کی بے اعتباری کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ایسی کون سی انہونی پسند کا نام لے لیا۔

''نہیں نور، یہ مذاق نہیں ہے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ تو وہ قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے نور؟ ایسے کیوں ری ایکٹ کر رہی ہو؟'' میرے لیے تو اس کا یہ ردِعمل ناقابلِ یقین تھا۔

''سمیع کمال کا اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہا رہا تھا، حد ہی ہو گئی یعنی کہ ایک مہندی لگانے والی سے تمہیں ایسا عشق ہو گیا کہ تم نے اپنے آپ کو مجنوں بنا ڈالا؟'' اس نے انتہائی ناگواری سے کہا۔

''یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے نور جو تم مجھ سے اکھڑ رہی ہو۔'' میں نے بھی اب تیوریاں چڑھا کر کہا۔

''مجھ سے میں اکھڑ رہی ہوں؟ سمیع کمال میرا جی چاہ رہا ہے تمہیں شوٹ کر دوں یا خود زہر کھا کر فوت ہو جاؤں۔'' نور نے رنجیدگی سے کہا۔

''دوسرا آپشن زیادہ بہتر ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا تو اس نے ایک بار پھر ناک بھوں چڑھائی۔

''سمیع اس بات کو یہیں ختم کر دو، ممی اور بابا تک یہ بات پہنچی تو ان کا بہت برا ردِعمل ہو گا۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نور نے اپنے مشورے سے نوازا تو مجھے لگا میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔

''نہیں نور، یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے بے انتہا سنجیدہ لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا، مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے پار نہیں چڑھے گا۔

''سمیع کمال، خانم ایک مہندی لگانے والی ہے۔'' نور میرے پاس آ کر قدرے چلا کر بولی۔

''کیا ہوا نور؟ کیوں چلا رہی ہو؟'' اسی وقت عندلیب بھی وہاں آ گئی، نور کے چہرے پر غم و غصے کے تاثرات کو دیکھ کر متغیر لہجے میں دریافت کرنے لگی۔

''یہ ہمارے سمیع کمال ناں، انہیں جن کو عشق جیسی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔'' نور نے تیکھے اور طنزیہ لب و لہجے کے ساتھ عندلیب کو بتایا تو میں اس کے اس روپ پر سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا بس اس کو دیکھ کر رہ گیا۔

''رئیلی؟ کس سے؟ کون ہے؟ لیکن تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟'' عندلیب نے ہم دونوں کا دیکھ کر پوچھا۔

''خانم سے۔'' نور نے تخوت سے اس کا نام لیا۔

''خانم کون؟'' عندلیب بھی نہ سمجھی تو پوچھنے لگی۔

''وہی مہندی والی جس کا تم اس دن پوچھ رہی تھیں، اسی کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں'' کمال ہاؤس'' کے یہ سپوت۔'' نور تو نفرتوں سے بھری بیٹھی تھی اور میری حیرتوں میں مسلسل اضافہ ہوئے جا رہا تھا۔ خانم کا نام سن کر عندلیب کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی اس میں کیا برائی ہے؟'' میں ان دونوں کے رویے سے زچ ہو کر جھنجلا کر بولا۔

''لو کر لو بات..... یہ ہم سے پوچھ رہا ہے کہ برائی کیا ہے؟'' نور نے عندلیب کی طرف دیکھ کر کہا،

''وہ بری لڑکی نہیں ہے یار۔'' میں نے خانم کا دفاع کیا۔

''یار اس کو سمجھاؤ۔'' نور نے پیشانی پر ہاتھ مار کر عندلیب سے کہا۔

''خانم مہندی لگانے والی ''کمال ہاؤس'' کی بہو کیسے بن سکتی ہے سمیع؟'' عندلیب مدھم آواز میں بولی۔

''تم دونوں اس بات کو خواہ مخواہ ایک منٹ پہلے سے

دیکھ رہی ہو۔۔۔ مہندی لگانا کوئی بری بات تو نہیں؟ وہ محنت سے کمارہی ہے کوئی غلط طریقے سے تو......''

''سمیع کمال...... اس کی فیملی؟ اس کا بیک گراؤنڈ؟ رہن سہن؟''

''نور...... ہم لوگ اتنے تنگ نظر ہیں کیا؟'' عندلیب کی بات کاٹ کر میں بولا، مجھے تو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ میں ان کو کیسے قائل کروں۔

''بات تنگ نظری کی نہیں ہے سمیع، خانم ہم لوگوں میں بہت مس فٹ ہے، تم نے خود دیکھا تھا ناں وہ کیسے علاقے میں رہتی ہے؟'' نور اس قدر غصے میں تھی کہ اب مسلسل خاموش تھی۔ عندلیب نے تو اس کی تان ٹوٹنے نہ دی جہاں پر نور نے اختلافات ختم کیے تھے عندلیب نے وہاں سے ہی شروع کر دیے تھے۔

''تم دونوں نہایت بودے اعتراضات کر رہی ہو۔'' مجھے ایک فیصد بھی اندازہ نہیں تھا کہ میری پسند پر میری بہنیں ہی میرے خلاف ہو جائیں گی۔ لیکن میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ ممی اور پاپا سے بات کروں گا۔

وہ دونوں میری خوشی کو تتر بتر کر کے وہاں سے چلی گئی تھیں اور میری خواہشیں سولی پر لٹکنے لگی تھیں۔ بے چینی بڑھنے لگی تھی لیکن اب اس بے کلی کی نوعیت بدل گئی تھی، پہلے جس چنچل قدمی میں خوشی ہوتی تھی آج اس میں پریشانی تھی۔

☆☆☆

انتظار کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ مجھے اب ہو رہا تھا، دلی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا، اپنے چہرے پر پھیلے محبت و خوشی کے رنگوں کو زمانے کی نظر سے چھپانا کتنا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے اب سمجھ آرہی تھی، مہندی کے پودے سے مہندی کے پتے، جو پہلے میں بس توڑ لیا کرتی تھی آج ان کو توڑتے ہوئے اتنی احتیاط برت رہی تھی جیسے کانچ کے ہیں اور ذرا سی بے پروائی یا کوتاہی ان کو چکنا چور کر دے گی۔ اپنی باسکٹ کو پتوں سے بھر کر میں کمرے میں آئی، اپنی ساری چیزیں تیار کرنے لگی، آج شام ہی میں نے اپنی اگلی بکنگ پر کام کرنا تھا، ایک اور دلہن کو عرقِ گلاب کی خوشبو سے معطر کرنا تھا، اس کے سنگار کو مہندی کی مہکار سے چار چاند لگانے تھے۔ لیکن اس دلہن کی تیاری میں میری اپنی ایک خواہش بھی شامل تھی۔ میرے اپنے خواب بھی اس سفر میں میرے ہمراہ تھے، ایک سرور تھا ایک لذت تھی، مہندی کی تیاری اب پُرلطف ہونے لگی تھی۔

دوسرے دن جب میں نے دلہن کے ہاتھوں کو عرقِ گلاب سے دھونے کی اپنی بنائی گئی رسم کرنی تھی کہ سمیع نے بھی ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں کے مترادف میں رسم سے پہلے سمیع کے سامنے تھی، بے انتہا خوشی، محبت اور سرشاری میرے چہرے پر مجھے خود محسوس ہو رہی تھی اور سمیع کمال کی نظریں بھی احساس دلا رہی تھیں کہ یہ رنگ کافی نمایاں ہیں۔ اس کے ساتھ میں ہنستی کھلکھلاتی رہی، مہندی کے نئے ڈیزائن کو ڈسکس کرتی رہی، یہ ہماری پہلی ملاقات تھی جس میں میری کھلکھلاہٹیں زیادہ تھیں اور سمیع مجھے دیکھتے رہے، اسی پُرشوق نگاہ سے جو مجھے ان کا اسیر کرتی تھی۔

''آپ نے گھر میں بات کی؟'' میں نے سر جھکا کر اس سے پوچھا۔ بے شک اب میں بے تکلفی سے سمیع سے بہت سی باتیں کر لیا کرتی تھی لیکن پھر بھی مجھے شرم نے گھیر لیا۔

''ہاں کی تھی۔'' سمیع کی ہاں پر میرا دل زور سے دھڑکا اور پھر مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ کیا بات کی کیونکہ مجھے مہندی کی تیاری کے لیے جانا تھا۔ میں خوش تھی، اسی خوشی کے ساتھ میں نے دلہن کے بھیگے ہاتھوں کو مہندی اور محبت کے رنگوں سے رنگ دیا۔ سات دن کا یہ محبت کا سفر بھی اختتام پذیر ہو گیا تھا، اور اب انتظار تھا تو اپنی محبت کے رنگ کا......

☆☆☆

میں چاہنے کے باوجود خانم سے رابطہ نہ کر سکا تھا، اسے بتا نہ سکا کہ ''کمال ہاؤس'' کے قانون بہت سخت ہیں، اسے بتا نہ پایا کہ میری محبت کا مذاق بنایا گیا۔

''دیکھو سمیع بیٹا تمہیں کوئی جذباتی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، خانم یقیناً اچھی ہوگی لیکن وہ......''

''بابا جب محبت ہو تو ہم ایڈجسٹ بھی کر لیتے ہیں، وہ اپنے آپ کو ہمارے مطابق بنا لے گی اور ممی......'' میں نے بابا کی بات کاٹ کر کہا اور ساتھ ہی ممی کو بھی مخاطب کیا۔

''سمیع تم......''

''بیٹا بات......'' ممی بہت غصے سے بولنے لگیں تو بابا نے ایک دم ہی انہیں خاموش کرا دیا۔

''بیٹا وہ لڑکی یا اس کا خاندان ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے، یاد رکھو بیٹا شادی محض دو لوگوں کا نہیں دو خاندانوں کا ملاپ ہے۔ جب ہمارے رہن سہن، طور طریقوں، سمجھ بوجھ میں زمین آسمان کا فرق ہوگا تو ہم کتنی دور تک ساتھ چل

سکیں گے؟" بابا نے کہا۔ ممی نے بھی ان کی باتوں کی تائید کی۔

"بابا جب دلوں میں گنجائش ہو تو سب ہو سکتا ہے۔" میں نے مدھم آواز میں کہا کہ بہر حال ممی اور بابا سے میں بدتمیزی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔

"اور بیٹا سب کے دلوں میں ایک سی گنجائش نہیں ہوتی ہے، تمہیں لگتا ہے کہ تم ایڈجسٹ کر لو گے کیونکہ تمہارے دل میں محبت ہے لیکن جب نباہ کا مرحلہ آتا ہے تو گنجائش کم پڑ جاتی ہے۔"

"بابا ظاہری بات ہے نباہ کرنے میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کیا آپ اور ممی نے یوں ہی اتنی عمر ایسے ہی ہنستے مسکراتے گزاری ہے؟" میں ممی، نور، عندلیب اور فرحان کے سامنے بابا سے خانم کے لیے بحث کر رہا تھا۔

"سمیع تم بابا سے بحث کر رہے ہو وہ بھی ایک انجان لڑکی کے لیے۔" نور سے برداشت نہ ہو رہا تھا۔

"میں بحث نہیں کر رہا ہوں، بابا کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، خانم ایسی نہیں ہے۔ وہ کمال ہاؤس میں اپنی جگہ بنا لے گی وہ نباہ کر لے گی، برداشت کر لے گی۔" میں بابا کی خاموشی پر اب قدرے اونچی آواز میں بولا۔

"اور ہم سب؟ ہمارا کیا؟ کیا ہم بھی نباہ کر سکیں گے؟" بابا اور ممی کے فیصلے میں نور پھر بولنے لگی تھی۔

"دیکھو تم اپنے گھر کی ہو چکی ہو۔ کمال ہاؤس میں اب۔۔۔"

"اپنے گھر کی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ کمال ہاؤس سے رشتے ختم ہو گئے اور یہاں کسی بھی ایرے غیرے کے آنے پر کوئی احتجاج نہ کریں۔" نور نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ کر تلخی سے کہا۔

"ہم اس رشتے کے حق میں نہیں ہیں بیٹا۔" میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میرے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے، خاندان، طور طریقے یا رہن سہن کے متعلق تو میرا دھیان بھی نہ گیا تھا۔

بابا کے فیصلے نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔

"بابا نہیں، مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں ہے، بغیر دیکھے، ملے یا جانے آپ کسی کے بارے میں کوئی بھی حتمی رائے کیسے قائم کر سکتے ہیں؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ہم خانم سے مل تو چکے ہیں۔" نور نے پھر اپنے مشورے پیش کیے۔

"ممی، بابا یہ ناانصافی ہے۔" میں نے التجائیہ لہجہ اپنایا۔

"بیٹا مصلحت اسی میں ہے۔" بابا نے اپنے فیصلے کو سنا

"بابا میں خانم سے ہی شادی کروں گا۔" میں نے سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر تیز و تلخ آواز کو بلند کیا۔

"نہیں بیٹا، تم ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو گے تو ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" بابا نے اطمینان سے کہا اور وہاں سے چلے گئے، ان کے جاتے ہی باقی سب بھی چلے گئے۔

میں مکمل خاموشی کی زد میں وہیں بیٹھا رہا، کتنی دیر تک معلوم نہیں.....

احتجاجاً میں نے بائیکاٹ کر دیا، کھانا پینا چھوڑ دیا، بولنا بلانا ترک کر دیا۔ نور اور عندلیب جن کی میں نے ہر مشکل وقت میں مدد کی تھی ان کے رویوں نے مجھے شدید صدمہ پہنچایا تھا، فرحان جس سے مجھے امید تھی کہ میرا ساتھ دے گا اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا، بابا اور ممی جنہوں نے ہمیشہ میری خواہشوں کو پورا کیا تھا ان کے ایسے دوٹوک انداز مجھ سے برداشت نہ ہو رہے تھے۔

☆☆☆

"اتنی دیر بھی کوئی لگاتا ہے بھلا؟" نروٹھے لہجے میں وہ بہت استحقاق سے بولی، میں فقط ایک نظر اس کو دیکھ کر رہ گیا۔

"کیا ہوا؟" میری خاموشی پر اسے تشویش لاحق ہوئی۔

"کچھ نہیں۔" میں اسی سنجیدہ خاموشی کی زد میں بولا۔

"پھر ایسے کیوں پریشان ہیں۔" وہ پوچھ نہیں مجھے بتا رہی تھی کہ میں پریشان ہوں میں مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ آج میری نظروں میں ہر ملاقات کی جیسی شوخی نہیں تھی۔ اداسی تھی، ایک ٹھہراؤ تھا اور وہ بھانپ گئی تھی، خانم جاننے لگی تھی مجھے، اسے پتا چل رہا تھا کہ میری نظروں کا انداز بدلا ہوا ہے۔ وہ جان گئی تھی کہ آج ان آنکھوں میں صرف محبت نہیں بہت سارے ڈر بھی ہچکولے لے رہے ہیں۔

"کیا ہوا سمیع؟" میرے پریشان حال پر اب اس کے مسکراتے چہرے پر بھی پریشانی جھلکنے لگی تھی۔

"بتائیں پھر کیا مسئلہ ہے؟" میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنے ساتھ کا یقین دلایا۔

"ممی اور بابا ہماری شادی کے لیے نہیں مان رہے ہیں۔" میں پچھلے پینتالیس (45) منٹ سے اس جملے کو ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، میرے ہاتھ پر رکھ اس کا ہاتھ لرزا تھا۔ میں نے یک دم اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا، اس کا رنگ فق ہو چکا تھا

ہم دونوں اب مکمل خاموش تھے، اس کے بعد خانم نے ایک لفظ نہ کہا تھا۔

"وہ کہتے ہیں تم مہندی لگانے والی ہو۔" یک لخت اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں سے کھینچ لیا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا، اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں، ہلکی مسکان اس کے چہرے پر نمودار ہوئی لیکن وہ خاموش رہی.....

"یہ محض مہندی نہیں ہے سمیع، میری زندگی ہے۔" پھر دو دم مگر مضبوط آواز میں بولی تھی۔

"میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا خانم۔"

"ہمارے لیے ہماری فیملی سب سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔" اب کے خانم نے لرزتی آواز میں کہا۔

"اور محبت.....؟" میں نے سوال کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

دو موتی اس کے رخساروں سے پھسل کر ان کے آنچل میں جذب ہو گئے۔ میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لبوں پر قفل پڑے تھے۔

☆☆☆

سمیع کمال سے وہ میری آخری ملاقات تھی۔

کیسے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا، کیسے اس کو چھوڑ کر آئی میرا رب جانتا ہے۔ میرا دل کس قدر بے چین تھا میرا رب جانتا تھا۔ اب مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا تھا۔ اپنی اس محبت کو سنوارنا تھا جو اب صرف میری تھی، مہندی کو دلکش بنانا تھا، سمیع کمال کو بھول جانا تھا۔

کتنے کام کرنے والے تھے لیکن ابھی تک میں نہ سنبھلی تھی، نہ ہی سمیع کمال کو بھول سکی تھی، کچھ بھی صحیح نہیں تھا، الجھن تھی، جھنجلاہٹ تھی، مہندی کی محبت تھی اور اک اجڑی بکھری "میں" تھی۔

لیکن آخر کب تک؟ کتنے عرصے تک ایسے ہی بے حال رہتی؟

میں ایک بار پھر مہندی کے پتوں کو توڑنے لگی، ایک بار پھر دوسروں کی ہی زندگی میں رنگ بھرنے لگی کہ یہی تو میرا کام تھا۔ میں نے مسکرا کر خود کو بتایا اور عہد کیا کہ اپنی اس ناکام محبت کا کوئی رنگ کہیں شامل نہیں کروں گی، ایک بار پھر دلہنوں کی ہتھیلیوں کو عرقِ گلاب سے معطر کر کے محبت کی مہندی سے سجا کر سنواروں گی۔

ایک بار پھر میں سات دن کی بکنگ پر جانے لگی، کچھ ہی عرصے میں میری مہندی کی شہرت دور دراز کے علاقوں میں پھیلنے لگی تھی۔ نانی اماں سے کیا وعدہ بھی پورا ہو رہا تھا اور..... اور ..... پتا نہیں اور کیا تھا جو پورا ہو کر بھی..... پورا نہیں تھا۔

سمیع کمال..... تم مجھ سے بھلائے کیوں نہیں جا رہے ہو؟ کیوں میں ہر دلہن کو لگانے والی مہندی کو تمہاری محبت سے سجانے لگی ہوں؟

میں صرف مہندی لگاتی تھی تو مجھے اس بات سے کبھی فرق نہیں پڑتا تھا کہ دلہن کا چہرہ کیسا ہے، میرا مقصد صرف اس سنگار کو اعلیٰ بنانا تھا جس کے بغیر دلہن کا باقی سنگار پھیکا لگتا تھا، بکنگ کرتے وقت میں پہلا سوال یہی پوچھتی تھی کہ ہاتھوں اور پاؤں کی دیکھ بھال کرتی ہیں کہ نہیں اور پھر سات دن تک جو کمی ہوتی میں اپنے طریقے سے پوری کر کے مہندی لگانا شروع کرتی تھی۔

☆☆☆

کتنے دن گزر گئے تھے، میں سنبھل نہ سکا، یوں ہی بکھرا رہا، الجھا رہا، لاتعلق بھی رہا.....

"سمیع کمال آخر کب تک یوں ہی ایسی حالت میں رہو گے۔ دیکھو ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں، اگر ہمیں تمہاری پسند میں ذرا بھی اس بات کی تسلی ہوتی کہ خانم ہمارے ساتھ چل سکے گی تو ہم کبھی تمہیں یوں اداس نہ کرتے۔" نور نے رسان سے مجھے سمجھایا۔ میں فقط اسے کو دیکھ کر رہ گیا۔

"تم جانتے ہو سمیع تم مجھے بہت عزیز ہو۔" نور آج بہت دنوں بعد آئی تھی، ہمارے درمیان کوئی بات بھی نہ ہوتی تھی۔

"میں، میرے سمیع کو بہت یاد کرتی ہوں، تم تو ایسے نہ تھے۔" وہ میرے ہاتھ کو پکڑے کہہ رہی تھی۔

ہاں میں ایسا نہ تھا، یہ محبت اور یہ پاگل پن میرے شخصیت کا حصہ نہ تھا، میں تو بہت لاابالی سا، بے پروا سا لڑکا تھا یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ خانم کی محبت، اس کی باتیں، اس کے خواب، اس کی خوشیاں۔ سب میری وجہ سے بکھر گئی تھیں اور یہی بات مجھے چین لینے نہ دے رہی تھی۔

"میرا آج بھی یہی دعویٰ ہے کہ میں میرے سمیع کمال کو سب سے زیادہ جانتی ہوں، میں جانتی ہوں سمیع کہ خانم تمہاری زندگی کا بس ایک لمحہ تھی۔" نور کہہ رہی تھی میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا سمیع کمال کے لیے خانم ہم سب سے زیادہ اہم ہے؟" نور سے استفسار کر رہی تھی۔

"تمہارا یہ سوال ٹھیک نہیں نور۔ خانم کا تم سب سے یا

تم سب کا خانم سے میں نے کبھی موازنہ نہیں کیا۔"

"کیونکہ صبیح ۔۔۔؟" میں جو سوچ رہا تھا وہ کہہ نہ پا رہا تھا۔

"تم سب کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔" میں نے گہری سانس خارج کی۔

"میں نے خانم سے محبت کی ہے نور، تم مجھے سب سے زیادہ جاننے کا دعویٰ کرتی ہو ناں؟ کاش تم جان پاتیں۔" میں نور کے پاس سے اٹھتے ہوئے انتہائی دکھ سے کہا۔

"صبیح کمال ۔۔۔"

"میں نے چھوڑ دیا ہے اسے، وہ خود ہی میری زندگی سے نکل گئی ہے۔ میرے دل میں ہمیشہ رہے گی اور اس کی مہندی سے میں کبھی نکلوں گا بھی نہیں لیکن تم نہیں سمجھ سکتیں نور، یہ تم لوگوں کے لیے طور طریقے ضروری ہیں۔" اب میں قدرے تلخی سے بولا

"اپنی فیملی کے لیے میں نے خانم کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔ بس؟ اب مجھے تھوڑا سا وقت دو تا کہ میں اسے اپنے دل میں کہیں سیٹ کر سکوں۔" میں نے نور کو دیکھ کر کہا۔

کچھ دیر تک نور مجھے دیکھتی رہی، اس کی نگاہوں کی ۔۔۔ بے یقینی مجھے بتا رہی تھی کہ اسے میری محبت میرے پاگل پن کے سوا کچھ نہیں لگ رہی ہے، کچھ دیر بعد وہ وہاں سے چلی گئی۔

میری سنبھلتی حالت میں بھونچال تب آیا جب کمال ہاؤس کو اچانک سجانے کی فکر لگ گئی۔ شاید یہ بھی نور کا آئیڈیا تھا۔

ایک بار پھر میرے احتجاج رائیگاں گئے، یہ نہیں کہ میں کوئی کمزور لڑکا تھا یا انکار نہیں کر سکتا تھا لیکن میرے لیے می پاپا کی بات کا مان رکھنا واقعی بہت اہم تھا اور پھر نہایت بے دلی اور بیزاری سے میں نے ان سب کی بات مان لی۔

☆☆☆

اپنے کمرے میں اس کے سامنے بستر پر دو زانو بیٹھا تھا، اس کے دونوں ہاتھوں کو تھامے میں نے اس کی ہتھیلیوں پر آویزاں مہندی کو دیکھا۔

وہ ڈیزائن دلکش تھا۔ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ رنگ دلنشین تھا۔ مہندی کے ایسے انوکھے رنگ سے میں ناآشنا تھا۔ وہ مہک انوکھی تھی۔ ایسی خوشبو سے آج سے پہلے میں انجان تھا۔ مجھے اس کی محبت کی شدت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ میں دیوانہ وار اس کے ہاتھوں پر لگی مہندی کی خوشبو کو اپنے اندر اتارنے لگا۔

اپنے آپ میں سمٹ رہی تھی شاید وہ میرے ایسے رویے، اس دیوانگی کی امید نہیں کر رہی تھی۔ میں جو صدمے سے بے حال ریزہ ریزہ لیے کمرے میں داخل ہوا تھا، اب انہی صدموں تک پُرجوش بھی ہو رہا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا گھونگھٹ اٹھایا۔

"تت ۔۔۔ تم ۔۔۔ گگ ۔۔۔ کون ۔۔۔؟" ایک دم میں بدک کر اس سے دور ہوا تھا، دوسری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی۔

"یہ مہندی ۔۔۔؟" میں نے اس کی حیرت سے پھٹی نگاہوں کو دیکھ کر بدحواسی میں پوچھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلا کر دیکھا۔

"خانم نے لگائی ۔۔۔؟" میں اس پل مکمل غائب دماغی کا شکار ہو رہا تھا۔

"ہاں ۔۔۔" اس کے لب ہلے اور میں ڈھے گیا۔

☆☆☆

وہ دلہن خوب صورت تھی، سانولی رنگت اور تیکھے نقوش، بڑی بڑی گہری براؤن آنکھیں، چہرے پر ایک مسکراہٹ، میں نے بارہا اسے غور سے دیکھا۔

"تمہارے دولہا کا نام کیا ہے؟" سب سے پوچھا جانے والا سوال میں نے اس سے بھی پوچھا۔

"صبیح کمال۔" اس نے بتایا تو ایک پل کو میری پوری دنیا گھوم گئی۔

"صبیح کمال ۔۔۔" میں زیرِ لب بولی اور پھر آہستگی سے مسکرائی۔

ایسی مہندی آج تک کبھی نہیں لگائی، اس کا رنگ اتنا گہرا کبھی نہیں ہوا، اس کی خوشبو اتنی انوکھی کبھی نہیں ہوئی۔ وہ جان جائے گا، پہچان جائے گا کہ خانم آج بھی اس کی محبت کو مہندی کے رنگ میں شامل کر رہی ہے۔ یہ دلہن تو میرے صبیح کمال کی دلہن ہے ان ہاتھوں کو صبیح نے تھامنا ہے۔ ان قدموں کے ساتھ میرے صبیح کمال نے قدم ملانے ہیں۔

اپنی محبت کی شدت یہاں نہیں لٹاتی تو اور کہاں؟

☆☆☆

ہاں میں جان گیا تھا، پہچان گیا تھا، خانم کی محبت کی گہرائی کو، شدت کو ۔۔۔ میں نے اپنی دلہن کے دونوں ہاتھوں کو عقیدت سے تھاما، بہت احترام سے بوسہ لیا ۔۔۔

اور محبت کے اس سفر پر اس کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگا۔

❀❀❀

ع عورت طرہ

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے۔۔۔ مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

وہ نفرت اور بیزاری سے بستر پر آڑھے ترچھے۔۔۔ بے سدھ پڑے وجود کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل کیا کہ اپنے ہی بال نوچ لے، خود کو زور، زور سے تھپڑ مارے یا کوئی چیز اس زور سے زمین پر پٹخے کہ اس کے اندر کا غصہ باہر کا راستہ دیکھ لے۔ اندھا دھند بھاگتی ہوئی اس کمرے سے نکلے اور راستے میں آئی ہر شے کو پیر کی ٹھوکر سے اڑاتے ہوئے نہ صرف اس گھر بلکہ اس گھر کے مالک کی زندگی سے بھی ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے نکل جائے۔

وہ کتنی بے بس کتنی مجبور تھی...... کہ ان میں سے کوئی خواہش پوری کرنا تو دور ایک چیخ تک پر قادر نہ تھی۔ ایک ایسی چیخ جو در و دیوار کے کان پھاڑ دے...... اور اس شخص کو دل کا دورہ پڑ جائے۔

وہ سنجیدگی سے اس کی موت کی خواہش کر رہی تھی۔

وہ اس کا شوہر تھا...... دوسرا شوہر......

اس کا اپنا دل بند ہونے کے قریب تھا۔

☆☆☆

آج سے ڈیڑھ سال پہلے اس زندگی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ جو وہ اب گزار رہی تھی۔

یہ زندگی تھی بھی نہیں۔ یہ عمر قید تھی جو شاید عمر بھر کاٹنی تھی۔ تڑپ تڑپ کے سسک سسک کے...... نہ یہ زندگی

ایک ذرا سی بھی کوشش کی تھی۔

کون پاگل عورت ہو گی جو اپنا ہنستا بستا گھر، یار چھوڑ کے اپنا محبوب شوہر چھوڑ کے کسی اور کی خواہش کرے۔ لیکن یہ حالات، واقعات اور وقت کی سازش انسان کو وہاں سے اٹھاتی ہے جہاں وہ قصے کے عروج پر ہوتا ہے اور اس جگہ لا پٹختی ہے۔ جس جگہ کو اس نے اپنے طرے سے روندا ہوتا ہے۔

اسی لیے کہتے ہیں...... رعب، دبدبہ، غرور اور طرہ انسان کو زیب نہیں دیتا۔ وہ تو مٹی زاد ہے۔ مٹی میں مل جاتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی اور کبھی جیتے جی بھی......

بابر اس کا پہلا اور محبوب شوہر تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی موجودگی کا دم بھرتے تھے اور ناک میں دم بھی کیے رکھتے تھے۔ ان کی شادی کوئی لو میرج نہیں تھی۔ لیکن بعد میں بن گئی۔ محبت کی شادی اور محبت بھری لڑائیاں۔

پھر محبت بھری لڑائیوں میں تکراریں، روٹھنا منانا، ایک دوسرے کو الزام دینا، تردیدیں اور آخر میں سب بھلا دینا۔ مہربانیاں، اظہار کی شدتیں، شرمانٹیں، شرارتیں...... سب کچھ تو تھا جو ایک اچھی ازدواجی زندگی میں ہوتا ہے۔

اس کا کریڈٹ بھی بابر کو جاتا تھا۔ جس نے گھر

والوں اور بیوی میں ہمیشہ توازن رکھا۔ ایک پیارے سے بیٹے کی آمد نے زندگی مکمل کر رکھی تھی۔

تنخواہ ملتے ہی گھر کا خرچ مع اماں جیب خرچ کے، اس کے حوالے کرتا۔ ماں کی مٹھی گرم اور اپنا خرچ الگ.....

ماں بھی خوش کہ بیٹا الگ ہو کے بھی اپنا پن نبھا رہا تھا۔ ہر خوشی غمی پر ساتھ کھڑا ہوتا اور بیوی بھی خوش کہ گھر کا خرچہ ہاتھ میں دے کے رانی بنایا ہوا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ یہ طرہ خود بخود لب و لہجے میں پروان چڑھتا گیا کہ میں بابر کی چہیتی اور لاڈلی بیوی ہوں اور وہ کوئی کام مجھ سے پوچھے بغیر نہیں کرتے۔

یہ اعلان ایک بچکانہ لاڈ کے سوا کچھ اور تھا بھی نہیں۔ گھر میں سب بڑے تھے، اس لیے اس بات پر ہنس پڑتے لیکن کوئی اور بھی تھا جو بظاہر ہنستا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں بری طرح کلس جاتا تھا۔

☆☆☆

''ہاں کہہ دیں ناں..... پلیز.....'' وقفے، وقفے سے کمرے میں آواز گونج رہی تھی۔

وہ دیر سے سن رہا تھا۔ بحث اور تکرار کے بجائے محض سر کو ہاں میں ہلا دیتا۔

میکے والے آبائی گاؤں جا رہے تھے۔ اسے بھی جانا تھا۔

بابر تھا کہ مان کے نہیں دے رہا تھا۔

''کیا ہو گیا آپ کو۔ آپ نے پہلے تو کبھی ایسے کسی بات سے منع نہیں کیا۔ پھر اب کیوں؟'' وہ روٹھ کے منہ موڑ کے بیٹھ گئی۔

بابر نے گہری سانس لی لیکن بولا کچھ بھی نہیں۔ بولتا بھی تو کیا اور کیسے۔ دماغ کے کسی کونے میں ایک بتی جل بجھ رہی تھی۔ اور وہ اس بتی کو سرخ رنگ میں پہچاننا نہیں چاہتا تھا۔

سلمان اس کا کزن تھا جو ملک سے باہر گیا تو اب پانچ، چھ سال بعد واپس آیا تھا۔ اسی کو آبائی گاؤں دکھانے لے جایا جا رہا تھا۔ اسی کی فرمائش پر.....

گاؤں جانا برا تھا نہ بیوی کی ضد.....

اصل مسئلہ وہ قصہ پارینہ تھا جو اس کی آمد کے بعد سے ہی سب کے ذہنوں میں دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔

سلمان صرف کزن نہیں، رابعہ کا سابقہ منگیتر بھی تھا۔ اٹھارہ سالہ رابعہ کو اس نے خود پسند کر کے منگنی کی تھی۔ چونکہ بات ایک ہی خاندان کی تھی، اس لیے سب لوگ سب کچھ جانتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ بھی کہ سلمان کے باہر جانے کے بعد جب وہاں کی رنگینیوں میں اس کا دل لگ گیا اور اس کو رابعہ آؤٹ ڈیٹڈ لگنے لگی تو اس نے خود ہی منگنی توڑ دی تھی بنا انتظار کروائے۔ اور رابعہ نے مہینوں اس منگنی کے ختم ہونے کا سوگ بھی منایا تھا۔ کہیں آنا جانا اور خاندان میں ملنا جلنا مہینوں چھوڑے رکھا تھا۔ وہ تو جب کسی محفل میں کسی کے منہ سے نکلا کہ۔

"رابعہ تو منگنی ٹوٹنے سے ہی عدت میں چلی گئی ہے۔"

تب اللہ جانے اسے ہوش آیا تھا کہ دلایا گیا تھا اور اس نے دوبارہ سے معمولات میں حصہ لینا شروع کیا۔

بظاہر منگنی ٹوٹ جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن باتیں بڑی ہوتی نہیں، انہیں بنایا جاتا ہے۔

بابر خود اسی خاندان کا حصہ تھا۔ بھلے دور پرے کا ہی سہی لیکن کچھ نہ کچھ اڑتی پڑتی وہ بھی سن لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب ایک ایسا فیملی ٹرپ جس میں سلمان بھی موجود تھا اور بابر اپنی آفس کی مجبوری کی وجہ سے جا نہیں سکتا تھا۔ وہ رابعہ کو کسی ایسی تفریح کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ جہاں اس کی اپنی ذات بھی تنازعے کا حصہ بنتی۔ آخر کو وہ اس کی بیوی، اس کی عزت تھی تو اس لحاظ سے اگر کوئی بے پر کی افواہ بھی گرم ہو جاتی تو رابعہ کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اس کا نشانہ بن جاتا۔ اپنے پر تو پھر سہہ لیتا لیکن یہ اس کی محبت تھی کہ وہ پیاری بیوی کو ایسی کسی بھی زحمت سے بچانا چاہتا تھا۔

رابعہ چونکہ ایک صاف کردار لڑکی تھی۔ اس لیے اس کے بارے میں کچھ بھی الٹا سیدھا سوچنا اسے ایک پل کے لیے بھی گوارا نہیں تھا۔

چونکہ خاندان والے اس کی منگنی ٹوٹنے پر اسے افسوس کا حق دینے تک کے روادار نہیں تھے وہ، یہ بات سہہ لیتے..... بالکل نہیں.....

اس کا ذہن ان تمام باتوں کو سوچ رہا تھا، جس سے رابعہ جان بوجھ کے انجان بنی ہوئی تھی۔

اپنے گاؤں جانا اس کا سالوں کا خواب تھا اور وہ اس کے لیے بے حد جذباتی بھی تھی۔ اسے اچھی طرح پتا تھا۔ اسی لیے وہ بابر کے انکار پر بری طرح خفا ہو گئی تھی۔

اس کے اپنے دل میں اس حوالے سے کوئی دھڑکا نہیں تھا۔ کیونکہ صاف بات تھی کہ وہ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں تھی..... وہ بھلا کیسے..... اپنے سالوں پرانے ختم شد تعلق کے حوالے سے پریشان ہو سکتی تھی۔ اس کا شوہر اسے چاہتا تھا۔ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی پروا اور خیال کرتا تھا۔ اس کے نزدیک تو ایسا کچھ تھا ہی نہیں جو بابر کو پریشان کر رہا تھا۔ بابر کے خیال میں کئی چیزیں ایک ساتھ اودھم مچا رہی تھیں۔

وہ بہت غیر آرام دہ پوزیشن میں بیٹھا تھا اور اسے خیال تک نہ تھا کہ رابعہ کب کی کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

اس کے ذہن میں تو ایک دن پہلے کی وہ فون کال گھوم رہی تھی۔ جب اس نے اپنے اور رابعہ کے ایک مشترکہ کزن کو گاؤں جانے والی بات بتائی۔

"ابے تو پاگل ہے، رابعہ کو بھیج دے گا وہاں۔"

"ظاہر ہے..... سوچ تو رہا ہوں۔ وہ کئی سال سے انتظار میں تھی کہ کوئی گاؤں جانے کا سین بنے تو وہ بھی چلی جائے۔"

"او بھائی..... کن خیالوں میں ہے تو..... سلمان آیا ہوا ہے..... وہ بھی جائے گا۔"

"تو کیا ہوا آدھا خاندان جا رہا ہے۔ رابعہ کی امی، بھائی، بھابی سب ہی ہوں گے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ سلمان سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ بھول گیا کیا؟" بابر کے دل میں ناگواری کی ایک لہر سی اٹھی۔

"صاف بات ہے۔ میں اگر تیری جگہ ہوتا تو کبھی نہ بھیجتا بھائی..... عورتیں بڑی بے بھروسا ہوتی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے اس بات کا۔۔۔ کیا کہنا چاہ رہے ہو صاف صاف کہو۔"

اس کے لہجے کی سختی محسوس کر کے، وہ ایک دم سنبھلا۔۔۔

"دیکھ بھائی، بات تو بری لگے گی تجھے لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ خدانخواستہ رابعہ بھابی۔۔۔ لیکن پھر بھی۔۔۔ بہت پیسے والا ہو گیا ہے وہ اب۔۔۔ پہلے والا اکمل کو باز نہیں ہے وہ۔۔۔"

بابر نے تنگ آ کے فون تو بند کر دیا لیکن اس کی باتوں کی طرف سے اپنے کان بند نہیں کر سکا۔

اسے رابعہ کی فکر نہیں تھی۔ اس کے کردار کی گواہی تو وہ آنکھیں بند کر کے دے سکتا تھا کہ اس کا اور بابر کا سات سالوں کا ساتھ تھا۔ اور ساتھ بھی لباس جیسا۔۔۔ لیکن معیز کی بات نے اس کو ایک الجھن میں ڈال دیا تھا۔

لوگ پر کا کوا بنا لیتے ہیں۔ اگر وہاں پر بھی بابر کے بغیر رابعہ کی موجودگی کو کسی نے ایشو بنا کے اچھالا تو سلمان کو گزرا وقت اور اس کے جانے کے بعد رابعہ کی حالت یاد آنے سے کون روک سکتا تھا۔

بابر کی غیرت یہ بات گوارا نہیں کر رہی تھی۔

وہ کسی کی نظروں میں اپنے یا رابعہ کے لیے معنی خیزی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ابھی تو ارادہ ہی ہوا تھا تو معیز کی باتیں اسے سلگا گئی تھیں۔ بعد میں پتا نہیں کون کیا کیا کہتا۔

☆☆☆

روانگی میں ایک ہفتہ باقی تھا۔

رابعہ پر امید تھی کہ بابر اجازت دے ہی دے گا۔ وہ دے ہی دیتا تھا۔ اسے کسی بات کو منع نہیں کرتا تھا۔ وہ بھی دیکھ بھال سے رہتی تھی۔ اسے کسی چیز کی، کسی کام کی شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔

اس کا چہیتی بیوی ہونے کا دعویٰ ایسا بھی غلط نہ تھا۔

اسی لیے وہ نہ صرف گھر والوں کے ساتھ گاؤں جانے کو تیار تھی بلکہ ویک اینڈ پر شاپنگ بھی کر آئی تھی۔

اور جس وقت وہ بڑی خوشی اور جوش سے اپنے کپڑے، جوتے، میچنگ بیگز اور ان کو پہننے کی پلاننگ بابر کو بتا رہی تھی۔ بابر اسی وقت معیز کا فون سن کے بلکہ اس سے برین واش کروا کے بیٹھا تھا۔ تبھی اس کے تاثرات اس قدر پتھریلے تھے کہ رابعہ کو بات ادھوری چھوڑنی پڑی۔

"کیا بات ہے۔۔۔؟"

بابر نے جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس کی لائی ہوئی چیزوں کو ایک طرف کر دیا۔

"کیا ہوا۔۔۔ ادھر دیکھیں مجھے۔۔۔" اس نے بابر کا چہرہ زبردستی اپنی طرف موڑا۔

"آپ سے کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔۔۔ بتائیں

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ
مرزا ثمر عباس: 0301-2454188
سرکولیشن منیجر سید منیر حسین: 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ، کراچی

ناں مجھے۔"

"کچھ نہیں کہا کسی نے۔ جب میں تمہیں جانے سے منع کر رہا ہوں تو کیوں ضد کر رہی ہو؟"

"کیوں منع کر رہے ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ آپ جانتے ہیں، میں اسے بچپن سے گئی نہیں ہوں۔ کئی سالوں سے بس سوچ ہی رہی ہوں کہ کوئی مجھے لے جائے۔"

"میں منع کر رہا ہوں یہ وجہ کافی نہیں ہے۔"

"کیوں۔ وں۔ وں۔ وں۔ کیوں منع کر رہے ہیں۔ سلمان کی وجہ سے....." آخر کو اس نے کہہ ہی دیا۔

"تُف رابی..... یہ سلمان کہاں سے آ گیا۔"

"میں بھی تو یہی پوچھ رہی ہوں۔ کہیں آپ کے دل میں کوئی خیال تو نہیں۔"

بابر جز بز سا ہو گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسی سچ پر سوچ رہا تھا۔ جس پر چند دن قبل تک اس کا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔

معیز کی جھگڑالو عورتوں والی خصلت نے خوب آگ لگائی تھی۔

"نہیں..... میں ایسی ذہنیت کا نہیں ہوں۔"

رابعہ مسکرائی پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"اسی لیے تو میں کہتی ہوں۔ تیرے جیسا کوئی نہیں۔"

"اچھا..... اگر ایسا کہتی ہو تو کوئی ثبوت بھی تو دو۔"

"جانے سے منع نہیں کرنا۔ باقی جو کہو گے۔"

بابر نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"جب میں نے کہہ دیا نہیں۔ تو نہیں۔ کیوں بیکار کی ضد بحث اور جھگڑا کرنا چاہ رہی ہو۔ نومی کے ایگزامز سر پر ہیں۔ کیسے پڑھے گا وہ....."

"میں ضد کر رہی ہوں یا آپ.....؟ ہفتوں پہلے بات ہوئی تھی۔ میں نے تب ہی کہہ دیا تھا کہ میں ہر حال میں جاؤں گی..... تب تو کچھ نہ کہا آپ نے۔"

"تب نہیں کہا، اب کہہ رہا ہوں ناں۔" غیر محسوس انداز میں تلخی بڑھ رہی تھی۔ اور آواز بھی۔

"مجھے کوئی پروا نہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ مجھے جانا ہے تو بس جانا ہے۔"

"فضول بکواس مت کرو۔"

بابر ایک دم زور سے چلایا۔ وہ سہم گئی۔ وہ اس سے عمر میں آٹھ سال بڑا تھا۔ ایک قدرتی رعب تھا۔ ایک ان کے رشتے کا روایتی پن۔

"جب میں نے کہہ دیا تو بس کہہ دیا۔ تم نہیں، جاؤ گی..... اور میں ایک لفظ نہیں سنوں گا آگے۔"

ابھی بحث اور بڑھتی لیکن نومی کو دروازے پر کھڑا دیکھ کے رابعہ اٹھی۔ اور اسے لے کے کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆☆☆

روانگی میں صرف ایک دن باقی تھا۔ بابر نہیں مانا۔ ان کے درمیان کئی بار تکرار ہوئی۔ اس نے اپنی امی کو بھی بتایا۔

"جب وہ نہیں مان رہا تو مت جاؤ۔ یہاں تمہارا بھائی طاہر بھی یہی کہہ رہا تھا کہ رابعہ جائے گی تو کوئی کچھ کہہ نہ دے۔"

اس کا دل بری طرح ٹوٹ گیا۔ وہ بھی کون سا بہت جی دار قسم کی لوگوں کی باتوں کو چٹکیوں میں اڑانے والی تھی۔

بہت برے دل سے اس نے ارادہ کینسل کر دیا۔ ساری تیاری دھری رہ گئی۔ سب سے بات چیت بند کر دی تھی اس نے۔ سب سے زیادہ غصہ بابر پر تھا۔

اگر وہ مان جاتا تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن وہ کیسے مانتا۔

معیز کی آگ لگاتی ہوئی باتیں مسلسل اس کے ساتھ تھیں۔

معیز کو ان کے جانے نہ جانے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ خود اور اس کی بیوی بچے بھی نہیں جا رہے تھے۔ وہ صرف رابعہ کو ٹوٹا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی باتیں بابر کے دل میں کیسی آگ لگا رہی تھیں۔

وہ رابعہ کو اس بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا رابعہ اور اکڑ جاتی، معیز کو دکھانے کے لیے جانے کی اور ضد باندھ لیتی یا پھر معیز سے ہی جھگڑا کر بیٹھتی۔ ایک ذرا

ی بات کا کیا، کیا افسانہ بن رہا تھا۔ اب تو خود رابعہ بھی حد درجہ چڑ چکی تھی اور کئی بار جتا چکی تھی کہ اگر بابر چاہتا تو وہ جا سکتی تھی۔ جبکہ بابر خود پر ہر الزام لینے کو تیار تھا لیکن اسے اجازت دینے کے لیے نہیں.....

☆☆☆

سرمئی شام کے رنگ سیاہی میں ڈھل رہے تھے۔ فضا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ اب اگر شال نہ پہنو تو جسم میں کپکپی سی دوڑتی رہتی تھی۔

"شکر ہے کہ گیزر لگا ہوا ہے ورنہ پتا نہیں کیا حال ہوتا۔"

پچھلے دو دن سے بخار کی کیفیت نے اسے ادھ موا کر رکھا تھا۔ جینے کی ہر امنگ سے خالی دل، کمزور جسم کو اور پژمردہ کیے دے رہا تھا۔

وہ خود کو کتنا بھی حوصلہ دے لیتی، کتنا بھی سنبھال لیتی لیکن جو سرد شام اس کی زندگی پر طاری تھی وہ اب اماوس جیسی گہری اور تاریک ہوتی جا رہی تھی لیکن اس کی سحر کے دور، دور تک کوئی امکان نہیں تھے۔

ابھی، ابھی وہ چیخ چلا کے باہر نکلا تھا۔

کوئی ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا تھا۔ اس تک بھی آواز گئی ہوگی۔ اس نے بھیگی آنکھوں، نڈھال جسم اور کپکپاتے ہاتھوں سے جلدی جلدی ٹرے سجائی اور ڈرائنگ روم تک آ کر ادھ کھلا دروازہ ہلکے سے بجایا۔

"آجاؤ بھئی..... آجاؤ..... کوئی غیر نہیں....."

موڈ ہی نہیں انداز، الفاظ، لہجہ سب کچھ بدل چکا تھا۔ وہ ابھی دگرگوں حالت میں تھی لیکن اپنے شوہر کی بات کو ٹال نہیں سکتی تھی۔

پگھلتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور جیسے ہی سامنے نظر پڑی۔

زمین آسمان گھوم گئے۔ ایک تو بخار کی نقاہت، کچھ دیر پہلے ہوئی بے عزتی اور اس پر سامنے بیٹھا شخص.....

اس کے ضبط اور اعصاب نے ایک ساتھ ہاتھ چھوڑے اور وہ ٹرے سمیت زمین پر آ رہی۔

☆☆☆

مدینہ واپسی پر

میری کیفیتِ دل ہو کیسے بیاں
میں خود تو یہاں پر دل ہے وہاں
اللہ میں اس در سے کیوں آ گئی
کہ جس در پر حاضر ہوں کر دیاں
میرا روز و شب اسی طور گزرے
لبوں پہ ہو ہر دم ذکر یاں
میرے لب پہ ہر دم دعا ہو یہی
وسیلہ بنے پھر سے جاؤں وہاں

از: فریدہ افتخار، اسلام آباد

اس نے اپنی مرضی پر بابر کے حکم کو فوقیت دے کر فرمانبردار بیوی ہونے کا ثبوت تو دے دیا تھا لیکن ابھی اس کو تنگ کرنا باقی تھا۔

"کل آپ آفس سے آئیں گے ناں تو ایک سرپرائز دوں گی میں آپ کو....."

"تم نہ جاؤ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی سرپرائز ہو سکتا ہے کیا....."

"اب یہ تو کل ہی پتا چلے گا۔"

سنجیدہ چہرے کے ساتھ کی گئی اس کی بات نے بابر کو کھٹکا دیا تھا۔ لیکن اس نے زیادہ کریدا نہیں۔ یہی بہت تھا کہ ان کی ناراضی ختم ہو گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ رابعہ اسے ناراض کر کے تو کیا، اس کے بغیر کہیں جا ہی نہیں سکتی۔

رات میں نومی کو اچانک ہی تیز بخار چڑھ گیا۔ ان کی بحث، تکرار اور سرپرائز دھرا کا دھرا رہ گیا۔

آدھی رات جاگ کے گزری۔

صبح سے ذرا پہلے جب اس کی حالت بہتر ہوئی تو بابر کو بھی سکون ہوا اور وہ خود تو لمحوں میں بے خبر ہو گئی۔

آنکھ لگنے سے پہلے بابر کو یقین ہو چلا تھا کہ اب سب سیٹ ہو گیا۔ حالانکہ نومی بیمار تھا لیکن جو بھی ہوتا ہے بہتری کے لیے ہوتا ہے۔

کم از کم رابعہ اسے ساتھ لے کے سفر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

جانے تیرے شہر کا کیا ارادہ ہے
آسمان کم ، پرندے زیادہ ہیں

آدھی سے زیادہ بیت چکی رات کے جاتے قدموں میں اس کی نیند کا کوئی سکھ نہیں تھا۔

جلتی آنکھوں میں انگارے بھرے تھے۔ اور وہ خود ایک کے بعد ایک انگارہ سلگا کے سینہ پھونک رہا تھا۔

ایک چکراتا وجود، گرتے ہوئے برتن، لرزتے ہاتھ..... کیا تھا جو بھول جانے کے قابل تھا کچھ نہیں.....

ایک ہنسی تھی جو دل میں گھنٹیاں سی بجا دیتی تھی۔

ایک آواز تھی جو زندگی کی علامت ہوتی تھی کبھی۔

ایک وجود تھا، جس کے ہونے سے اپنے ہونے پر یقین بڑھ جاتا تھا۔

ایک چہرہ تھا، ایک دل تھا، ایک دھڑکن تھی جو اس کا نام جپتی رہتی تھی۔

ایک وعدہ تھا۔ ایک عہد تھا۔ ایک پیمان تھا۔

سب کانچ کے نازک جام کی طرح ہاتھ سے چھوٹا اور گر کر بکھر گیا۔ کرچی کرچی.....

کبھی نہ جڑنے کے لیے.....

خوشی کا حصہ

غم کا حصہ

اس نے سگریٹ لبوں میں دبا کے سانس کھینچی۔ سینے میں گھٹن بڑھ گئی۔

گھونٹ کا حصہ

دم کا حصہ

زخم اور مرہم کا حصہ

جلتے شعلے نے انگلی جلائی تو اس نے بے خیالی میں ہاتھ جھٹکا۔

دل فروشی کا یہ قصہ

جانے تیرا عشق بھی کیا تماشا ہے

رات کو ملزم

دن میں خدا سا ہے.....

سینے سے نکلتی سانس میں جلن بھری تھی۔ اس نے سر بیڈ کراؤن سے ٹکا کے، آنکھیں بند کیں تو ایک قطرہ کنپٹی پر بہہ گیا۔

یوں تو میرا درد بھی، اِک دوا سا ہے
ہر گھڑی زندہ، ہر دن نیا سا ہے.....

☆☆☆

اسے دوپہر کے وقت آفس میں کال آئی تھی جو نومی کی ٹیوشن ٹیچر کی تھی اور جو اُن ہی کی بلڈنگ میں رہائش پزیر تھی۔

ایک لمحے کو اچنبھے کے بعد کسی انجانے خدشے سے اس کا دل لرز گیا۔

صبح دل نہ چاہنے کے باوجود وہ آفس آیا تو نومی کو قدرے بہتر حالت میں کھیلتا ہوا چھوڑ کر آیا تھا۔

"بابر بھائی..... آپ فوراً گھر پہنچیں۔"

الٹے سیدھے خدشات سے بھرا دل لے کے وہ گھر پہنچا تو دروازے پر ہی ٹیچر، ایک گرم شال میں لپیٹے نومی کو لیے کھڑی تھی۔

وہ ہق دق رہ گیا۔

"بابر بھائی، رابعہ بھابی ایک گھنٹے کا کہہ کر اپنے گھر گئی تھیں۔ اب دو گھنٹے ہو رہے ہیں۔ ان کا فون بھی بند جا رہا ہے۔ اور نومی کا ٹمپریچر بڑھ رہا ہے۔ آپ پلیز انہیں فون کریں۔"

وہ خود بھی گھبرائی ہوئی تھی۔

بابر کا تو میٹر ہی گھوم گیا۔

کپکپاتے ہوئے بچے کو لا کر بیڈ پر لٹایا۔ کمبل اوڑھا کے پہلی فرصت میں کال ملائی۔ لیکن فون بند تھا۔

اس کا دل کیا کہ موبائل زمین پر دے مارے لیکن یہ وقت ہوش سے کام لینے کا تھا۔ خود اسے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ رابعہ اتنی بڑی حرکت کر کیسے سکتی ہے۔ کیا وہ اس سرپرائز کی بات کر رہی تھی۔

"بیٹا..... ممانے کیا کہا تھا جاتے وقت؟"

نومی کو دوا پلا کر اس کے غنودگی بھرے دماغ سے وہ اور کیا سوال کر سکتا تھا۔

"کچھ نہیں..... بس پپا کیا اور کہا نانو کے پاس جا رہی ہوں۔"

وہ زیادہ بوجھ کچھ کا متحمل نہیں تھا۔ اس کا ٹمپریچ

بڑھا ہوا تھا۔

"اور..... کچھ نہیں.....بس بیگ لیا اور......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ سوئی جاگی کیفیت میں تھا۔ لیکن یہ ادھوری بات ہی بابر کو شاکڈ کر گئی۔

اس نے پاگلوں کی طرح رابعہ کی الماری کو ادھیڑ ڈالا۔ سارے نئے کپڑے، شاپنگ بیگز اور جوتے غائب تھے۔

یہی وہ سرپرائز تھا جو آج رابعہ اسے دینے والی تھی۔

☆☆☆

"کیا ضرورت تھی یہ سب لانے کی۔ تمہاری چیزیں ہیں۔ رکھ لو پھر کام آجائیں گی۔"

امی کی بات پر وہ بجھے دل سے مسکرائی۔

"بس.....اب دل نہیں چاہے گا انہیں پہننے کا..... بھابی کو دے دیں.....اور کچھ وہاں گفٹ کر دے گا..... جب بھی بہنوں کی یاد آئے گی کہ بابر.....اوہ ہاں....."

وہ کچھ یاد آنے پر تیزی سے اٹھی۔

"بس امی میں جا رہی ہوں۔ موبائل بند ہو گیا ہے اور نومی کو چھوڑ کے آئی ہوں۔ اسے بخار بھی ہے....."

"تو اسے لے کے آنا چاہیے تھا ناں....."

امی کا موبائل بج رہا تھا۔ وہ اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"لو بابر کا فون آ رہا ہے۔"

وہ جو نومی کو نہ لانے کے بارے میں کوئی تاویل دینے والی تھی، رک کر موبائل کان سے لگا لیا۔

"ہیلو بابر!"

"اب چلی ہی گئی ہو تو کان کھول کے سن لو۔ واپس آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بابر خان، بقائمی ہوش و حواس تمہیں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔"

☆☆☆

رگ رگ میں محشر سا بپا تھا۔

آج رات، کچھ دیر پہلے کا منظر یاد آ کے جسم و جاں میں ایک نیا طوفان جگاتا تھا اور وہ نئے سرے سے تڑپ جاتی تھی۔

اس کی اپنی جسمانی تکلیف ہی کچھ کم نہیں تھی کہ اس پر دل کو چرکے لگاتے الفاظ مسلسل اذیت بڑھا رہے تھے۔

"اب یہ ڈرامے کرنے کا نیا شوق چڑھ گیا ہے یا پرانے شوہر کو دیکھ کے ہمدردی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کسی بھول میں مت رہنا۔ تم اس کی نہیں میری بیوی ہو۔ زمین آسمان بھی ایک ہو جائیں۔ تب بھی تم یہاں سے جا نہیں سکو گی......"

"مجھے کہیں نہیں جانا....." بے حد تکلیف سے اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ سر میں درد سے دھماکے سے ہو رہے تھے۔

"یہ مجھے نہیں اپنے آپ کو سکھاؤ۔"

مقابل کے پاس اس کے لیے ہمدردی کے دو بول تو کجا ایک رحم بھری خاموشی تک نہ تھی۔

سر درد اور بخار کی دوا اس کی سوکن نے کھلائی تھی۔

وہ خود بھی دیر سے اس کے سرہانے بیٹھی اس کا لٹا پٹا ادھ مرا وجود دیکھ رہی تھی۔

"بس بھی کریں اب آپ..... اس کی حالت دیکھیں..... آرام کرنے دیں اسے..... خدانخواستہ حالت اور نہ بگڑ جائے.....اور جو بھی کہنا ہے بعد میں کہہ لیجیے گا۔ ابھی چلیں بچوں کے پاس۔ وہ بلا رہے ہیں آپ کو۔"

دھیمے لہجے میں کسی کی منت بھری آواز اس کے کانوں میں پڑی اور اس نے دل سے اپنی سوکن کو دعا دی۔

وقت جو نہ دکھائے کم تھا۔ اس کی سوکن آمنہ کوئی انجان عورت نہیں تھی لیکن اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب وہ اسے نجات دہندہ سمجھ کر دعا دے گی۔

☆☆☆

پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ بت کی طرح صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔ پورے کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں نے گھٹن بھر دی تھی۔

جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اور جو ہوا تھا وہ اچھا نہیں ہوا تھا۔

غصے اور طیش کی کیفیت میں کر گزرنے کے بعد اسے بہت جلد کچھ غلط ہونے کا احساس ہونے لگا۔ لیکن ابھی وہ اس احساس میں پوری طرح گرفتار نہیں ہونے پایا تھا کہ بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

آٹومیٹک لاک کی چابی اس کے علاوہ صرف رابعہ کے پاس ہی ہوتی تھی۔

وہ ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ تیز قدموں سے اندر داخل ہوتی رابعہ اس پر جھپٹ پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھ اس کے گریبان پر مارے.....

"میں تمہیں چھوڑ کے نہیں گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے گئی تھی۔ تم نے یہ کیا، کیا..... مجھے برباد کر دیا..... ظالم۔"

اس کی چیخ نما آوازوں سے پورا فلیٹ گونجنے لگا تھا۔ اور خود کو بچانے کی کوشش کرتا بابر پتھر کا بت بن گیا تھا۔

وہ چلا رہی تھی۔ اسے تھپڑ مار رہی تھی۔ اس کا گریبان نوچ رہی تھی۔ وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔ آپے میں تو شاید بابر بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے بازو لٹکے رہے خود وہ بے دم سا کھڑا، رابعہ کی چیخیں سنتا رہا۔ اس کے تھپڑ کھاتا رہا یہاں تک کہ وہ بے دم ہو گئی اور اسی کے سینے پر سر رکھ کر بلک پڑی۔

"مجھ..... مجھے..... معاف کر دو رابعہ۔"

اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ رابعہ کے شانوں کو تھامنا چاہا لیکن وہ کرنٹ کھا کے اس سے دور ہو گئی۔

وہ اب میاں بیوی تو نہیں تھے۔ اجنبی بن گئے تھے۔

وہ اب ایک دوسرے کا لباس نہیں رہے تھے۔

وہ اب محرم نہیں رہے تھے۔

رابعہ کے چہرے پر خوف امڈ آیا۔ وہ نفی میں سر ہلاتی پیچھے ہوئی۔

"میری بات سنو، میری بات سنو رابعہ..... میں....."

بابر نے ایک بار پھر اسے ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا۔ لیکن اس نے زور سے چلا کے ہاتھ جھٹک دیا۔

"نہیں..... میں اب تمہاری بیوی نہیں رہی..... میں مر گئی ہوں تمہارے لیے....."

اس کے حلق میں خراشیں پڑ گئیں۔

بابر اس کی آواز پر ٹھٹھر سا گیا۔

وہ مڑی اور جا کے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

☆☆☆

وہ رات کتنی طویل اور دردناک تھی یہ وہ خود جانتی تھی یا اس کا خدا.....

تڑپتے، روتے بلکتے..... بابر ساری رات اس کے کمرے کا دروازہ بجاتا رہا۔ وہ بند دروازے کے پیچھے بلکتی رہی لیکن دروازہ نہ کھولا۔ نومی بخار میں جلتا رہا۔ اور ان دونوں کا دل آنے والے وقت کو سوچ کے کانپتا رہا۔

اور پھر وہ رات بڑھ کر اس کی پوری زندگی پر چھا گئی۔ درد کا نوحہ بن گئی۔ ہجر اور پچھتاوے کی بھٹی میں جھلستے دل و ذہن کی اذیت کو کوئی کم نہ کر سکا اس کا دوسرا شوہر بھی نہیں۔

وہ کوئی اور نہیں۔ معیز ہی تھا۔

جس نے عدت ختم ہوتے ہی اس کے لیے پیغام بھیج دیا تھا۔

ایک اور بھونچال جس کا کسی کو گمان بھی نہیں تھا۔ خاندان بھر میں طوفان سا آ گیا۔ ہر کوئی اپنے منہ سے بول رہا تھا، کس، کس کو چپ کراتے..... لیکن جب بات ایک بار پھر رابعہ کے کردار پر آنے لگی تو اس نے ہامی بھر لی۔

اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ وہ کب تک بھائی کی دہلیز پر بیٹھی رہتی۔

اس روز جب وہ معیز کی زندگی میں داخل ہوئی، اس نے زیست کا ایک اور ہی روپ دیکھا۔

نہ صرف زیست کا بلکہ مرد کا بھی.....

"میں نہیں چاہتا تم پچھلی زندگی سے کچھ بھی واسطہ رکھو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ بابر ایک گھٹیا، نفسیاتی اور عورتوں کی فطرت رکھنے والا کانوں کا کچا شخص ہے۔"

رابعہ اپنا دلہنا پا بھول کر ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا..... بہت تکلیف ہو رہی ہے کیا۔ اس کے ذکر سے..... لیکن میں نے کون سی غلط بات کی ہے۔

اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو آج تم یہاں نہ ہوتیں۔"

بات کے اختتام پر اس نے کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ بے اختیار سٹ گئی۔

"خیر اپنے ساتھ تو بھلا ہی کر دیا اس نے۔ میرا بھلا کیا گیا۔ نقصان تو اپنا ہی کیا اس نے۔"

وہ اس کے قریب آ گیا۔ اس کی قربت اور الفاظ نے رابعہ کے دل میں آگ سی لگا دی۔ اسے گھٹن ہونے لگی......

اس نے بے اختیار خود پر جھکتے معیز کو ہاتھ سے روکا۔

معیز ٹھٹک گیا۔ لمحے بھر میں اس کے چہرے پر غیظ چھلکا۔ اس نے سختی سے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے جھٹکا دیا۔

"کسی بھول میں بھی مت رہنا۔ یہاں آئی ہو میری مرضی سے لیکن کبھی واپس جانے کا خواب مت دیکھنا۔ ورنہ تمہارا انجام اس قدر بھیانک ہوگا کہ کوئی عورت کسی خرافات اور یہ حلالہ ولالہ کے بارے میں سوچ کے بھی کانپ اٹھے گی۔"

رابعہ بھی جی جان سے کانپ گئی۔

"حلالہ......؟"

اس نے تو مر کے بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ پھر...... پھر...... معیز کیا ایسا سوچتا ہے؟

اس کی نظروں میں، چہرے پر ہراس در آیا۔ وجود میں لرزش اتر آئی۔ ایک ناقابلِ بیان کیفیت نے جسم میں پھریری دوڑا دی۔

معیز کو اس کے خوف نے مزہ دیا۔ اس نے ہوس کے دیوتا کی طرح اس کا وجود جھنجھوڑا۔ جیسے نوچ ہی کھائے گا۔

رابعہ اس کے جانور صفت انداز کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بابر کی یاد اس کے دل کو مسلتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ خود ایک مسلا ہوا پھول بن گئی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ معیز کے وحشیانہ طور طریقے اس پر عیاں ہوتے گئے اور وہ مرجھاتی گئی۔

میرا چہرہ پڑھ حالات نہ پوچھ...... کے مصداق

رہے تھے۔ کسی کو پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔

وہ اپنی زندگی کے اس بے رحمانہ رویے اور معیز کی شخصیت کی گتھیاں سلجھانے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ جو اس کے ساتھ کچھ اور تھا اور آمنہ کے ساتھ کچھ اور......

آمنہ بھی کچھ دن ناراضی دکھا کر بالآخر بچوں سمیت گھر واپس آ گئی۔ وہ بھی شوہر کو چھوڑ کر کہاں جاتی۔ رابعہ کی طرح دربدر ہونے کے لیے......

بابر کو نفسیاتی مریض کہنے والا خود کس طرح کا تھا۔ جو نہ صرف ذہنی، قلبی بلکہ جنسی مریض بھی تھا......

رابعہ کی جان اس کے وحشی رویے سے سولی پر ٹنگی رہتی۔ اس نے دن کو جلتا انگارہ اور رات کو دہکتی آگ جیسا بنا دیا تھا۔

رابعہ نے کب ایسا رویہ دیکھا تھا۔ وہ تو صدقِ دل سے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی کہ گزرا وقت بھول کر اس کی زندگی کو بھی بہتر بنائے گی اور اپنی بھی جی لے گی۔

لیکن آگے اس کا شوہر نہیں، کوئی انتقام کی آگ میں جلتا ہوا، بغض و حسد کا مارا نیم پاگل شخص اس کا منتظر تھا۔ جو بات بات پر اسے پچھلی زندگی کی یاد دلا کے کہتا کہ بھول جاؤ اس زندگی کو......

کوئی نہیں تھا جو اس کی بات سن سکتا، سمجھ سکتا اور اگر سمجھ لیتا تو اس کے درد کا مداوا کرنے کی سکت رکھتا۔ ماں کو تکلیف سے بچانے کی خاطر اس نے اپنا منہ بالکل ہی بند کر لیا۔ پہلے منگنی، دوسری بار شادی ٹوٹنے سے ان کے اعصاب پہلے ہی جواب دے چکے تھے۔ اب وہ کسی بری خبر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کا وجود صدیوں کے مریض جیسا بے رونق، نقاہت زدہ اور لاغر ہو گیا۔

وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ اور برداشت کرتے کرتے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔

اس دن ایسا ہی ہوا۔

جب معیز حسبِ معمول بابر کو برا بھلا کہہ کر چپ نہیں

ایک دن پہلے ہی رابعہ بخار سے اٹھی تھی۔ مستقل کوئی موسیقی بھی اگر چلتی رہے تو من پسند ہونے کے باوجود بری لگنے لگتی ہے۔ یہ تو پھر اس شوہر کا قصہ تھا۔ جو صرف شوہر نہیں، اس کا محبوب بھی تھا اور دوست بھی...... وہ جب سنتے سنتے بالکل ہی پک چکی تو معیز کی بات کاٹ کر ایک دم سے بولی۔

"بابر ایک گھٹیا شخص تھا۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔"

معیز سیب کاٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تھم گئے۔ اس نے حیرت سے رابعہ کی شکل دیکھی۔

"وہ ایک گھٹیا آدمی تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں اس سے بھی کہیں زیادہ گھٹیا لوگ موجود ہیں۔ لیکن اس نے مجھے ان ہی کے لیے خوار ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔"

معیز کے ہونٹ بھنچ گئے۔

وہ لپک کے اٹھا اور اس کے بال جکڑ لیے۔ تکلیف سے رابعہ کی سسکاری نکل گئی۔

"مجھے گھٹیا کہہ رہی ہے اپنے شوہر کو......"

رابعہ کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔

"نہیں...... میں یہ کہہ رہی ہوں کہ جب تک میں اس کی بیوی تھی۔ اس نے کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ گھٹیا تھا لیکن تم سے کم۔"

"اچھا......"

معیز نے دانت پیس کر اس کے بالوں کو اور زور کا جھٹکا دیا۔ اور اس کا سر شیشے کی ٹیبل پر دے مارا۔ رابعہ کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی۔ لمحے بھر کے لیے اس کا جسم بے جان ہو گیا۔ خون ابل کے سر سے چہرے پر آ گیا۔

"اپنے یار کی کتنی یاد آ رہی ہے ناں تجھے...... میں سب بھلا دوں گا تجھ کو...... خبیث...... کتیا...... میرے گھر میں، میرے ہی......"

اس سے آگے کی بات اس کی سوچ کی طرح ہی گھٹیا تھی۔ وہ دوبارہ اس کے بال نوچنے آگے بڑھا۔ اسی وقت وہ پلٹی اور ایک زوردار آواز کے ساتھ پھل کاٹنے والی چھری اس کے ہاتھ پر دے ماری۔

بالکل بے ضرر، اپنے رحم و کرم پر پڑی ایک کمزور عورت سمجھتا ہے۔ وہ اپنی مضبوطی بھی دکھا سکتی ہے۔ وہ اسے جواب بھی دے سکتی ہے اور ...... اور وہ اس پر حملہ بھی کر سکتی ہے۔

اس کے ہاتھ کی جلد میں چھری اندر تک اتر گئی۔ اس کے ہاتھ سے بھی بھل، بھل خون بہنے لگا۔ وہ سنبھلنے کے لیے صوفے پر گرا۔

تب تک رابعہ دروازہ کھول کر دہلیز پار کر چکی تھی۔

☆☆☆

سر پر بندھی پٹی پر اوپر تک خون چھلک آیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی تھی۔

بھائی، بھابی اور امی اس کے قریب تھے۔ اس کے اپنے، اس سے محبت کرنے والے، اس کے پاس تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بے نیاز آنے والے وقت کی آہٹیں سن رہی تھی۔

معیز اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ جو کچھ کر آئی تھی وہ نہ خود بھولنے والا تھا۔ نہ اسے بھلا دینے والا تھا۔

وہ کہتا تو تھا کہ سب بھول جاؤ۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ وہ یاد رکھے، یاد کرے اور تڑپے۔ وہ بارہا اس کے کبھی کے کہے گئے الفاظ اسے ہزاروں بار جتا چکا تھا۔ جو اس نے کسی کو جلانے کے لیے نہیں صرف بابر سے محبت جتانے کے لیے کہے تھے۔

"بابر مجھ سے اجازت لیے بغیر کیسے جائیں گے۔ میں تو بہت لاڈلی ہوں...... ایسی دیسی باتیں تو وہ بیویاں بھی سنا سکتی ہیں جو پیر کی جوتی کہلاتی ہیں۔"

اسے اپنا طرہ تھا۔ اسے یاد تھے اپنے غرور میں ڈوبے الفاظ......

"مجھے بابر کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ انہیں پتا ہے مجھے کیا بات اچھی لگے گی...... اور کیا بات بری۔"

اپنی چہکتی آواز اور مغرور لہجہ جو اسے خود نہیں بھولا تھا وہ معیز کو بھی سیاق و سباق کے ساتھ یاد تھا۔ پھر وہ کیسے بھول جاتا۔

جتائی تک نہیں تھیں تو وہ باتیں کیسے بھول جاتا جو کبھی ہی اس سے گئی تھیں۔

"لو تھوڑا جوس پی لو۔" امی جب رو دھو کے سنبھل گئیں تو گلاس اس کے لبوں سے لگانے کے لیے پاس آبیٹھیں۔

اسی وقت دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ دستک ایسی طوفانی تھی کہ وہ تو اچھل ہی پڑی۔ پھر بری طرح امی سے چمٹ گئی۔

"امی — امی مجھے نہیں جانا — امی مجھے نہیں جانا — امی — ی — ی۔"

ان کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کے زمین پر جا گرا۔ ایک لمحے میں اس کی حالت نے سب کو نئے سرے سے سکتے میں دھکیلا۔

طاہر اٹھا تو وہ بری طرح چیخنے لگی۔

"مت جاؤ — مت جاؤ بھائی — وہ مجھے لے جائے گا۔ مجھے نہیں جانا۔"

امی نے اسے بانہوں میں چھپالیا۔

پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔

معیز ہنگامہ کرنے آیا تھا۔ اس نے ایک شور برپا کر دیا۔ اپنا پٹی بندھا ہوا ہاتھ دکھا دکھا کے جانے کیا کچھ کہتا رہا۔

امی کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فون کر کے کسی کو بلاتیں۔

انہوں نے خاندان کے دوسرے بزرگوں کو بلا لیا۔ بات بے تحاشا بڑھی تو بابر کے کانوں میں بھی گونج پہنچی۔ لیکن.....

بے بسی کی کون سی گھڑی تھی۔ جو ٹرین کی طرح اس کے وجود کو روندتی چلی گئی۔ پہلے بھی ایک بار وہ معیز کے منت سماجت کرنے اور لاکھ معافیاں مانگنے کے بعد اس کے گھر چلا گیا تھا۔

معیز نے اس سے جھوٹ کہا تھا کہ رابعہ میکے گئی ہوئی ہے۔ وہاں جا کے جو تماشا ہوا اس نے اس کی آنکھوں میں خون اتار دیا تھا۔

وہ تب بھی بے بس تھا اور آج بھی.....

طنزنگ کے ٹکڑے

ہمارے میاں پر پینٹ کوٹ بہت سوٹ کیا کرتا تھا۔ اب تو پہنتے ہوئے بھی ایک عرصہ ہو گیا لہٰذا ہم نے وہ تمام سوٹ اپنے بچوں کے بچوں کے لیے بھی سنبھال کر رکھ لیے کیونکہ ہمارے بچے اتنے سیدھے نہیں کہ اتنے پرانے فیشن کے پینٹ کوٹ پہنیں اور ہم اتنے فضول خرچ نہیں کہ اتنے مہنگے سوٹ برتنوں والوں یا کسی غریب کو خیرات کر دیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے بچے پینٹ کوٹ نہیں پہنتے، پہنتے ہیں بلکہ کبھی اتارتے ہی نہیں۔ جب چھوٹے تھے ہمیں بھی بڑا ارمان تھا بچوں کو پینٹ کوٹ پہنانے کا — اب شادیوں پر ہمیں کوئی بلاتا نہیں تھا۔ آہم — سب اچھی طرح جانتے تھے کہ شادی پر جانے سے دو دن پہلے ہمارے گھر میں چولھا نہیں جلتا اور ہم ہر شادی پر اپنے آدھے درجن بچے لے جاتے اور کبھی کبھار تو ایک آدھ بچہ شادی پر بھول کر بھی آجاتے اور کبھی لفافے میں پیسے ڈالنا بھول جاتے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم بھول گئے کہ ابھی ہم کیا کہہ رہے تھے؟ ہاں یاد آیا شکر فکافٹ یاد آگیا۔ تو اگر عید پر نانی نے پینٹ کوٹ ہمارے بچوں کو دلوا دیا تو ہم نے بھی پیسے پورے کیے ہمارے بچے چاہے سمندر پر جائیں چاہے نہر پر، چڑیا گھر جائیں یا سند باد ہمارے بچے اسی سوٹ میں ہی نظر آتے بلکہ ایک دفعہ تو ہماری جیٹھانی نے ہمارے بچوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا کہ کیا تمہاری اماں ہر اتوار کو تم لوگوں کو پینٹ کوٹ پہنا کر لے جاتی ہیں جیسے تمہاری بارات لے کر جا رہی ہوں۔ یہ بات بچوں کے ننھے منے دلوں پر ٹھاہ کر کے لگی اب وقت یہ آگیا ہے کہ ہمارے بچے مال بھی جائیں تو ٹراؤزر ٹی شرٹ اور چپل میں ہوتے ہیں جب ہم سمندر پر سوٹ پہن کر جاتے تھے تب لوگ ہمیں عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ اب ہمیں غریب سمجھ کر اور زیادہ عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ ہم کیا بتلائیں۔

مرسلہ: آسیہ عامر، کراچی

تھا۔اس لیے وہ معیز ہوتا یا کوئی اور بابر شکایت کا حق نہیں رکھتا تھا۔ پھر معیز نے جس طرح اس سے معافیاں مانگیں۔ رابعہ کی بے سہارگی کا نقشہ کھینچا۔ اس سے اس کا دل نرم پڑ گیا۔ صرف اس حد تک کہ وہ اس کی بات سننے پر راضی ہو گیا۔ جس پر معیز نے وہ مکروہ سین کری ایٹ کیا جس کے لیے اسے بلایا تھا۔

اپنی بیوی کے دوسرے شوہر کے گھر جا کے اس کی تذلیل دیکھنا اس کے لیے بھی اتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنا رابعہ کے لیے۔

وہ خود کو لاڈلی کہتی تھی تو یہ غلط نہیں تھا۔ گزرتے وقت نے اسے بابر کو اتنا ہی محبوب کر دیا تھا۔ وہ خود ایک شوہر سے بڑھ کے اس کا محبوب تھا۔ جس کا رابعہ نے ان گنت بار اعتراف کیا تھا۔ وہ اس کی محبتوں کا مرکز اور چشم دید گواہ تھا۔

وہ کیسے برداشت کرتا سب کچھ..... لیکن جو ہونا تھا وہ ہوا۔ اور جو ہو چکا تھا اس پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

اس نے بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر صدق دل سے رابعہ کے لیے دعا مانگی.....

☆☆☆

اتنا بڑا سانحہ ہو جانے کے بعد گاؤں جانے اور گھومنے پھرنے کا خیال کس کو آ سکتا تھا۔

امی کی تو بے یقینی اور حیرانی ہی ختم نہیں ہوتی تھی۔ ان کا اتنا اچھا، فرمانبردار اور باکردار، رابعہ کو چاہنے والا۔ اس سے محبت کرنے والا، اس کی عزت کرنے والا شخص اسے چھوڑ بھی سکتا ہے۔ اتنا بڑا قدم ایسے بنا سوچے سمجھے بھی اٹھا سکتا ہے؟

لیکن طلاق تو ایسے ہی دی جاتی ہے۔ بلکہ زیادہ تر تو دی ہی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے منہ سے نکل جاتی ہے۔

غصے کو اسی لیے حرام کہا گیا ہے۔

سلمان جو سالوں بعد وطن واپس لوٹا تھا۔ پہلے اس نے خود ہی منگنی توڑی تھی۔ اب اس کی شادی ٹوٹنے کا سبب بھی خود کو سمجھتے ہوئے اتنا شرمسار ہوا کہ اسی دن ان کے گھر سے اپنے دوست کے پاس چلا گیا۔ دوبارہ صرف اس وقت ملنے آیا، جب وہ واپس جا رہا تھا۔

گھر والے اس سے کیا کہتے۔ اس میں خود بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

ایک غیر متعلقہ شخص کی وجہ سے ان کے گھر اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور وہ اس کو براہ راست کچھ کہہ بھی نہیں سکے۔ حالانکہ وہ خود کو کہیں نہ کہیں قصوروار ضرور سمجھتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ چیپٹر تو کلوز ہو گیا۔ لیکن رابعہ کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے ایک نئی کھکیڑ ڈال گیا۔

☆☆☆

خاندان کے بڑے تو صرف بیچ بچاؤ کرانے آئے تھے۔ لیکن جب رابعہ کی حالت دیکھی تو معیز کو بھی بری بھلی سننی پڑی۔

بات کہہ سن کے ختم ہو ہی جاتی لیکن وہیں سے رابعہ کی زندگی اسی سرے سے دوبارہ جا کے جڑتی جہاں سے وہ چند گھنٹوں پہلے ہی جان چھڑا کے آئی تھی۔

آنے والا وقت اس کے لیے کتنا بھیانک ہو سکتا تھا۔ اس بات کا اندازہ اسے ہی نہیں کچھ اور لوگوں کو بھی ہو رہا تھا۔

اوپر سے معیز نے جو حلالے والی بات تنہائی میں رابعہ سے کہی تھی وہ، بھرے خاندان کے بیچ بول دیتا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہتی نہ معیز سے علیحدگی کا سوچ بھی سکتی۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ پچھلے چند ماہ یا تقریباً ایک سال میں معیز کی... جہالت کی وجہ سے وہ آدھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔

معیز نے خود کو ٹھنڈا کیا۔ اور رابعہ کو ساتھ لے جانے کی بات کی۔ رابعہ کا جسم بے جان ہو گیا۔

"میں ابھی اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیج سکتا....."

طاہر کی اس بات نے ایک نئے فساد کا آغاز کر دیا۔

معیز کا کہنا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو لے کے جائے گا۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

"ابھی کچھ دن رہنے دو، زخمی بھی ہے۔ اور ڈری ہوئی بھی ہے۔ ذرا حالت سنبھل جائے تو....."

جب اور لوگ بھی اس کے خلاف ہونے لگے تو وہ اٹھا اور دندناتا ہوا جا کے رابعہ کے سر پر پہنچ گیا۔

"چلو گھر....."

اس نے رابعہ کی کلائی پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

طاہر اور دوسرے سب لوگ جو اس کے پیچھے، پیچھے آئے تھے۔ اس کا انداز اور رابعہ کی حالت دیکھ کر بری طرح چڑ گئے۔

طاہر کو طیش آ گیا۔

"جب وہ کہہ رہی ہے کہ نہیں جانا۔ تو کیوں زور لگا رہے ہو....."

وہ بھی آگے آ گیا۔

"اس کا باپ بھی جائے گا۔" اس کے انداز تخاطب نے طاہر کو بری طرح بھڑکا دیا۔

اس نے بھی ہاتھ پکڑ کر کھینچا تانی شروع کر دی۔

رابعہ خوف سے چیخ رہی تھی۔ اور طاہر اور معیز چند لمحوں بعد ہی اسے چھوڑ کر آپس میں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔

سائڈ ٹیبل پر رکھی چیزیں اِدھر اُدھر گریں۔ خواتین کی چیخ و پکار پر ایک دو اور کزنز جو ساتھ آئے تھے۔ ان کے بیچ بچاؤ کرانے پر بڑی مشکل سے ان دونوں کو قابو کیا۔

معیز دھمکیاں دیتا الگ ہوا۔ اسے زبردستی گھسیٹ کے دروازے سے نکالا۔ لیکن وہ جاتے، جاتے بھی اپنی نیچ سوچ کا مظاہرہ کرنا نہیں بھولا۔

"جانتا ہوں میں..... کس کے لیے یہ ڈراما کر رہی ہے۔ کسی بھول میں مت رہنا..... اس کتیا نے حلالہ کرنے کو مجھ سے شادی کی تھی..... میں سب جانتا ہوں۔"

طاہر پھر اسے مارنے کو لپکا۔ بڑی مشکل سے امی نے روتے ہوئے اسے منتیں دے دے کے روکا۔

طاہر کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ تنفس تیز اور آواز گلا پھاڑ کے نکل رہی تھی۔

وہ اب مستقل معیز کو گالیاں بک رہا تھا۔

حلالے کی بات نے اس کی غیرت پر ایسا طمانچہ رسید کیا تھا کہ وہ بلبلا اٹھا تھا۔

☆☆☆

دن گزرے تو طاہر نے اس سے سنجیدگی سے بات کی۔

"اس نے بالکل جھوٹ کہا ہے بھائی۔"

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بات کو کیسے دُہرائے جو اسے ایک گالی کی طرح لگتی تھی۔

"میں..... میں نے..... اس سے شادی کی تھی بس..... جو وہ کہہ رہا تھا ویسا کچھ بھی نہیں....."

بات کے اختتام تک وہ پھوٹ، پھوٹ کے رو پڑی۔

یہ کیسا مقام تھا زندگی کا۔ جس بات کو اس نے سوچا تک نہ تھا اسی کے لیے قسم کھانی پڑ رہی تھی۔

بھائی نے اسے بازوؤں میں بھر کے خود سے لگا لیا۔

بھائی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"تم نے سوچا ہو یا نہ سوچا ہو..... لیکن اب ہو گا یہی۔"

کچھ دیر بعد طاہر کی آواز گونجی تو دونوں کو سکتہ ہو گیا۔

☆☆☆

"اب کیا معیز سے بھی طلاق دلواؤ گے اسے۔"

"صرف طلاق نہیں..... باہر سے دوبارہ شادی بھی....." اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ امی کو سانپ نے ڈنک مارا۔

"ارے دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اور لوگ کیا کہیں گے۔ معیز کی بات کو سچ کر دیں کیا ہم۔ اس طرح تو رابی پر الزام لگ جائے گا کہ اس نے واقعی یہی سوچ کے شادی کی تھی معیز سے۔ تماشا بن جائے گا اس کا۔" وہ بولنے پر آئیں تو بولتی چلی گئیں۔

"آپ کو تماشا چاہیے یا اپنی بیٹی۔"

امی نے ہانپ کر رکتے ہوئے اس کے ٹھنڈے لہجے کا استفسار سنا..... اور اچانک سے خود بھی ٹھنڈی پڑ گئیں۔

"بتائیں..... رابی کی حالت دیکھی تھی اس روز..... وہ اور بھی پتا نہیں کیا کیا..... " اس نے ضبط سے جبڑے بھینچے۔ "کرتا رہا ہے اس کے ساتھ۔"

"کیا..... اور کیا.....؟" انہوں نے سہم کر اپنے

بیٹے کی شکل دیکھی۔ ایسا کیا کیا تھا اس نے جو بیٹے کو پتا تھا اور وہ ماں ہو کر بھی انجان تھی۔

"امبر نے بتایا ہے مجھے۔ اس کے کندھوں پر نیل کے نشان ہیں۔ اور سر میں اتنی تکلیف ہے کہ وہ امبر کو کنگھا نہیں کرنے دے رہی تھی۔"

"ہائے اللہ میری بچی ——"

ان کے کلیجے پر ہاتھ پڑا۔

"یہ تو صرف وہ ہے جو امبر کو پتا چل گیا ہے۔ جو چھپا لیا اس نے وہ کیا ہوگا آپ اندازہ لگالیں —— رابعہ کوئی ڈرپوک لڑکی نہیں تھی۔ وہ تو بہت زندہ دل تھی۔ بابر کے ساتھ جیسے جیسے ٹائم گزر رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ۔ پُراعتماد ہوتی جارہی تھی۔ اکیلے سفر کر کے یہاں تک آجاتی تھی۔ اپنا گھر سنبھال رکھا تھا اس نے۔ اندر باہر کے سو کام کرتی تھی وہ۔ اس دن دیکھا تھا، کتنی ڈری ہوئی تھی۔ جو بھی ہوا ہے وہ کم نہیں ہوگا۔ اور میں بھی مرد ہوں۔ جانتا ہوں ان کی حرکتوں کو —— اور میں جانور نہیں ہوں امی —— میں انسان ہوں —— میں محسوس کرسکتا ہوں اس کے درد کو۔ میں بھائی ہوں اس کا —— مداوا کرسکتا ہوں تو کیوں نہ کروں ——" اس کی لہجے سے دکھ اور افسوس کے ساتھ ایک عزم جھلک رہا تھا

"لیکن —— بابر مان جائے گا؟ اور رابعہ —— وہ تو کبھی راضی نہیں ہوگی۔"

طاہر نے ایک گہری سانس لے کر جیسے خود کو اپنے توانا ہونے کا یقین دلایا۔

"وہ سب بعد کی بات ہے۔ پہلے میں اس منحوس کے بچے سے رابعہ کی جان تو چھڑواؤں —— خبیث ——"

اس نے دانتوں تلے معیز کو تصور میں چبایا۔

"معیز —— وہ کیسے ——" ان کا ذہن گڈمڈ ہو رہا تھا۔ تانے بانے کم اور الجھے زیادہ رہے تھے۔ ایک ناامیدی اور …… امید کے بیچ لٹکے ہوئے دل کی کیفیت شکل سے عیاں تھی۔

"وہ نہیں مانے گا کبھی نہیں …… بے عزت کر دے گا ہم سب کو سب کے سامنے۔"

ان کی آواز گھٹ گئی۔ دوپٹا منہ پر ڈھانپ کے بمشکل سسکاری کو دبایا۔

"عزت، بے عزتی اللہ کے ہاتھ میں ہے آپ صرف دعا کریں۔ دعا اللہ کو مناتی ہے۔ اور جب اللہ منواتا ہے تو اچھے اچھے بھی مان جاتے ہیں۔"

☆☆☆

قصہ مختصر ——

معیز کو طلاق دیتے ہی بنی کیونکہ خلع کا آپشن کھلا تھا۔ یوں نہ دیتا تو لے لی جاتی۔ خاندان والوں، سسرال والوں کا دباؤ الگ تھا۔ اس کا رویہ جو سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس وجہ سے رابعہ کا پلڑا بھاری ہوگیا۔

حق مہر وہ پہلے ہی دن معاف کروا چکا تھا۔ رابعہ کو بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کون سا معیز سے علیحدگی کا سوچا تھا۔ اب نوبت آہی گئی تھی تو حق مہر کے جھنجھٹ میں کسی کو پڑنا بھی نہیں تھا۔

ورنہ کیوں معاف کیا، کیسے اور کب —— جیسے سوال ایک نیا جہان کھولتے۔ جس میں معیز ہی کی بدنامی تھی۔ وہ اب بھی الٹا سب کی لعن طعن سن رہا تھا۔ جان چھڑانے میں ہی عافیت تھی۔

جس دن رابعہ کی دوسری طلاق کی عدت شروع ہوئی اس دن مہینوں بعد بابر سکون کی نیند سویا اپنے بیٹے کو تسلی دے کے کہ مما بہت جلد ان کے پاس واپس آجائیں گی۔

رابعہ کو صرف اپنا حال ہی نہیں مستقبل بھی دیکھنا تھا۔ وہ کسی صورت بابر کے لیے راضی نہیں تھی۔

"کوئی بھی ہو، بس بابر نہیں۔"

"مجھے پتا ہے، تم کس بات سے خوفزدہ ہو …… لیکن یہ سوچو رابعہ …… تم کسی انجان شخص سے شادی کر کے یا زندگی بھر خالی بیٹھ کر بھی کسی کی زبان بند نہیں کر سکتیں۔ آج اگر کوئی تمہاری مدد کو آگیا تو ضروری نہیں کہ آئندہ بھی آئے۔ تمہیں پہلی بار نہیں دوسری بار طلاق ہوئی ہے۔ خدانخواستہ، تیسری بار بھی کچھ غلط ہو

گیا تو جن لوگوں کی زبان کی وجہ سے آج تم بابر کو انکار کر رہی ہو، کل یہی لوگ سب سے پہلے تمہیں الزام دینے کھڑے ہوں گے کہ رابعہ کو گھر بسانا نہیں آتا۔ تمہارے پاس مزید رسک لینے کی گنجائش نہیں ہے رابی..... تم پہلے ہی....."

اسے بات ادھوری چھوڑنی پڑی۔

رابعہ منہ چھپا کے سسک رہی تھی۔

"میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ سب کو چھوڑ دو..... اپنے آپ کو بھی..... صرف اور صرف نومی کا سوچ لو ایک بار....."

بات اب مکمل ہوئی تھی۔ رابعہ کے دل کو جوتے تلے مسلنے کے بعد.....

☆☆☆

زندگی کی ہر خوشی کچھ دے یا نہ دے۔ ہر نیا دکھ ایک نیا سبق ضرور دے کے جاتا ہے۔

اس نے بھی بیتے دنوں کے ہر نئے دکھ سے کچھ نہ کچھ سبق ضرور لیا تھا۔

غصہ پینے، ضبط کرنے کا سبق

صبر کا سبق

بے قصور ہوتے ہوئے بدنامی کا سبق

زندگی بھر کے فیصلے پر خود غرضی کا سبق

اور سب سے بڑھ کے.....

اپنی خوشی اور اطمینان کی بے جا نمائش سے بچنے کا سبق۔۔۔

دروازہ کھلا۔

اس کا تنفس تیز ہو گیا۔

بابر اس کے پاس آ کے بیٹھا۔

یہ طلاق کے بعد ان کا پہلا سامنا تھا۔

رابعہ کا دل پگھلنے لگا۔ اس نے کس ہمت سے سوچا تھا کہ وہ کسی اور کی ہو جائے گی دوبارہ بابر کی نہیں.....

"رابی۔"

بابر کی آواز اس کے کانوں میں کیا پڑی جیسے اس کے پتھر سے جسم میں کسی نے زندگی پھونک دی۔

بابر نے دھیرے سے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ تو اس کی آنکھیں لبالب بھری ہوئی تھی۔ بابر کی اپنی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اس نے بے تابانہ اسے خود میں سمو لیا۔ اور رابعہ کی بھری آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے۔

وہ اتنا پھوٹ، پھوٹ کے اور اس قدر تڑپ کے روئی جیسے زندگی بھر کے آنسو آج ہی بہا ڈالے گئی۔

بابر کے دل کو کوئی چیر تا رہا۔ اور رابعہ کے آنسو ان چوٹی ہوئی دراڑوں میں جذب ہو کے ان کو بھرتے رہے۔۔۔

☆☆☆

"میں اب کسی سے یہ نہیں کہوں گی کہ میں آپ کی بہت لاڈلی بیوی ہوں۔"

"کیوں؟"

صبح کی نرم، نرم سنہری دھوپ بند دریچے کے اجلے شیشوں سے اندر آنے کو بے تاب تھی۔ وہ اس کے سنہرے عکس میں، رابعہ کے زرد ماتھے پر پڑے دھندلے نشان پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"طرہ، اکڑ اور غرور جس روپ میں بھی ہو۔ ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ اور جب یہ ٹوٹتا ہے تو بہت کچھ ساتھ لے کے بکھرتا ہے۔ عورت کو کسی مرد پر ناز کرنا راس نہیں آتا۔ وہ سر کا تاج بننے کی کوشش میں کلنک کا ٹیکا تو بن سکتی ہے۔ لیکن کسی مرد کے ماتھے کا چمکتا ستارہ نہیں بن سکتی۔ اس لیے پیر کی جوتی ہی بھلی۔"

اس نے پاس سوئے ہوئے نومی کی پیشانی پر پیار کیا۔ اور بابر کو سوچ کے بھنور میں دھکیل کے اٹھ گئی۔

کچن کا چولھا جلاتے ہوئے اس کا دماغ الگ ہی نہج پر سوچ رہا تھا۔

بابر بہت مہربان سہی۔۔۔ تھا تو اس کا پہلا شوہر۔۔۔ اس سے اس کا مان چھیننے والا وہی تو تھا۔ اس کا غرور، اس کا طرہ خاک میں ملا کر اسے اسی کی راجدھانی سے۔۔۔ بے دخل کرنے والا۔

اس کا مان بھی بھروسے کے کاغذ کی طرح مڑا تڑا ہو گیا تھا۔ اب دنیا کی کوئی مشین اسے دوبارہ سے بے شکن نہیں کر سکتی تھی۔

مکمل ناول

بساط

ناہید سلطانہ اختر

اماں کہا کرتی تھیں ساری عورتوں کا نصیب ایک جیسا ہوتا ہے۔ بلند و بالا عمارتوں کے عقب میں پہرے داروں کی طرح متعین نقرئی اور سرمئی بادلوں کو دیکھتے ہوئے اس کی خوب صورت آنکھوں کی دلآویز کٹوریاں آنسوؤں سے لبالب بھر کر چھلک اٹھیں۔

اماں کے برعکس ابا کا مسلک یہ تھا کہ ہر فرد اپنا نصیب آپ لکھتا ہے۔ مگر اپنے مسلک کے برخلاف ابا نے اس کا نصیب خود اسے لکھنے دینے کے بجائے آپ

لکھنے کی کوشش کی تھی۔ اور ان کی اس کوشش میں کوئی اور نہیں صرف وہ ماری گئی تھی۔ اس کا نصیب خود لکھنے کی عنان گیری میں ابا کے بعد دیگرے اس کے دل میں پنپنے والی محبتوں کی گردنیں نہایت بے رحمی سے مارتے چلے گئے تھے۔

لفظ اس کی اولین محبت تھے۔ برسوں پہلے جب اسے زندگی کا اچھی طرح شعور بھی نہ تھا اس نے لفظوں سے دوستی کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ وہ آج تک خود یہ نہ جان پائی تھی کہ اس محبت کا امرت کیوں اور کیسے اس کے نفس میں اترا تھا..... بہت بعد میں اسے پتا چلا کہ اس محبت کے سوتوں پر بند باندھ کر اس کا جینا کسی اور کے کیا خود اس کے اپنے بس میں بھی نہیں تھا۔

اماں نے پہلی بار ابا کو اس کے دل میں پنپنے والی اس محبت سے آگاہ کیا تو وہ چونک گئے۔

"کیا..... کہانی..... نہیں، نہیں..... بیکار..... بکواس ـــــ فضول..... خرافات..... بیٹا پڑھائی پر دھیان رکھو۔" ابا نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"ابا! اس کی رف کاپی میں بہت سی کہانیاں ہیں..... اسکول میں انٹرویل میں اپنی دوستوں کو پڑھ کر سناتی ہے یہ۔" اس سے تین سال بڑی امینہ نے ابا کو بتایا۔

"تمہاری یہ بیٹی کہانیاں ہی لکھا کرے گی۔" اماں بولیں۔

"انیسہ دکھاؤ ناں ابا کو اپنی کاپی۔" امینہ نے مسکراتے ہوئے انیسہ کو دیکھا۔

"نہیں، نہیں بیٹا..... کہانیاں وہانیاں لکھنا فضول کام ہے۔" ابا نے انیسہ کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا اور ہدایت کی۔ "پڑھائی کرو بس۔" انیسہ کا دل بجھ کر رہ گیا۔

"زرینہ ہماری دونوں بیٹیاں افسر بنیں گی۔" ابا نے وہ کہا جو وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ چھوٹے سے کنبے میں بس دو ہی بیٹیاں تھیں، بڑی امینہ اور چھوٹی انیسہ..... اولادِ نرینہ سے محروم ابا نے اپنی تمام امیدیں بیٹیوں سے وابستہ کر لی تھیں۔ ابا کی ساری زندگی کلرکی کرتے اور افسروں کی ہر درست اور غلط بات پر "یس سر" کہتے گزری تھی۔ آمدن محدود تھی اور محکمے کی جانب سے فراہم کردہ دو کمروں، دالان اور آنگن پر مشتمل تنگ و تاریک کوارٹر میں مقید زندگی نہایت یکسانیت میں تھی۔

تڑکے جاگنا، اللہ کو یاد کرنا، پتلی سی چائے، چنگیر میں چھوٹی، چھوٹی چار روغنی روٹیاں، رات کا سالن، بہت ہوا تو کبھی کبھار تھوڑا، تھوڑا سا خاگینہ، ابا کی سائیکل پر دفتر روانگی، امینہ اور انیسہ کا پیدل ہی اسکول جانا، دوپہر کو گھر واپسی، سادہ سا کھانا، سہ پہر کو محلے کی بچیوں کے ساتھ گلی میں تھوڑا سا کھیل کود، شام کو ہوم ورک، رات کا کھانا اور سو جانا، اگلی صبح پھر وہی معمول.....

محکمے کی رہائشی کالونی جہاں ان کا مختصر سا کنبہ مقیم تھا چار اقسام کی رہائش گاہوں پر مشتمل تھی۔ نچلے درجہ کے ملازمین کے لیے چھوٹے، چھوٹے کابک نما کوارٹرز تھے ایک کمرا، غسل خانہ، باورچی خانہ اور ڈیوڑھی..... دوسرے درجہ کے ملازمین کے لیے دو کمروں، دالان، آنگن، باورچی خانہ اور غسل خانہ پر مشتمل بوسیدہ مکانات، افسران کے لیے ڈرائنگ روم، ٹی وی لاؤنج علیحدہ، علیحدہ غسل خانوں کے ساتھ دو سونے کے کمرے، باورچی خانہ، برآمدہ، لان اور پورچ پر مشتمل بنگلے..... افسران اعلیٰ کے لیے دو منزلہ کوٹھیاں تھیں جن کے پورچ میں بیک وقت تین چار گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔

کالونی کی مرکزی داخلہ گاہ سے ایک صاف ستھری، لہراتی، بل کھاتی سڑک کالونی میں واقع کاروباری مرکز تک پہنچنے کے بعد کئی شاخوں میں بٹ کر چار اقسام کی ان رہائش گاہوں تک جاتی تھی۔ یہ شاخیں گویا وہ حدِ فاصل تھیں جو ان رہائش گاہوں کے طبقاتی فرق کو نمایاں کرتی تھیں۔ گرمیوں کی راتوں میں جب کالونی کے مکین چہل قدمی اور ہوا خوری کے لیے باہر نکلتے تو کالونی میں آباد طبقات بڑی سڑک کی اپنی ہی شاخ کی حدود کے پابند رہتے۔ نہ کوارٹروں اور دو کمروں کے گھروں والے افسران کی حدود میں جاتے،

نہ افسر گھرانوں کے لوگ ان کی طرف آنا پسند کرتے۔ اور افسران اعلیٰ گھرانوں کی تو کیا ہی بات تھی۔ اپنی کوٹھیوں کے لان میں ایستادہ کھمبوں کی روشنی میں گھاس پر چہل قدمی کرتے اور لان چیئرز پر بیٹھ کر مشروبات پیتے، آئس کریم کھاتے۔ چھوٹے گھروں کے مکین بنگلے والوں کو نہایت رشک سے دیکھتے اور بنگلے والے افسران اعلیٰ افسران کی کوٹھیوں کے سبزہ زاروں اور پورٹیکوز میں پھیلی دودھیا روشنی اور اس روشنی میں نہائی پورٹیکوز میں کھڑی نئے ماڈلز کی گاڑیوں کو للچائی نظروں سے دیکھتے۔ عجیب تھا کہ یہ طبقاتی تفاوت بھی انسانوں کو انسانوں سے فاصلے پر کھڑا کر دینے والا۔

کالونی کے مرکز میں ایک شاپنگ کمپلیکس تھا جہاں کوارٹروں اور دو کمروں کے مکانوں والے مکین بھی خریداری کرنے آتے اور بنگلوں، کوٹھیوں کے باسی بھی جو اپنی چھوٹی، بڑی اور نئی پرانی گاڑیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اترتے۔ چھوٹی گاڑی والے بڑی گاڑی والے کو اور پرانی گاڑی والے نئی گاڑی والے کو مرعوبیت سے دیکھتے۔ کوارٹروں اور چھوٹے مکانوں والے سائیکل اور موٹر سائیکل سواروں اور پاپیادہ خریداری کے لیے آنے والوں کو تو چھوٹی اور پرانی گاڑیوں والے بھی کمتر نگاہوں سے دیکھتے۔ نچلے درجے کے ملازمین گھرانوں کی لڑکیاں اور عورتیں ان کی نگاہوں سے چھلکتی تحقیر سے جھینپ کر اپنی اوڑھنیاں سنبھالنے اور بدن چرانے لگتیں۔ شاپنگ کمپلیکس میں دکاندار افسران اور ان کے اہل خانہ کے سامنے بچھ، بچھ جاتے اور کلرکوں، نائب قاصدوں اور چوکیدار گھرانوں کے افراد کو سودا سلف یوں دیتے جیسے ان پر احسان کر رہے ہوں۔ کالونی کا ماحول معاشرتی طبقاتی تفاوت کی عظیم الشان مثال تھا۔

صبح سویرے جب کوارٹروں اور چھوٹے مکانوں والے بچے اپنے اسکول، کالج جانے کے لیے کالونی کے مین گیٹ کی جانب پیدل جا رہے ہوتے بنگلوں اور کوٹھیوں والوں کی چھوٹی، بڑی اور نئی، پرانی گاڑیاں زن

جگہ بھی ہوتی مگر کوئی پیدل جاتے بچوں کو اپنی گاڑی میں کم از کم مین گیٹ تک ہی لفٹ دینے کی زحمت نہ کرتا۔ مین گیٹ رہائشی علاقے سے خاصی دور تھا۔ عوامی بسوں میں سفر کر کے اپنے اسکول، کالج جانے والے کالونی کے رہائشی طالب علموں کو اپنے گھروں سے مین گیٹ تک اور پھر مین گیٹ سے بس اسٹاپ تک لمبی مسافت پیدل طے کرنا پڑتی، سردی، گرمی، بارش ہر موسم میں یہ طویل مسافت اور دشوار ہو جاتی مگر جن کو اس کا سامنا تھا انہیں تو بہر صورت طے کرنا پڑتی۔

غنیمت تھا کہ محکمے کے تمام دفاتر کالونی کی حدود ہی میں رہائشی علاقے سے دور واقع تھے سو نچلے درجے کے ملازمین عوامی بسوں میں سفر کی مشکلات سے عافیت میں تھے۔ کوئی پیدل جاتا کوئی سائیکل پر کوئی موٹر سائیکل پر چند جی داروں نے چھکڑا گاڑیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ افسران اور اعلیٰ افسران کالونی کی حدود میں واقع اپنے دفاتر بھی گاڑیوں میں آتے جاتے، پیدل چلنا گویا ان کے لیے خلافِ شان تھا۔

ابا اپنی سائیکل پر دفتر آتے جاتے۔ واپسی پر ابا اپنی سائیکل کی گھنٹی چار گھر پرے سے ہی بجانے لگتے۔ اماں ان کی سائیکل گھر کے دروازے پر پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ کھول دیتیں۔ امینہ اور امیمہ ابا سے زیادہ اس چیز کی بے چینی سے منتظر ہوتیں جو ابا ہر روز دفتر سے واپسی پر شاپنگ کمپلیکس سے ان کے لیے خریدتے ہوئے آتے تھے، کبھی نانفیاں، کبھی سموسے، کبھی نمک پارے، کبھی جلیبی اور کبھی کچھ اور......

بنگلوں میں مقیم افسران میں چند ایسے بھی تھے جن کے بڑے کبھی چھوٹے مکانوں یا کوارٹروں کے مکین ہوا کرتے تھے لیکن ان کے بچے اپنی تعلیم اور لیاقت کے بل بوتے پر اپنے بڑوں کو چھوٹے مکانوں سے بنگلوں میں لے آئے تھے۔ ایسے ہی سیلف میڈ افسران کو دیکھ کر ابا نے بھی اپنی دونوں بیٹیوں کو افسر بنانے کی چاہ دل میں پال لی تھی۔

تھی۔ آئے دن بیمار بھی رہتی تھی۔ اس کے جسم کا مدافعتی نظام نہایت کمزور تھا۔ کبھی پیٹ خراب تو کبھی گلا خراب..... برف کا پانی پی لیتی تو کئی، کئی دن کھوں، کھوں کرتی رہتی۔ ذرا موسم سرد ہوا نہیں کہ اس کی ناک بہنا شروع ہو جاتی۔ کسی روز معمول سے زیادہ پیدل چلنا پڑ جاتا تو ٹانگوں میں درد ہو جاتا۔ گھر کا کام کچھ زیادہ کر لیتی تو کمر کا درد ستانے لگتا..... تھی بھی ایسی دھان پان کہ کسی روز تیز ہوائیں چلنے لگتیں تو ابا مذاقاً کہتے۔ ''امینہ کو کسی پتھر کے ساتھ باندھ دو کہیں اڑ نہ جائے۔'' خرابیٔ صحت کے باعث آئے دن اسکول سے غیر حاضر رہتی۔ اماں اس سے گھر کا کام بھی بس واجبی سا کرواتی تھیں۔

امینہ کے برعکس انیسہ فٹ فاٹ تھی۔ پھرتیلی اور ذہین، لکڑ پتھر سب ہضم..... شاذ ہی بیمار پڑتی۔ پڑھائی میں تیز تھی، امتحانات کے نتائج میں اپنی جماعت میں عموماً پہلے ورنہ دوسرے نمبر پر رہتی۔ ہم جماعت ساتھیاں اس کی گرویدہ تھیں، استانیاں اس سے خوش رہتیں، اس کا دل پسند مشغلہ کہانیاں پڑھنا تھا، کبھی اسکول لائبریری سے کہانیوں کی کتاب مستعار لے آتی کبھی اسکول کی کسی ساتھی سے مانگ لاتی۔ کہانیاں پڑھنے کی چاٹ نے اس کے ذہن کو کہانیاں گھڑنے کی طرف مائل کر دیا تھا اور اردو کی ٹیچر کی وہ پسندیدہ شاگرد تھی۔ جب بھی ٹیچر کا پڑھانے کا موڈ نہ ہوتا اسے کھڑا کر دیتیں اور کہتیں۔ ''کلاس کو کوئی کہانی سناؤ.....'' امینہ کو بے شمار کہانیاں یاد تھیں جو اس نے بچوں کے رسائل میں پڑھ رکھی تھیں۔ وہ ایک کے بعد دوسری کہانی بیان کیے جاتی۔

ایک روز ٹیچر نے کہا۔ ''انیسہ آج تم بچوں کو کوئی سچی کہانی سناؤ.....''

''سچی کہانی!'' وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے بچوں کو ایک معذور فقیر کی کہانی سنائی جسے وہ اسکول آتے جاتے سڑک کے کنارے کھڑے بھیک مانگتے دیکھا کرتی تھی اور ایک روز وہ ایک گاڑی کے ڈرائیور سے بھیک لینے کے لیے گاڑی کے پیچھے لپکتے ہوئے پیچھے سے آنے والی دوسری گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔

''اب تم یہ کہانی مجھے لکھ کر دکھانا۔'' ٹیچر نے کہا۔ انیسہ نے کہانی لکھی اور ٹیچر کو دکھائی۔

''شاباش! تم تو بہت اچھی کہانیاں لکھ سکتی ہو..... لکھا کرو۔'' ٹیچر نے کہا۔ پھر ٹیچر نے اس کی لکھی ہوئی کہانی اسی سے کلاس میں پڑھوائی اور اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کی ہم جماعتوں سے تالیاں بجوائیں۔ ان تالیوں کی بازگشت نے ساری زندگی اس کا پیچھا کیا۔

امینہ کو ابا کی دلی خواہش سے چنداں دلچسپی نہیں تھی لیکن انیسہ نے ابا کی چاہ کا احترام کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ابا کتنی امید سے کہا کرتے تھے۔ ''میری بیٹیاں ہی میرے بیٹے بنیں گے۔'' چنانچہ جب ساتویں جماعت میں انیسہ کی اردو کی ٹیچر نے ''میں بڑی ہو کر کیا بنوں گی؟'' کے عنوان سے مضمون لکھنے کو دیا تو انیسہ نے لکھا۔

''میں بڑی ہو کر افسر بنوں گی۔ میرے ابا کہتے ہیں کہ افسر کی بڑی شان ہوتی ہے، ہماری کالونی میں بہت سے افسر رہتے ہیں، افسر بنگلوں میں رہتے ہیں، ان کے پاس اچھی، اچھی گاڑیاں ہوتی ہیں، ان کے بچے گاڑیوں میں اسکول جاتے ہیں۔ افسروں کے گھروں میں سارے کام نوکر کرتے ہیں، افسروں کی بیویاں خوب میک اپ کرتی ہیں، افسر کو دکان سے اپنا سامان خود نہیں اٹھانا پڑتا۔ دکاندار یا اس کا نوکر افسر کی گاڑی میں رکھتا ہے، میرے ابا کہتے ہیں کہ افسر بن کر آدمی اور اس کے گھر والے بہت عیش کرتے ہیں، ابا چاہتے ہیں میں بھی افسر بنوں اس لیے میں بڑی ہو کر افسر بنوں گی..... خود بھی عیش کروں گی اپنے اماں، ابا کو بھی خوب عیش کرواؤں گی۔ اماں کو کام نہیں کرنے دوں گی۔ نوکروں سے کرواؤں گی۔''

انیسہ نے جس طبقاتی تفاوت والے ماحول میں شعور سنبھالا تھا ابا کے احساسِ کمتری نے اس کے دل و دماغ میں اس تفاوت کو دو چند کر دیا تھا۔

''ہماری بھی کوئی زندگی ہے بھلا۔'' ابا حسرت

سے کہتے۔ ''زندگی تو افسروں کی ہوتی ہے..... شاندار اور پُروقار..... ایک پاؤں زمین پر دوسرا گاڑی میں۔''

''اللہ ایک، ایک قدم کا حساب لے گا ان سے۔'' اماں کہتیں۔

''ارے جب لے گا تب لے گا..... ابھی تو عیش کر رہے ہیں، ہم کلرکوں کو تو سوکھی تنخواہ ملتی ہے، افسروں کے ٹھاٹھ ہیں! یہ الاؤنس وہ الاؤنس۔'' ابا کا لہجہ دکھ، رشک اور احساسِ کمتری کے ملے جلے احساس میں ڈوبا ہوتا۔

''چوکیدار، چپڑاسی، جمعدار جس کو چاہتے ہیں دفتر سے اپنے گھر بھیج دیتے ہیں ذاتی کاموں کے لیے۔''

''ناجائز کا حساب دینا ہوگا۔'' اماں کہتیں۔

''نیک بخت.....! افسروں کے لیے کچھ ناجائز نہیں..... حرام، حلال، جائز، ناجائز یہ ہم چھوٹے لوگوں کے لیے ہے، افسروں کو حرام بھی حلال اور ناجائز بھی جائز..... اس ملک میں نظام یہی چل رہا ہے، زندگی تو بس افسروں ہی کی ہے۔ ہم تم تو بس زندگی گزار رہے ہیں یا یہ کہو کہ زندگی ہمیں گزار رہی ہے۔''

''رات کو نیند تو چین کی سوتے ہیں ہم..... ضمیر پر کوئی سل نہیں دھری ہوتی۔'' اماں کہتیں۔

''ضمیر مرحوم تو بارڈر پر ہی رہ گئے۔'' ابا ظرافت سے کہتے۔

''ابا افسر کو کتنی تنخواہ ملتی ہے۔'' ایک روز انیسہ نے ابا سے پوچھا۔

''ارے بیٹا تنخواہ تو جو ہوتی ہے سو ہوتی ہے دوسرے فائدے بہت ہوتے ہیں اور شان الگ..... افسر کی گاڑی دیکھتے ہی ماتحت اٹین شن ہو کر سیلوٹ مارنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

''ابا میں افسر بنوں گی۔''

''ان شاء اللہ.....'' ابا نے اسے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

ساتویں جماعت میں انیسہ کا لکھا وہ مضمون ٹیچر نے کلاس کی بچیوں کے روبرو اسے کھڑا کر کے اسی سے پڑھوایا۔ وہ کاپی اپنے چہرے کے بالکل نزدیک کر کے مضمون پڑھتی رہی۔ پڑھ چکی تو ٹیچر نے اسے اس کی جگہ پر بیٹھ جانے کی ہدایت کی پھر بھری جماعت پر ایک طائرانہ نظر دوڑا کر بولیں۔

''آپ بچیوں میں سے اکثر نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر یا انجینئر بننے کی بات کی ہے، چند نے ٹیچر بننے کی خواہش بھی ظاہر کی ہے۔ انیسہ واحد بچی ہے جس نے ہٹ کر مضمون لکھا اور افسر بننے کی خواہش کا اظہار کیا اس کا مضمون باقی بچیوں سے مختلف ہے اسی لیے میں نے پڑھوایا بھی ہے لیکن انیسہ.....'' اب ٹیچر کی مخاطب خصوصاً انیسہ ہی تھی۔ ''افسر صرف عیش کرنے کے لیے نہیں بنا جاتا..... افسر قوم کا خدمت گار ہوتا ہے، بہت اچھا ہوتا اگر تم یہ لکھتیں کہ تم ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لیے افسر بننا چاہتی ہو..... تم یہ لکھتیں کہ ایک ایماندار اور فرض شناس افسر بنو گی..... دیکھو انیسہ سارے افسر عیش کرنے کے لیے افسر نہیں بنتے، بے شمار ہیں جو ملک و قوم کی خدمت کرتے ہیں، ایمانداری اور فرض شناسی سے کام کرتے ہیں، ضرورت پڑے تو اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں، اچھے افسر کی یہی شان ہوتی ہے..... تمہارا مضمون اچھا ہے، املا کی ایک دو ہی غلطیاں ہیں مگر تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں.....؟''

''جی مس.....'' انیسہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ہم جماعت لڑکیاں دائیں بائیں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''اور ہاں..... نوکروں سے مفت میں یا زیادہ کام کروانا کوئی بہت بڑی اور شان کی بات نہیں..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تمام کام خود کیا کرتے تھے بلکہ اکثر گھر میں اپنی بیویوں کا گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا دیا کرتے تھے۔ ہمیں بھی اپنا کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے بلکہ کام کرنے سے تو آدمی چاق و چوبند رہتا ہے۔''

انیسہ اپنے لکھے پر ٹیچر کے تبصرے سے کچھ شرمندہ ہوئی مگر ٹیچر نے اس کی شرمندگی تاڑتے ہوئے

اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"لیکن اوور آل تمہارا مضمون اچھا ہے، اس میں نیا پن ہے، گڈ اللہ کرے تم ایک اچھی افسر بنو....."

"تھینک یو مس....." انیسہ نے کہا۔

☆☆☆

امینہ کو ابا کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اسے آئے دن اپنے امراضِ جسمانی ہی سے فرصت نہ تھی۔ اسکول سے اکثر چھٹی پر رہتی، تعطیلی کارکردگی بھی واجبی سی تھی۔ فیل تو نہ ہوتی پاس ہوجاتی مگر انیسہ کی طرح امتیازی حیثیت میں نہیں۔ میٹرک میں بی گریڈ لیا، ابا نے بڑی چاہ سے اسے کالج میں داخل کرایا مگر اول تو کالج بہت دور تھا دوسرے آتے جاتے بھری بسوں میں سفر کرنا امینہ کو نہ صرف تھکا دیتا بلکہ کالج سے گھر واپسی پر کافی دیر ادھ موئی ہوئی پڑی رہتی۔ کالج میں داخل ہوئے تیسرا چوتھا ہفتہ تھا کہ ایک روز کھچا کھچ بھری بس سے اترتے ہوئے پائدان سے گری تو دونوں گھٹنے چھل گئے۔ امینہ نے کالج جانے سے ہاتھ کھڑے کردیے تھے۔

"میں کالج نہیں جاؤں گی۔" اس نے اعلان کیا۔

"کیوں بھئی؟" اماں چونکیں۔

"مجھ سے اتنی دور نہیں جایا جاتا۔"

"کسی نزدیک کے کالج میں کرادیں تمہیں۔" ابا بولے۔

"نہیں ابا..... مجھ سے مشکل پڑھائی بھی نہیں ہوتی..... آسان سے آسان مضمون لے کر گھر بیٹھ کر پرائیویٹ پڑھ لوں گی۔"

"پرائیویٹ پڑھنے میں کالج والی بات نہیں ہوتی..... ریگولر پڑھ کر آدمی بہت کچھ سیکھتا ہے۔"

"مجھے نہیں سیکھنا ابا۔"

"سیکھو... گی نہیں تو افسروں کے برابر کیسے پہنچوں گی۔"

"مجھے نہیں پہنچنا افسروں کے برابر....." اس نے ابا کی امیدوں پر چھاجوں اوس گرادی۔

"ارے بیٹا میں تو کب سے تم دونوں بہنوں کو افسر بنانے کے خواب دیکھ رہا ہوں۔"

"انیسہ کو بنا دیجیے گا۔"

"اور تم.....؟"

"میں نے کہا ناں گھر بیٹھ کر پڑھوں گی۔"

"آدمی گھر سے باہر نکلے تو اسے شعور آتا ہے۔"

"ہے مجھے شعور....."

"کس بات کا.....؟"

"گھر کی صفائی ستھرائی، سلائی کڑھائی، کھانا پکانا اماں نے سب کچھ سکھا دیا ہے۔"

"ارے میری سادہ سی بٹیا میں ان کاموں کی بات نہیں کر رہا ہوں، گھر کی صفائی۔ ستھرائی، سلائی کڑھائی اور کھانا پکانا تو گھر بیٹھی اور گاؤں دیہاتوں میں رہنے والی ان پڑھ لڑکیاں بھی کر لیتی ہیں، میں تعلیم کی بات کر رہا ہوں۔ علم حاصل کرنے سے آدمی کی شخصیت نکھرتی ہے، شعور آتا ہے، اعتماد بڑھتا ہے۔" ابا دھیرے سے مسکرائے۔

"کچھ بھی ہو مجھ سے کالج نہیں جایا جاتا۔"

"نکمی، ہڈ حرام ہو تم۔" ابا کو یکا یک غصہ آگیا۔

"ارے زبردستی کاہے کو کرتے ہیں..... نہ پڑھے گی تو اپنا ہی نقصان کرے گی۔" ابا کا غصہ رفع کرنے کو اماں کو مداخلت کرنا پڑی۔

"زرینہ نقصان اسی کا نہیں ہوگا ہمیں بھی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ زمانہ بدل گیا ہے، کم پڑھی لکھی لڑکیوں کو رشتے بھی اچھے نہیں ملتے..... لڑکی یا تو اپنے باپ کی امارت کے بل بوتے پر اچھے گھر میں جاتی ہے یا اپنی تعلیم اور اچھی نوکری کے بل بوتے پر....." ابا نے اماں سے کہا۔

"اللہ مالک ہے، قسمت میں ہوگا تو مل جائے گا اچھا رشتہ بھی۔ تم نے وہ مثل نہیں سنی..... روپ کی روئے کرم کی کھائے۔"

"ارے کرم بنانے کے لیے تو دونوں بیٹیوں کو تعلیم یافتہ اور افسر بنانا چاہتا ہوں، میری خواہش ہے کہ دونوں اچھے گھروں میں بیاہی جائیں، ہماری طرح

دو کمروں کے مکانوں میں سسک، سسک کر زندگی نہ بسر کریں، آفیسرز بنگلوز میں رہیں۔"

"آفیسرز بنگلوز میں کیوں — ایک نہ ایک دن خالی کرنا پڑتا ہے — قسمت میں ہوا تو اپنے شوہروں کے ذاتی بنگلوں میں جائیں گی۔"

"ایسے کیسے زرینہ — ہمارے پاس ہے کیا — بس یہی ایک امید کہ یہ دونوں تعلیم حاصل کر کے اچھی جاب کریں گی — افسر بنیں گی اور اعلیٰ گھرانوں میں بیاہی جائیں گی — خاندانوں کی تاریخ ہمت، کوشش اور لگن سے بدلا کرتی ہے ورنہ کلرک کو کلرک یا اسٹینو داماد ہی ملتا ہے، لڑکیاں پڑھ لکھ کر اچھی ملازمتوں اور اونچے عہدوں پر لگیں تو انہیں اچھے رشتے ملتے ہیں۔" ابا دل گرفتہ ہو رہے تھے۔

"کاہے کو آپ اپنا دل چھوٹا کرتے ہیں — امینہ نہیں پڑھتی نہ سہی اس کی صحت ویسے بھی اجازت نہیں دیتی — کمزور اتنی کہ پھونک مارو تو اڑ جائے۔"

"پڑھے گی نہیں تو اور کمزور ہو جائے گی۔"

"عجیب بات —!" اماں نے ابا کو معترض نظروں سے دیکھا۔ "پڑھنے میں دماغ کھپانے سے انسان کمزور ہوتا ہے یا — ارے ہم نے تو جتنے پڑھا کو بچے دیکھے سینک سلائی ہی دیکھے۔"

"تعلیم سے انسان کی شخصیت مضبوط ہوتی ہے زرینہ۔"

"امینہ سے پڑھائی کا زیادہ بوجھ نہیں سہارا جاتا میاں —"

"اسے آئندہ زندگی میں زیادہ بوجھ اٹھانے سے بچانے کی خاطر ہی تو پڑھائی پر زور دے رہا ہوں — لڑکی کم پڑھی لکھی ہو، اپنے پیروں پر نہ کھڑی ہو تو شوہر اور سسرال والے اسے کولھو کا بیل سمجھ لیتے ہیں۔ بیچاری ساری زندگی باندی ہی بنی رہتی ہے، باورچی خانے سے نکل ہی نہیں پاتی — پڑھی لکھی ہو، اپنے پیروں پر کھڑی ہو تو شوہر اور سسرال والوں پر رعب رہتا ہے، شوہر بھی دب کر رہتا ہے، سسرال والے بھی قدر کرتے ہیں، عزت دیتے ہیں، لڑکی خود کفیل ہو تو شوہر کے دماغ میں یہ خناس نہیں سماتا کہ میری محتاج ہے کھونٹے سے بندھی ہے۔"

"امینہ کے ابا عورت اپنی کفالت کے لیے مرد کی محتاج ہو یا نہ ہو اپنے تحفظ کے لیے تو مرد کی محتاج ہوتی ہی ہوتی ہے۔"

"زرینہ عورت خود کفیل ہو تو مرد نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا محافظ بننے پر مجبور ہوتا ہے، میری گناہگار آنکھوں نے زندگی میں بعض نہایت خودسر اور بدتمیز مگر خود کفیل عورتیں ایسی بھی دیکھیں جن کے شوہر نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بدتمیزی اور خودسری کو صرف اس لیے برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ خود کفیل ہوتی ہیں۔"

"اللہ رحم کرے ایسے مردوں پر —" اماں بولیں۔

"میں خدانخواستہ یہ نہیں کہتا کہ ہماری بچیاں بھی پڑھ لکھ کر اور خود کفیل ہو کر خودسری اور بدتمیزی دکھائیں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ یہ پڑھیں، لکھیں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں اور مضبوط بنیں — ہم دونوں کب تک بیٹھے رہیں گے۔ ایک دن جانا ہے پھر انہیں اپنا اچھا برا خود ہی دیکھنا ہوگا۔"

"برا — اللہ نہ کرے —" اماں بول کر بولیں۔

ابا کی کوئی توجیہہ اور اماں کا سمجھانا بجھانا بھی امینہ کو دوبارہ کالج جانے پر مجبور نہ کر سکا۔ ابا کو امینہ کی طرف سے نہایت مایوسی ہوئی۔ ان کی واحد امید اب انیسہ تھی۔

امینہ نے میٹرک کے بعد پرائیویٹ بھی نہیں پڑھا۔

☆☆☆

انیسہ ابا کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بس ایک مسئلہ تھا، بظاہر غیر اہم دوسروں کے لیے معمولی مگر خود انیسہ کے لیے گویا بقائے ذات کا مسئلہ —

"نہیں، نہیں — کہانیاں وہانیاں لکھنا فضول کام ہے — پڑھائی کرو بس —" ابا نے تو کافی پہلے نہایت سختی سے کہہ دیا تھا۔

پڑھنے سے اسے انکار نہیں تھا — بہت اچھا پڑھتی تھی وہ — اس کی ٹیچرز اس سے خوش اور ہم جماعت لڑکیاں مرعوب رہا کرتی تھیں اس سے لیکن — کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق وہ نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اسکول

لائبریری سے مستعار لے کر ہم مکتب لڑکیوں سے مانگ تانگ کر، کبھی کبھار خرید کر بھی وہ کہانیاں پڑھنے کا شوق پورا کر لیتی۔ یہ پڑھی ہوئی کہانیاں اس کے دل و دماغ میں حشر برپا کر دیتیں..... ایک کہانی کے کردار دوسری کہانیوں کے کرداروں سے گڈ مڈ ہو کر اس کے ذہن میں نئی کہانیوں میں ڈھلنے لگتے..... اپنی رف نوٹ بک لے کر وہ کہانی لکھنے بیٹھ جاتی۔

''کیا لکھ رہی ہو انیسہ.....؟'' امینہ اس کے مشکوک انداز کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتی۔

''کچھ نہیں.....''

امینہ اس کی نوٹ بک میں جھانکتی..... انیسہ چھپا لیتی..... لکھنے کے بعد اپنی نوٹ بک ایسی راز داری سے چھپاتی کہ امینہ لاکھ ڈھونڈنے پر نہ ڈھونڈ پاتی۔ اور ابا انہیں تو وہ اس نوٹ بک کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی۔ البتہ اسکول میں وقفے کے دوران اپنی لکھی کہانیاں وہ اپنی ساتھیوں کو خود پڑھ کر سناتی۔ امینہ ان دنوں اسکول ہی میں ہوتی تھی اس سے دو جماعتیں آگے..... امینہ کو انیسہ کی جماعت کی لڑکیوں نے بتایا کہ وہ وقفے میں اپنی لکھی کہانیاں لڑکیوں کو پڑھ کر سناتی ہے، امینہ نے یہ خبر اماں کو جا لگائی۔ اور ایک روز جب انیسہ سوئی ہوئی تھی امینہ نے کہانیوں والی رف نوٹ بک ڈھونڈ نکالی اور ایک ہی نشست میں انیسہ کی لکھی ساری کہانیاں پڑھ ڈالیں۔ اماں نے ابا کو بتایا۔ ابا نے اس کی حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی کی۔ انیسہ شرمندہ بھی ہوئی دکھی بھی..... شرمندہ اس بات پر کہ اسکول میں اپنی ساتھیوں کے سوا وہ تو اپنی کہانیوں والی نوٹ بک کو چھپا کر رکھتی تھی، امینہ کی بچی نے راز فاش کر دیا تھا اور دکھی وہ اس بات سے ہوئی کہ ابا نے اس کی حوصلہ افزائی کے بجائے کہانی لکھنے کو فضول اور بیکار قرار دیا تھا۔ اسے پڑھنے سے انکار تھوڑی تھا۔ امینہ کی طرح بس پاس ہو کر نہ دکھاتی تھی ہمیشہ امتیازی حیثیت میں کامیاب ہوتی تھی۔ کہانیاں پڑھنا اور لکھنا اس کا

سچ تو یہ تھا کہ اس شوق نے تعلیم میں اس کی صلاحیت اظہار کو دو چند کر دیا تھا۔ اردو کی ٹیچر کی وہ پسندیدہ شاگرد اسی لیے تو تھی۔

ابا کو اس نے اپنے نتائج سے کبھی مایوس نہیں کیا اور ان سے چھپ کر کہانیاں لکھنے کا شوق بھی پورا کرتی رہی۔ اس کے اس شوق سے ابا کا بھلا کیا نقصان تھا۔ انہیں تو وہ تعلیم میں اچھی کارکردگی دکھا رہی تھی بلکہ ابا کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا عزم بھی رکھتی تھی۔

''ابا میں بنوں گی افسر.....'' جب امینہ نے ابا کو ہری جھنڈی دکھا دی تو اس نے کہا۔

''شاباش.....!'' ابا خوش ہو کر بولے۔

☆☆☆

دسویں جماعت میں انیسہ کی اردو کی ٹیچر نے نصاب میں شامل اعلیٰ پائے کے ایک اردو افسانہ نگار کا افسانہ پڑھانے کے بعد بچیوں کو ایک دلچسپ آزمائش میں ڈال دیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ افسانے کے مصنف کے تحریر کردہ انجام سے ہٹ کر اس افسانے کا انجام لکھیں۔ لڑکیاں سوچ بچار میں پڑ گئیں اور ہر ایک نے اپنی، اپنی سمجھ کے مطابق انجام تحریر کیا۔ انیسہ کا تحریر کردہ انجام اتنا منفرد تھا کہ ٹیچر نے اس کی نوٹ بک میں لکھا۔

''بہت عمدہ..... مسلسل توجہ اور لگن سے آپ ایک اچھی افسانہ نگار بن سکتی ہیں۔'' اگلے تین چار دن انیسہ کی کاپی دسویں جماعت کے تمام فریقوں میں گردش کرتی رہی۔

دسویں جماعت کے سالانہ امتحانات سے فراغت پاتے ہی انیسہ نے اپنے دل پسند مشغلے پر طبع آزمائی شروع کر دی..... ایک کے بعد دوسری کہانی پھر ایک ناول بھی شروع ہو گیا جس کا موضوع ایک غریب لڑکی اور امیر نوجوان کی محبت تھی۔ انیسہ جس کاپی میں یہ ناول لکھ رہی تھی اسے بہت چھپا، چھپا کر رکھتی مگر ایک روز اس کی یہ کاپی جانے کیسے ابا کے ہاتھ لگ گئی انہوں نے الٹ پلٹ کر چند صفحات دیکھے چند سطریں پڑھیں اور آگ بگولہ ہو کر اسے پکارا۔

''جی ابا.....'' وہ ابا کی پکار پر لپکی ہوئی پہنچی اور ان کے ہاتھ میں اپنی قیمتی متاع دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''یہ کیا ہے؟'' ابا نے نوٹ بک کو زور سے جھٹکا۔

''کچھ نہیں ابا.....'' وہ دبک کر بولی۔

''زرینہ.....!'' ابا چلائے۔

اماں بھی حیران پریشان آ پہنچیں۔

''آنکھیں بند کر کے رہتی ہو کیا گھر میں.....'' ابا سخت چراغ پا تھے۔

''کیا ہوا.....؟'' اماں نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

ابا نے نوٹ بک کھولی اور پڑھنا شروع کیا۔

''سہیل! کیا ایک غریب لڑکی کو محبت کرنے کا حق نہیں..... میں تم سے پیار کرتی ہوں..... سچا پیار، پلیز مجھے اس لیے مت ٹھکراؤ کہ میں ایک غریب آدمی کی بیٹی ہوں..... اگر تم نے میری محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تو میں زہر کھا کر اپنی جان دے دوں گی۔''

اماں ہکا بکا کھڑی تھیں۔

''سن لیا.....'' ابا نے اماں کو گھورا۔

اماں سہم گئیں۔

ابا نے کھڑے، کھڑے نوٹ بک کے پرخچے کیے اور پیروں تلے کچل دیا۔

''واہیات.....! خرافات!'' ابا نے انیسہ کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورا۔ ''اس لیے نہیں پڑھا رہا ہوں تمہیں کہ تم اس قسم کی بے ہودہ باتوں سے اپنا قلم آلودہ کرو.....''

''سوری ابا.....'' انیسہ نے آہستہ سے کہا۔

''آئندہ نہ دیکھوں میں تمہیں ان فضولیات میں..... سمجھ رہی ہو ناں.....'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اٹھاؤ یہ کچرا اور اسے کچرے دان میں ڈالو.....'' اس کی نوٹ بک کے جن پرخچوں کو ابا کچرا کہہ رہے تھے وہ اس نے کتنی چاہت سے رقم کیے تھے وہی جانتی تھی۔

میٹرک میں اس نے اے ون گریڈ میں کامیابی حاصل کی، کالج میں میرٹ پر داخلہ ہوا۔ انٹرمیڈیٹ میں ستاسی فی صد نمبر لیے..... یونیورسٹی ہر سمسٹر میں جی پی اے شاندار..... ابا خوش ہو کر نہایت فخر سے اپنے دفتر کے ساتھیوں کو اس کی ہر کامیابی کا بتاتے، ابا کے ایک سینئر ایک روز بولے۔

''احتشام صاحب دفتر میں جگہیں تو نکلتی ہی رہتی ہیں، بیٹی کا آخری سمسٹر شروع ہوتے ہی اسسٹنٹ کے لیے درخواست جمع کرا دیجیے گا۔ ہماری نہ سہی کسی دوسری برانچ میں لگ جائے گی۔''

''جناب! میری بیٹی اسسٹنٹ نہیں لگے گی۔'' ابا بولے۔

''تو پھر.....؟''

''اسے ان شاء اللہ افسر بننا ہے..... اور ضروری نہیں کہ اسی محکمے میں لائق بچوں کے لیے تو سو دروازے کھلے ہوتے ہیں۔''

یونیورسٹی میں انیسہ کا آخری سمسٹر شروع ہوتے ہی ابا نے اخبارات میں انیسہ کے لیے ملازمت کے مواقع دیکھنے اور درخواستیں داغنے کا سلسلہ شروع کر دیا..... انیسہ کا دل تو اپنے ہم جماعت اسامہ کی طرف راغب ہو چکا تھا۔

اسامہ لوئر مڈل کلاس گھرانے کا نوجوان تھا اور ایک بڑے کنبے کا فرد..... بوڑھے دادا، باپ، ماں، چھ بہنیں اور اسامہ سمیت تین بھائی..... اسامہ اپنے بہن، بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ کنبے کی کفالت میں والد کا ہاتھ بٹانے اور اپنے تعلیمی مصارف پورے کرنے کے لیے وہ یونیورسٹی سے چھٹی کے بعد ایک معروف فاسٹ فوڈ کی آؤٹ لیٹ پر ملازمت کرتا تھا، وہاں سے فراغت کے بعد وہ رات کو نو سے بارہ بجے تک ایک اسنیک بار کی فرنٹ ڈیسک پر ہوتا۔ وہ دو جگہوں پر ملازمت کے باوجود اس کا بی پی اے ہمیشہ عمدہ ہوتا۔ وہ اپنی عمر کے عام نوجوانوں سے بہت مختلف اور منفرد تھا، سنجیدہ، باوقار، ذمے دار اور دوسروں کا بہت خیال رکھنے والا۔ پڑھائی میں کمزور ساتھیوں کو وہ فارغ وقت میں اس دلجمعی سے پڑھاتا جیسے اس میں اس کا اپنا ہی فائدہ ہو..... پڑھائی کے اعتبار سے جماعت کے طلبا میں وہ اور طالبات میں

ایسہ تقریباً ایک ہی سطح پر تھے۔ دونوں میں خوب مقابلہ رہتا۔ کبھی وہ چند نمبروں سے آگے تو کبھی ایسہ اس پر سبقت لے جاتی۔ تعلیمی میدان میں ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہوئے بھی وہ دھیرے، دھیرے ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے گئے۔

''میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا ایسہ.....'' آخری سمسٹر میں اس نے ایسہ سے کہا تھا۔

''میں بھی اسامہ.....'' اس نے دھیرے سے اعتراف کیا۔

''شادی تو خیر ابھی نہیں..... مجھے اسٹیبلش ہونا ہے، مناسب جاب پھر..... بہنوں کی شادی..... انتظار کرلوگی؟''

''تمام زندگی.....''

''تھینک یو.....!'' اس نے تشکر سے ایسہ کو دیکھا۔ ''تمہارے حقوق اپنے نام محفوظ کرانے کے لیے امی، ابو کو بھیجوں تمہارے گھر.....؟''

''بھیج دو.....''

''لیکن ایسے کیسے..... امی، ابو بغیر کسی تعارف اور تمہید کے تو نہیں جا پہنچیں گے تمہارے گھر..... پہلے تمہارے گھر والوں سے کوئی ذکر تو ہونا چاہیے۔''

''ہاں یہ تو ہے.....'' ایسہ نے تائید کی۔

''تم بات چھیڑو.....''

''میں.....'' ایسہ اچھلی۔ ''نہ بابا.....''

''تو پھر.....؟''

''تم خود بات کرلو ناں.....''

''کس سے.....؟''

''ابا سے.....''

''میں کرسکتا ہوں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ میرے گھر والے بات کریں..... تمہاری بڑی بہن تو ہیں ناں، ان کی مدد لو.....''

''ہاں ان سے کرسکتی ہوں بات.....'' ایسہ نے امینہ سے بات کی۔ امینہ نے اماں کو اور اماں نے ابا کو بتایا۔

''ابھی تعلیم مکمل ہوئی نہیں، شادی کا ذکر کہاں سے آگیا۔'' ابا بولے۔

''میاں شادی تو کرنی ہے ناں بیٹیوں کی..... جس کا رشتہ پہلے آجائے۔'' اماں نے کہا۔

''کون ہے.....؟ کس خاندان کا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ باپ کیا کرتا ہے؟'' ابا نے ایک ساتھ کئی سوال کیے۔

''ایسہ کے ساتھ پڑھتا ہے، ہمارے ہی جیسے سفید پوش خاندان کا ہے، کرایے کے مکان میں رہتا ہے، باپ کسی مدرسے میں دینی تعلیم دیتے ہیں بچوں کو.....''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں انہیں رشتہ دوں.....'' ابا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''لڑکا اچھا ہے لائق ہے، آگے بڑھے گا، ترقی کرے گا۔'' اماں بولیں۔

''تم سے کس نے کہا۔''

''ایسہ بتا رہی تھی۔''

''ایسہ.....!'' ابا نے جلال سے پکارا۔

''جی ابا.....'' ایسہ سر پر دوپٹا لیتی ابا کے حضور آ کھڑی ہوئی۔

''دیکھو.....'' ابا نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت فیصلہ کن انداز میں کھڑی کی۔ ''میں بیوقوف نہیں ہوں، کہانی کی تہ تک پہنچ گیا ہوں، میں نے تمہیں یونیورسٹی میں بھاری فیسیں دے کر اس لیے نہیں پڑھایا کہ تم وہاں سے اپنے لیے رشتہ لے کر آؤ اور وہ بھی ایسا جسے میں گھاس ڈالنا پسند نہ کروں..... سمجھیں تم.....!''

بات کھل گئی تھی اب بات کیے بنا چارہ نہ تھا۔

''ابا..... وہ..... وہ..... ہمارے بیچ کا سب سے لائق اسٹوڈنٹ ہے۔'' وہ دبی زبان سے بولی۔

''تو.....؟''

''وہ سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہے ابا..... کامیاب ہوجائے گا۔'' ایسہ پہلے سے زیادہ اعتماد سے بولی۔

''خاندان.....! مدرسے میں پڑھانے والے مدرس کے بیٹے سے رشتہ کردوں تمہارا!''

''مدرسے میں پڑھانا کوئی عیب تو نہیں ابا۔''

’’سن رہی ہو......‘‘ ابا نے اماں کو جتایا۔ ’’یہ سیکھا ہے تمہاری صاحبزادی نے یونیورسٹی جا کر۔‘‘

’’ابا، وہ...... وہ بہت ڈیسنٹ ہے۔‘‘

’’بکواس نہیں سننا چاہتا...... جہاں رہتا ہے وہاں گئی ہو کبھی...... لوئر مڈل اور مڈل کلاسیوں کی آبادی......‘‘

’’ابا ہم کون سے اپر کلاسیے ہیں۔‘‘ انیسہ بتدریج حوصلہ پارہی تھی۔

’’زیادہ زبان مت چلاؤ مجھ سے...... سمجھیں!‘‘

’’ابا پلیز......!‘‘ وہ گڑگڑائی۔ ’’وہ اسٹیبلش ہونے کے بعد شادی کرے گا۔‘‘

’’دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے...... بے شرم۔‘‘

بات کھل گئی تھی۔ اب انیسہ کو نہ خوف تھا نہ شرم...... اس نے رو، رو کر آنکھیں سجالیں۔ امینہ اسے دیکھ، دیکھ کر پریشان ہوتی رہی۔

’’تمہارے ابا نہیں مانیں گے۔‘‘ اماں نے کہا۔

’’کیوں نہیں مانیں گے...... کیا برائی ہے اس میں......‘‘ وہ بپھر گئی۔

’’وہ افسر گھرانوں میں دینا چاہتے ہیں بیٹیاں......‘‘

’’اماں! میری تو آپ بات ہی نہ کریں۔ معمولی صورت شکل، معمولی تعلیم کون بیوقوف افسر کرے گا مجھ سے شادی......‘‘ بہت رونے سے بہن کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر امینہ کو بھی تاؤ آ گیا۔

’’یہ تم اپنے ابا کو سمجھاؤ......‘‘

’’میرے ساتھ کی سب لڑکیوں کی شادی بھی ہو چکی...... بچے بھی ہو گئے۔ ابا چراغ لیے ابھی ڈھونڈ ہی رہے ہیں...... نہیں کروں گی میں اب شادی......‘‘

امینہ کو بھی جس کے لیے کئی رشتے ابا کی بے جا خواہش کی بھینٹ چڑھ کر مسترد ہو چکے تھے۔ انیسہ کی حمایت کی آڑ میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع ملا۔

’’نہیں کروں گی میں شادی......‘‘ اب کی بار اس نے زیادہ شدومد سے کہا۔

’’آپ سمجھائیں ناں ابا کو......‘‘ انیسہ نے اماں

’’سمجھیں گے وہ......! انہیں تو برسوں سے احساسِ کمتری نے مار رکھا ہے...... پڑوس میں کسی سے میل جول نہیں رکھتے، افسروں سے ربط ضبط بڑھانے کے لیے ندیدگی دکھاتے ہیں، بچھ بچھ جاتے ہیں۔‘‘

’’ہم ابا کے احساسِ کمتری کا نشانہ کیوں بنیں......‘‘ انیسہ بھیگی آنکھوں سے اماں کو دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

’’بغاوت کر سکتی ہو......‘‘ اماں نے انیسہ کو دیکھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’’تو چپ ہو جاؤ...... رونے دھونے سے وہ نہیں پسیجیں گے۔‘‘

’’میں مر جاؤں گی اماں......‘‘

’’تمہارے ابا کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔‘‘

’’آپ تو میرا ساتھ دیں۔‘‘

’’کیا فرق پڑے گا۔‘‘

’’ہو سکتا ہے ابا پسیج جائیں...... ویسے بھی اسامہ فی الحال صرف بات چیت پکی کروانا چاہتا ہے۔ شادی دو تین سال سے پہلے نہیں کرے گا۔‘‘

اماں نے دبی زبان سے یہ بات ابا کے گوش گزار کی، ابا نے سختی سے جھڑک دیا۔

’’خبردار۔ جواب کسی نے مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات کی۔ مدرسے میں پڑھانے والے کسی مولوی کے بیٹے کو اپنی بیٹی دینا ہوتی تو مجھے اسے اتنا پڑھانے لکھانے کی کیا ضرورت تھی۔‘‘

’’لڑکا تو مولوی نہیں...... افسری کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا ہے۔ ابھی صرف رشتہ پکا کرنا چاہتا ہے، شادی کو دیر ہے۔‘‘

’’پہلے بھی سن چکا ہوں یہ۔‘‘

’’بلا کر مل لینے میں کیا حرج ہے؟‘‘

’’کہہ جو دیا نہیں......‘‘

’’خواہ مخواہ کی ضد باندھ لی ہے آپ نے۔‘‘

’’جاؤ تو خود کرلو بیٹی کا رشتہ پکا۔‘‘

''تو خواہ مخواہ کی بحث نہ کرو۔''

اماں چپ ہو رہیں۔

''ابا نہیں مانے.....'' انیسہ نے نہایت دل گرفتگی سے اسامہ کو بتایا۔

''کیوں؟'' اس نے چونک کر انیسہ کی طرف دیکھا۔

انیسہ کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔

''کیوں نہیں مانے انیسہ.....؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''ابا کمپلیکس کا شکار ہیں.....'' انیسہ کو بتانا پڑا۔

''کس قسم کا کمپلیکس.....؟''

''ساری زندگی کلرک رہے ہیں، کالونی جہاں ہم رہتے ہیں طبقات میں بٹی ہوئی ہے۔ ابا نے افسروں کو ہمیشہ نہ صرف رشک سے دیکھا بلکہ ان کے مقابلے میں خود کو کمتر بھی محسوس کرتے رہے۔ ابا کا خواب تھا کہ ہم دونوں بہنیں افسر بنیں اور افسروں سے ہی ہماری شادی بھی ہو، آپا نے جلدی ہاتھ کھڑے دیے مگر میں ابا کی خواہش کے احترام میں پوری لگن سے پڑھتی اور اچھے نتائج دیتی رہی۔ ابا کسی افسر سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''ہاں تو میں تیاری کر رہا ہوں ناں سی ایس ایس کی۔''

انیسہ اسے یہ بتانے سے قاصر رہی کہ ابا کو اس کے والد کے مدرس ہونے پر بھی اعتراض تھا۔

''ابا نہیں مانیں گے اسامہ.....'' اس نے کہا۔

''پھر.....؟''

''مجھے ان کی مرضی کا پابند رہنا ہوگا۔''

وہ چپ رہا۔

''سوری اسامہ.....'' انیسہ دھیرے سے بولی۔

وہ اس کے پاس سے یوں اٹھا جیسے بازی ہار گیا ہو۔

ڈپارٹمنٹ کے باہر داخلہ گاہ کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی انیسہ نے اسے شکستہ قدموں سے جاتے دیکھا۔

سمسٹر کے اختتام تک اسامہ نے پھر کبھی اس سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی اپنے رویے سے ہم جماعت ساتھیوں پر یہ ظاہر ہونے دیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔ انیسہ نے بھی اپنے دل پر پردہ تان لیا تھا۔ کسی کو بتانے سے فائدہ تھا نہ ہی نہ بتانے سے..... اماں کہا کرتی تھیں لوگ رو کر سنتے ہیں، ہنس کر اڑاتے ہیں، ان دنوں انیسہ نے ساحر کی خوب صورت اور سدا بہار نظم ''خوب صورت موڑ.....'' اپنی ڈائری میں لکھ کر اتنی مرتبہ پڑھی کہ اسے ازبر ہو گئی۔

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے
نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے
تمہیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
مرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمہارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں
تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

اگرچہ اس دلکش نظم کے ایک دو اشعار حسب حال نہ تھے مگر باقی تو جیسے اسامہ اور اسی کی کتھا تھے..... یہ نظم اسے اپنے دل کے آس پاس محسوس ہوئی۔

وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

بہت پہلے ابا کی خاطر اس نے اپنی پہلی محبت کی قربانی دی تھی۔ ابا کی خواہش پر اس نے کہانیاں لکھنا ترک کر دیا تھا۔ جبکہ وہ اسے اپنی بقائے ذات کا مسئلہ لگتا تھا۔ جب ابا نے اس کے ادھورے رومانی ناول کے پرخچے کر کے اپنے پیروں تلے روند دیے تھے تب بھی اس کا دل بہت پھڑ پھڑایا تھا اور اب.....! یہ دوسری محبت..... ابا نے نہایت بے رحمی سے اس کی اس دوسری محبت کو بھی اپنی خواہش کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

ابا اپنی خواہش کے اسیر تھے، احساسِ کمتری سے دوچار..... انہیں دوسروں کے جذبات اور احساسات کی چنداں پروا نہ تھی۔ وہ اپنی اولاد کے جذبات سے بھی کسی بازی گر کی طرح کھیلنا چاہتے تھے۔ ایسہ کا دل کہتا تھا اسامہ جیسا انمول رتن زندگی میں پھر کبھی اس کے ہاتھ نہیں آئے گا مگر ابا کے جبر نے اسے اپنی اس دوسری اور انمول محبت سے بھی محروم ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بہت اداس تھی۔ اسامہ کو دیکھتی تو اس کا دل ان کہے درد سے دوچار ہو جاتا، اس سے۔ ہم کلام ہوتی تو الفاظ آنسوؤں میں ڈھلنے لگتے۔

''ابا بہت ظالم ہیں۔'' اسے مسلسل اداس دیکھ کر ایک روز امینہ نے اس سے کہا۔

ایسہ اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا.....؟'' امینہ اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتے پا کر چونکی۔

''ظالم مت کہو انہیں..... وہ آمر ہیں..... جسے اپنے سوا کسی کی پروا نہیں ہوتی..... اسے بس اپنی ذات اہم لگتی ہے باقی سب ہیچ..... اپنی انا کی تسکین کے لیے وہ دوسروں کو بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم۔''

امینہ خود بھی تو زخم خوردہ تھی۔ اس کی شادی کی عمر نکلی جا رہی تھی اور ابا کو اس کے لیے کوئی رشتہ پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔ محکمے کی کالونی میں دو کمروں کے ایک مکان میں مقیم کلرک کی میٹرک پاس بیٹی کے لیے بھلا کس قسم کے رشتے آ سکتے تھے۔ مگر ابا نے حقیقت سے نظریں چرا رکھی تھیں۔ اماں ان کے رویے سے عاجز ہو کر ان کی پیٹھ پیچھے کہتیں۔

''دو بیٹیاں ہیں اس لیے آنکھیں ماتھے پر چڑھا رکھی ہیں..... ہوتیں چھ سات بیٹیاں تو پھر میں پوچھتی کہ کتنے رشتے ٹھکراؤ گے۔'' ایسہ کی تو قسمت بھلی تھی جو اسامہ جیسا ہونہار لڑکا اس سے شادی کا طلبگار ہو گیا تھا ورنہ نئے زمانہ تو ایسے لڑکے اور ان کے گھر والے بھی فل بیچ جاتے ہیں..... لڑکی حسین ہو، ملازمت کرتی ہو، باپ، بھائی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں..... خاندان اونچا ہو، لڑکی جہیز میں کوٹھی، کار، بینک، بیلنس لے کر آئے۔ چچا، تایا، ماموں، پھوپھا اور خالو تک کے مناصب پوچھے جاتے ہیں مگر افسوس کہ ابا نے ایسا اچھا رشتہ بھی قابلِ اعتنا نہ گردانا تھا۔

یونیورسٹی میں اپنے آخری سمسٹر کے اختتام پر ایسہ نے بھیگی پلکوں اور پھڑپھڑاتے لبوں سے اسامہ کو خدا حافظ کہا تھا۔

''میں تمہارے والد سے ملوں..... شاید وہ مان جائیں۔'' اسامہ نے کہا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں..... میں جانتی ہوں وہ نہیں مانیں گے۔''

''تمہارے بغیر جینا بہت دشوار ہو گا ایسہ.....''

''جینا تو پڑے گا۔''

''تمہارا خیال ساری زندگی میرے ساتھ رہے گا۔''

''بھلانا میرے لیے بھی آسان نہ ہو گا۔'' وہ فقط

اداس جنوری

جنوری کی کہر آلود فضا میں
دھند آلود شام کی ہوائیں
تیرا نام میری
سرد سانسوں میں تمازت گھولتا ہے
تیرا تصور میری ساعتوں میں بولتا ہے
سرد ٹھٹھرتی
جنوری کی شاموں میں
تیرا انتظار اور اس دل کی حکایتیں
جو بھی ہم سے ہیں شکایتیں
آ کر رو برو کر لو

از: فصیحہ آصف خان، ملتان

اتنا ہی کہہ سکی۔

''کیا ہم پھر کبھی مل سکتے ہیں؟''

امینہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیوں.....؟'' وہ بولا۔

''کیونکہ میں بہت کمزور ہوں اسامہ..... بغاوت کے لیے جرأت پیدا کرنی پڑتی ہے جو میں نہیں کر سکتی..... میں تو چپ چاپ اپنی شکست تسلیم کر لینے والوں میں سے ہوں.....''

اسامہ کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس نے بوجھل آواز میں کہا۔

''اوکے..... خدا حافظ.....''

''خدا حافظ.....'' امینہ کا دل پھٹ پڑنے کو تھا۔

اس روز یونیورسٹی سے گھر آ کر وہ پھوٹ، پھوٹ کر روئی۔ امینہ اسے تسلی دیتی رہی۔ چمکارتی رہی۔ اماں تصویرِ حسرت بنی اسے بلکتا دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

امینہ کے دل پر لگنے والی چوٹ نے اس کی پہلی خوابیدہ محبت کو جسے اس نے ابا کے حکم کی تعمیل میں زبردستی تھپک، تھپک کر سلا دیا تھا۔ از سرِ نو بیدار کرنے میں مہمیز کیا۔ اس نے قلمکاری شروع کر دی۔ اب اسے امینہ سے بھی رازداری کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور امینہ بھی پہلے کی طرح اس کی نگارشات کی ٹوہ میں نہ رہتی۔ ابا اس کے لیے ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے دفتر میں ملازمت کی درخواستیں داغنے پر لگے ہوئے تھے۔ خود اسے ملازمت ملنے یا نہ ملنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مل گئی تو ابا کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا راستہ کھل جاتا تھا، نہ ملی تو دنیا کا نظام ساکت نہ ہو جاتا تھا۔ زندگی تو بڑے سے بڑے حادثے کے بعد بھی اپنی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ آخر اسامہ سے بچھڑنے کے بعد بھی تو زندگی کا سفر جاری تھا کہ نہیں.....

اسامہ اس کی کتابِ زندگی کا ایک درد آگیں باب بن کر رہ گیا تھا۔ دل ایک لمحے کو اس درد سے چھٹکارا نہ پاتا۔ آنکھیں دن میں نہ جانے کتنی مرتبہ بھیگتیں، سانسوں کی لے دھیمی پڑ جاتی۔ اسامہ کا خیال اسے کہیں سے کہیں لے جاتا۔ خود دار وہ بھی تھا محتاط امینہ بھی..... دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خواہ مخواہ رابطہ رکھنے سے دل کو اور زیادہ آزار میں مبتلا کر دینے کے سوا فائدہ بھی کیا تھا۔

امینہ نے اپنی ایک تحریر مقامی جریدے کو بغرضِ اشاعت بھجوا دی۔ تحریر شائع ہو گئی اور اسے قارئین کی طرف سے پزیرائی بھی ملی۔ ایڈیٹر نے فون کیا۔

''بی بی! آپ ہمارے پرچے کے لیے لکھیے..... ہم اپنے مستقل قلمی معاونین کو معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں۔''

امینہ نے دوسری کہانی ارسال کر دی۔ تعریف و توصیف کے علاوہ بذریعہ منی آرڈر اعزازیہ بھی آ گیا۔ پہلی کہانی کی اشاعت ابا سے راز رکھی گئی تھی اب انہیں بتانا ضروری ٹھہرا۔

''لکھو بیٹا، مستقل لکھو..... قلم میں بڑی طاقت ہے..... شہرت ملتی ہے، پیسہ ملتا ہے۔''

امینہ کو ابا کی منافقت پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی..... اسے ابا کے قدموں تلے کچلے اپنی تخلیق کے پرخچے بھی یاد آئے اور ان کے الفاظ بھی واہیات..... بکواس..... فضول..... ابا اس کے شوق کو کتنی حقارت اور ناگواری سے صلواتیں سناتے تھے..... اور اب.....!

شاید اسی طرح کبھی ابا کو اسامہ کی اہمیت اور وقعت کا احساس بھی ہو جائے۔ مگر تب تک کون جانے ان دونوں میں سے کون کس مقام پر ہو! اپنی جگہ پر بھی ہو کہ نہیں..... بھلا دینے کے لیے کسی کے ذی ہوش ہونے اور گم ہو جانے کے لیے دنیا کی وسعت کا کیا اعتبار.....

ابا کی منافقت عریاں کیا ہوئی امینہ کا ذہن رسا تو بگٹٹ دوڑنے لگا۔ افسری میں کیا شہرت اور توقیر ملتی تھی جو امینہ کو قلمکاری میں ملی۔ کیا دوست کیا احباب، کیا خاندان، کیا ابا کا دفتر، امینہ کی ہر طرف واہ، واہ ہونے لگی۔

''احتشام صاحب! اس ماہ کے پرچے میں تو آپ کی صاحبزادی نے ایسی شاندار کہانی دی ہے کہ پڑھ کر دل باغ، باغ ہو گیا۔'' ابا کے دفتر کے ساتھیوں

میں سے کوئی کہتا۔

"بھئی واہ انیسہ بہت زبردست افسانہ لکھا ہے تم نے....." رشتے داروں میں سے کسی کی طرف سے ستائش ملتی۔

"انیسہ اتنی عمدہ کہانیاں کیسے لکھ لیتی ہو بیٹا؟" خاندان کے کوئی بزرگ کہتے۔

"اسے بچپن ہی سے شوق تھا۔" ابا سینہ پھلا کر کہتے۔

انیسہ کو ابا کے قدموں تلے بکھرے اپنے پہلے نامکمل ناول کے پرخچے یاد آنے لگتے۔

قارئین کی پسندیدگی ملی تو ایک کے بعد دوسرے پرچے کی جانب سے لکھنے کی دعوت ملتی چلی گئی۔ دو کمروں کے پرانے مکان کے دروازے پر معروف جرائد کے مدیران معاون دستک دینے لگے۔

"انیسہ بی بی! ہمارے پرچے کے لیے بھی اپنی کوئی تحریر عنایت فرمائیں۔"

"کوشش کروں گی۔" وہ ہر ایک سے وعدہ تو نہ کرتی البتہ مروت کا مظاہرہ کرتی۔ انیسہ کی ناموری کالونی کے افسر گھرانوں تک بھی جا پہنچی۔

"ارے بھئی وہ جو انیسہ احتشام الدین ہے، وہ ہماری ہی کالونی میں تو رہتی ہے۔" افسر گھرانوں کی خواتین ایک دوسرے کو بتاتیں۔

"احتشام صاحب سنا ہے آپ کی بیٹی رائٹر ہے۔" افسران ابا سے کہتے۔

"جی سر!" ابا نیازمندی ظاہر کرتے۔

"کہیں جاب وغیرہ کرتی ہے کیا؟"

"نہیں سر....."

"انٹرسٹڈ ہو جاب کرنے میں تو درخواست دیں۔ چیئرمین صاحب سے سفارش کر کے کسی سیکشن میں گریڈ نو سے چودہ تک کی کسی خالی اسامی پر فٹ کرادوں گا۔"

"سر..... وہ گزٹڈ پوسٹ پر جانے کے لیے اپلائی کر رہی ہے۔" حالانکہ درخواستیں خود ابا داغ رہے تھے اسے تو جاب سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ اسے تو قلمکاری سے بھی کوئی رغبت نہ تھی جو پیسے ہاتھ آتے اماں کو تھما دیتی۔ امینہ کے جہیز کے لیے کچھ خرید کر اٹھا رکھنے کو..... اس نے تو اپنے کتھارسس کے لیے قلم کو مسیحا جانا تھا۔ اندر کا درد کم کرنے اور گھٹن کو نکاس دینے کے لیے ورنہ شاید وہ گھٹ، گھٹ کر ہی مر جاتی۔ گھٹن تو خیر اب بھی تھی۔ امینہ کی طرح اب وہ بھی آئے دن مختلف امراض کی شکار رہنے لگی تھی۔ کبھی ڈپریشن میں چلی جاتی۔ دو، دو تین، تین دن یاسیت کا دورہ پڑا رہتا۔ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا نہ لکھنے کو..... کبھی اچانک ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے، دل کی دھڑکن سست محسوس ہوتی۔ زبان اکڑنے لگتی، سانس یا تو بہت تیز چلنے لگتی یا سانسوں کی رفتار دھیمی ہو جاتی۔ جیسے بس زندہ رہنے کو زبردستی سانس لے رہی ہو۔ کبھی، کبھی یاسیت کا دورہ اتنا شدید ہوتا کہ وہ منہ کھول کر گہری، گہری سانسیں کھینچنے لگتی، آنکھیں ابل پڑتیں۔ "اماں! میں مر جاؤں گی۔" وہ وحشت زدہ ہو کر کہتی۔

امینہ پریشان ہو جاتی۔ اماں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے، وہ قرآنی آیات اور سورتیں پڑھ، پڑھ کر اس پر دم کرنے لگتیں۔

"اماں..... میں مر رہی ہوں۔" اس پر ہیجان طاری ہو جاتا، جسم اکڑ جاتا۔ نہ جانے کیوں موت کا خوف روز بروز اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک ہمسائی کے ساتھ اماں اسے ایک دم درود والے کے پاس بھی لے گئیں۔ تھا کوئی شریف بندہ جھاڑ پھونک والے عام عاملین کے برعکس اس نے انیسہ کو اپنے سامنے بٹھا کر حال سنا۔ سر پر ہاتھ دھر کر کچھ پڑھا، پھونکا اور سہ روزہ عمل کے لیے ایک گنڈا دے دیا۔ سارا عمل فقط سوا سو روپے اثر بہر حال نہ ہوا۔ پھر ایک ڈاکٹر کو دکھایا اور اس نے سکون آور ادویات دیں جن سے بہر حال کچھ افاقہ ہوا مگر کلی شفا پھر بھی نہ ملی۔ اسی اثنا سرکاری کالجوں میں لیکچرر شپ کے لیے پبلک سروس کمیشن کی طرف سے کال البتہ آ گئی۔ گزٹڈ پوسٹ تھی۔ انیسہ کو تو یاد بھی نہ تھا

کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس نے تو بس بحیثیت درخواست گزار دستخط کیے تھے یا ابا کے مطالبے پر اپنی تعلیمی اسناد انہیں دی تھیں جن کی فوٹو کاپیاں نکلوا کر ابا نے اصل اسے واپس کر دی تھیں۔ ''پڑھانے میں افسری والی بات تو خیر نہیں بنتی لیکن خیر تم ٹسٹ دے دو۔ اب تو ٹیچنگ میں بھی لوگ بیس بائیس گریڈ تک پہنچ جاتے ہیں۔'' پبلک سروس کمیشن کی طرف سے کال آئی تو ابا نے اس سے کہا۔

وہ روبوٹ کی طرح کمیشن کی جانب سے منعقدہ ٹسٹ میں بیٹھ گئی۔ انٹرویو کے لیے بھی کال آ گئی۔ ''وہ جو تمہارے افسانوں کا مجموعہ اور دو ناول چھپے ہیں وہ ضرور ساتھ لے جانا۔ انٹرویو میں خاص طور سے بتانا اپنے لکھنے کے بارے میں اور افسانوی مجموعہ اور ناول ضرور دکھانا۔'' ابا نے کہا۔

انٹرویو ہوا، انٹرویو کرنے والی ٹیم میں سفید بالوں والی ایک دبنگ شخصیت نے اس کے افسانوی مجموعے کے اوراق الٹ پلٹ کر سرسری دیکھتے ہوئے اچانک چونک کر کہا۔ ''ہیں! آپ گالیاں بھی لکھتی ہیں۔''

امیہ ہڑبڑا گئی۔

موصوف نے بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا۔

''کوٹھی کی بالائی منزل سے نیچے لان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑائی شٹ.....! یہ آج پھر آ گیا۔'' اتنا پڑھ کر سفید بالوں والے اس رکن بورڈ نے امیہ کی جانب دیکھا اور پھر کہا۔ ''تو آپ گالیاں بھی لکھتی ہیں۔''

''سر.....! زندگی ایک کہانی ہے اور زندگی میں گالیوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے، لکھنے والا کس، کس سے باوضو رہ سکتا ہے۔''

''بہت خوب.....! نہایت عمدہ!'' وہ بولے۔

''اور کیا کرتی ہیں آپ؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں.....''

''کیا مطلب.....؟'' وہ چونکے۔

''اور کچھ نہیں کرتی میں.....'' اس نے کہا۔

''کیوں.....؟''

''کیونکہ جو کچھ نہیں کرتے وہ کمال کرتے ہیں۔''

''بہر حال.....'' انہوں نے شانے اچکائے۔

''آپ کمال کرنے والوں کی کیٹگری سے خارج ہیں کیونکہ کمال کرنے والے تو کچھ نہیں کرتے۔ آپ تو افسانے اور ناول لکھتی ہیں۔''

''جینے کو بہانہ بھی تو چاہیے ہوتا ہے سر۔''

موصوف اسے بھویں چڑھا کر دیکھنے لگے۔

مگر تعجب کی بات یہ ہوئی کہ اس کے ان الٹے پلٹے جوابات کے باوجود ایک سرکاری زنانہ کالج میں اس کی تقرری کا پروانہ آ گیا۔

''فی الحال تو تم جوائن کر لو.....'' ابا نے کہا۔

ابا نے فی الحال تو کچھ اس انداز سے کہا جیسے مستقبل میں وہ صدارتی کرسی پر ہی تو براجمان ہونے جا رہی تھی۔

بہر حال اس نے اپنی تعیناتی کے مقام پر جوائننگ دے دی۔ زندگی دو خانوں میں بٹ گئی۔ تدریس اور تحریر..... لکھنا اسے سانس لینے کے مترادف محسوس ہوتا۔ صبح وہ کالج چلی جاتی۔ تین ساڑھے تین بجے واپس لوٹتی، دیکھتے ہی دیکھتے شام آ جاتی۔ رات کو جب ابا خراٹے بھر رہے ہوتے، اماں حسبِ عادت دائیں کروٹ پر سو رہی ہوتیں۔ امینہ گردو مافیہا سے بے خبر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی ہوتی۔ امیہ بیٹھی لکھ رہی ہوتی۔ ہر جگ بیتی میں اس کی آپ بیتی کسی نہ کسی زاویے سے آپ ہی آپ شامل ہو جاتی۔ اسامہ اور اس کی پرچھائیاں کسی نہ کسی پہلو سے اس کی کہانیوں میں جھلکنے لگتیں۔ پڑھنے والے اتنے محو ہو جاتے کہ اختتام پر بے ساختہ امیہ کے لکھے کو داد دینے پر مجبور ہو جاتے۔ بہت طویل عرصہ نہیں ہوا تھا اسے کہانی نگاری کرتے مگر قلیل عرصے میں وہ شہرت اور ناموری کے اس مقام پر جا کھڑی ہوئی تھی جہاں لوگ مدتوں جدوجہد کے بعد بھی نہیں پہنچ پاتے۔

☆☆☆

کہ اسے ٹیلیویژن کے لیے ڈراما سیریل لکھنے کی آفر آگئی۔ ابا پھولے نہ سماتے تھے۔ اماں البتہ فکرمند تھیں کہ وہ نوکری کرے گی، کہانیاں لکھے گی، ڈراما یا اپنی آئے روز طاری ہوجانے والی یاسیت سے نمٹے گی۔ اگرچہ ملازمت کے بعد مصروفیت بڑھ جانے سے اس پر یاسیت کے دوروں میں کمی ہوگئی تھی مگر مکمل چھٹکارا نہیں ملا تھا۔

ڈراما سیریل لکھنے کی پیشکش پر ابا سے زیادہ امینہ مسرور ہوئی۔

''انیسہ انکار مت کرنا..... کتنا مزہ آئے گا جب ہم سب بیٹھ کر تمہارا لکھا ڈراما دیکھا کریں گے۔ ساری کالونی اور خاندان میں واہ، واہ ہوجائے گی۔ اچھا سا ڈراما لکھنا، کوئی مزیدار سی لو اسٹوری۔''

''ایک لڑکی کی جسے اپنی محبت کو باپ کی خاطر قربان کرنا پڑا۔'' انیسہ نے ترشی سے کہا۔

امینہ سٹپٹا کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو، کچھ دیر بعد اس نے مردہ سی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

''انیسہ.....''

''ہاں..... بولو.....''

''تم اسے بھول نہیں پائی ہو ناں؟''

''کیا فرق پڑتا ہے۔''

''اس نے..... کبھی..... رابطہ کیا؟''

''ٹوٹا ہی کب تھا آپا۔''

امینہ نے اسے گلے لگا لیا اور نہایت دلسوزی سے اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔

☆☆☆

ڈراما نویسی نے تو اس کا بھرکس ہی نکال دیا۔ آنکھ، کان، زبان، جوارح سبھی کو۔ اپنی قوتِ متخیلہ کے زیرِ اثر لانا پڑتا تھا۔ لکھا ہوا جملہ جب کوئی کردار ادا کرے گا تو دیکھنے والے کو کیسا لگے گا، سننے میں کیسا محسوس ہوگا، بولنے میں کتنی روانی یا دقت ہوگی۔ کرداروں کی حرکات وسکنات کیا ہوں گی..... یہی نہیں لوکیشنز، منظر نگاری، ڈراما بنانے والے سرمایہ کار کے وسائل اور مسائل اور بہت کچھ.....!

''انیسہ دماغ کا کام کر رہی ہے ذرا اس کے کھانے پینے کا خیال رکھا کرو.....'' ابا، اماں سے کہتے۔

''ہاں، ہاں مجھے معلوم ہے۔'' اماں کہتیں۔

مصروفیت بڑھی تو انیسہ کے یاسیت کے دوروں میں کمی آتے، آتے مفقود ہی ہوگئی۔ ڈراما سیریل نے ابتدائی اقساط ہی میں ناظرین کے دل موہ لیے۔ انیسہ کو افسانہ اور ناول نگاری سے جو شہرت ملی تھی سو تھی ڈراما سیریل نے اسے چند ہی ہفتوں میں شہرت کی اس بلندی پر پہنچا دیا جس پر ابا تو پھولے نہ سماتے۔ خاندان میں ہلچل مچ گئی۔ کالونی میں انیسہ کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ ابا کے محکمے کے تمام دفاتر میں انیسہ کے نام کی گونج سنائی دینے لگی۔ انیسہ کے کالج کا اسٹاف اور طالبات ایک، ایک کو فخریہ بتاتیں کہ بلاک بسٹر سیریل کی لکھاری ان کے کالج میں پڑھاتی ہے۔

ایک مشہور و معروف لکھاری کی بہن ہونے کے ناتے امینہ کے لیے ایک اچھا رشتہ آگیا۔ لڑکے والوں کو بس یہ چاہت تھی کہ وہ اپنے دبئی ملازم و مقیم بیٹے کا رشتہ ایک معروف مصنفہ کی بہن سے کر رہے تھے۔

''دیکھا بیٹا اسے کہتے ہیں شہرت اور ناموری کا سکہ رائج الوقت ہونا..... نقد سودا..... ادھار بالکل نہیں..... کیا معلوم کل کس کروٹ اونٹ بیٹھے..... تمہاری وجہ سے آیا ہے امینہ کے لیے اتنا اچھا رشتہ..... تمہاری شہرت اور ناموری کی وجہ سے۔'' ابا نے انیسہ سے کہا۔ ابا بہت خوش، بہت جذباتی ہو رہے تھے۔

''بچی کے چہرے پر لاکھوں نثار..... جو بن کے بگڑے تو دشمن ہزار.....'' اماں نے کہا۔

''ارے کیوں بدفال نکالتی ہو منہ سے..... خدا نہ کرے جو بگڑے.....'' ابا نے بگڑ کر کہا۔

''میاں.....! میں تو ایک مثل بیان کر رہی ہوں۔'' اماں نے صفائی پیش کی۔

''منہ کو تالا لگا دیں میرے۔'' اماں چڑ گئیں۔

سیریل ابھی مکمل آن ائر نہ گئی تھی کہ امینہ کی چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگیا۔ ابا نے اس کی شادی کالونی میں افسروں کے لیے مخصوص کلب میں کی۔ افسران کو بھی مدعو کیا۔ ان کے بال بچے شادی میں شرکت سے زیادہ امینہ سے ملنے اور اس کے ساتھ اپنی تصاویر کھنچوانے آئے۔ سب کھنچ کھنچ کر امینہ کو دائیں بائیں اپنے درمیان لے کر تصویریں کھنچتے کھنچواتے رہے۔

''ان شاء اللہ امینہ کی شادی میں اس سے بھی زیادہ دھوم دھام سے کروں گا۔'' امینہ کو رخصت کرنے کے بعد ابا نے اماں سے کہا۔

امینہ کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔

سیریل کی اختتامی قسط نے امینہ کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ رائٹر اور کاسٹ کے ساتھ گفتگو پر مشتمل ایک پروگرام آن ائر گیا تو لوگ امینہ کے دیوانے ہوگئے۔

''اتنی ینگ اور خوب صورت رائٹر؟''

''ارے یہ تو خود ہیروئن لگتی ہے۔''

''اُف! بات کرنے کا انداز کیا زبردست ہے جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔''

''عام گفتگو کے جملے بھی ڈرامے کے ڈائیلاگز کی طرح دل پر لگتے ہیں۔''

''کیا منطق، کیا فلسفہ اور انسانی نفسیات پر کتنی گرفت ہے۔'' بڑے، بوڑھے، عورتیں، مرد، دانشور اور نئی نسل کے نوجوان سبھی امینہ کے مداح ہوگئے۔ گھر کا دروازہ نہ تھمنے والی دستک کا نقیب بن گیا۔ کبھی کوئی فنانسر، کبھی کوئی پروڈیوسر، کبھی کوئی آرٹسٹ تو کبھی امینہ کے انٹرویو کے لیے آنے والا ابلاغ عامہ کا نمائندہ مع فوٹو گرافر، گھر کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کے دوسری طرف افسران اور افسران اعلیٰ گھرانوں کے مکین امینہ کو دیکھنے کے لیے کھڑکیوں اور چوباروں سے جھانکتے اور گیلریوں میں کھڑے رہتے۔

امینہ کو نئی ڈراما سیریلز لکھنے کی پیشکشوں کی لائن لگ گئی۔ ٹی وی پروڈیوسرز سے لے کر فلم ڈائریکٹرز تک اس سے ڈراما لکھوانے کے خواہاں تھے۔

''ملازمت چھوڑو ڈراما لکھنے کو اپنا کیریئر بناؤ۔'' کسی نے مشورہ دیا۔

''نہیں بیٹا ایسی غلطی بھی مت کرنا..... ملازمت سرکاری ہے، ساٹھ سال کی عمر تک جاری رکھ سکتی ہو ترقی کے امکانات بھی روشن ہیں وزارتِ تعلیم تک جا سکتی ہو..... البتہ لکھنا بھی مت چھوڑو۔ اس سے ملنے والی شہرت تمہارے ملازمتی کیریئر کو بھی سپورٹ دے گی۔'' ابا نے اس مشورے کی شد و مد سے مخالفت کی۔

ہمسایہ گھرانے امینہ کی ہمسائیگی پر فخر محسوس کرتے اور افسران کہتے۔

''احتشام صاحب اب آپ کی فیملی اس مکان میں رہتی اچھی نہیں لگتی۔''

بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ نئے ماڈلز کی لشکارے مارتی گاڑیوں والے فنانسرز، پروڈیوسرز اور آرٹسٹ جب امینہ سے ملنے کے لیے آتے تو گھر والوں کو انہیں چھوٹی سی تنگ و تاریک بیٹھک میں بٹھاتے شرم آنے لگتی۔

وہ تیسری سیریل لکھ رہی تھی کہ اس کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آگیا۔ لڑکا ایم بی اے تھا، بڑے کیڈٹ کالج کا چھوٹا بیٹا والد ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے۔ والدہ صوبائی حکومت میں اعلیٰ عہدے پر حاضر سروس تھیں۔ ملازمت سے سبکدوشی میں چار پانچ سال باقی تھے۔ دو بیٹیوں اور دو بیٹوں کی شادی کر چکی تھیں۔ اب یہ سب سے چھوٹا اور آخری بیٹا تھا جس کے لیے انہیں امینہ اس وقت پسند آگئی تھی جب وہ امینہ کے کالج کی ایک تقریب میں منسٹر صاحب کے ہمراہ آئی تھیں اور امینہ جو تقریب کی نظامت کر رہی تھی۔ انہیں اپنے بیٹے کے لیے پسند آگئی تھی۔ تقریب کے بعد انہوں نے اگلے دن امینہ کی پرنسپل کو فون کر کے امینہ کے تفصیلی کوائف معلوم کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ وہ ان کے بیٹے کے لیے امینہ کے رشتے کی بات چیت شروع کرنے کو انہیں امینہ کے والدین تک پہنچانے میں مدد کریں۔ پرنسپل

صاحبہ نے انیسہ سے بات کی۔

"انیسہ....." انہوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ انیسہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کل منسٹر صاحب کے ساتھ جو خاتون مہمان ہمارے کالج آئی تھیں وہ تمہارے گھر آنا چاہتی ہیں۔"

"بسر و چشم میڈم!" انیسہ بولی۔

"بتاؤں کیوں؟" پرنسپل صاحبہ کی مسکراہٹ میں معنویت بڑھ گئی۔

"بتادیں تو اچھا ہے۔"

"تمہارے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ دینا چاہتی ہیں..... پانچ بچوں میں سب سے چھوٹا ہے، ایم بی اے ہے، خاتون خود تو صوبائی حکومت کی اعلیٰ عہدے دار ہیں، ہسبینڈ ایکس گریڈ ریٹائرڈ افسر ہیں، دو بہنوں کی شادی ہو چکی ہے، دونوں کی رہائش پوش رہائشی علاقوں میں ہے، دو بھائیوں کی بھی شادی ہو چکی ہے..... سب سے بڑا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے اس سے چھوٹا ڈاکٹر، ڈیفنس میں رہائش ہے جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔"

انیسہ چپ چاپ سنتی رہی۔

"اچھا رشتہ ہے..... ہمہ خانہ آفتاب است والا محاورہ تو سنا ہوگا تم نے..... ایسے رشتے قسمت سے ملتے ہیں۔"

"میڈم....." وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "اگر وہ اس مقصد سے آنا چاہتی ہیں تو پلیز آپ انہیں منع کر دیں۔"

"کیوں.....؟" وہ چونکیں۔

"میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیوں بھئی!" پرنسپل نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"میں..... اپنی جاب اور رائٹنگ کو وقت دینا چاہتی ہوں۔"

"مس انیسہ جاب اور رائٹنگ آپ کی لائف پارٹنر نہیں بن سکتیں..... انسانوں کو زندگی گزارنے کے لیے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک متوازن اور خدا کے ودیعت کردہ نظام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا حسن بھی برقرار رہتا ہے اور زندگی کا سفر بھی آگے چلتا ہے..... اوہ.....! آئی ایم سوری آپ تو خود بڑی زبردست رائٹر ہیں۔ میں آپ کو کیوں سمجھانے بیٹھ گئی۔" پرنسپل صاحبہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"آپ کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے میڈم اور تجربے کی اپنی اہمیت اپنی دانش ہوتی ہے۔" انیسہ نے کہا۔

"کسر نفسی ہے آپ کی۔"

"حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں۔"

"ایک بات اور....." پرنسپل نے توقف کیا۔

انیسہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"ذاتی طور پر میں یہ سمجھتی ہوں کہ غیر معمولی صلاحیتوں والے افراد کو تو اس دنیا میں صلاحیتوں کی زرخیزی کو فروغ دینے کے لیے عام افراد کے مقابلے میں لازماً اور اپنے پیک ٹائم یعنی صلاحیتوں کے عروج کے زمانے میں شادی کرنی چاہیے تاکہ وہ آئندہ نسل کو اپنی صلاحیتوں کا ورثہ پوری طاقت اور توجہ کے ساتھ منتقل کر سکیں..... یہ آپ کی صلاحیتوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ اسے اگلی نسل تک منتقل کرنا آپ کا انسانی فریضہ ہے۔"

انیسہ سر جھکائے طفل مکتب کی طرح بیٹھی رہی۔

"تو بھیج دیا جائے انہیں آپ کے گھر؟" وہ بدستور چپ بیٹھی رہی۔

"اگر کوئی ایسا مسئلہ نہ ہو جو آپ شیئر کرنا پسند نہ کرتی ہوں۔" انیسہ نے بے ساختہ چونک کر پرنسپل کو دیکھا۔

"نو، نو میڈم..... ایسی کوئی بات نہیں....."

"آئی ایم سوری..... میں نے صرف اس لیے یہ بات کہی کہ ہمارے سماجی نظام میں لڑکے لڑکیوں کے رشتوں کے سلسلے میں خاندان کے اندر بھی نہایت لذیذ کھچڑی پک رہی ہوتی ہے..... اس کی فلاں سے شادی ہو جائے اس کی فلاں سے نہ ہو۔"

"نہیں میڈم..... ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں....."

"تو پھر کیا قباحت..... اچھا رشتہ ہے..... آپ کے

سکتا ہے دونوں خاندان ایک دوسرے کو پسند آجائیں۔ اصل میں ہمارے ہاں شادی صرف لڑکا اور لڑکی کا ملن نہیں ہوتا، دو خاندانوں کا ملاپ ہوتا ہے، اچھے رشتے ملنا بہت بڑا مسئلہ ہے ہمارے معاشرے میں سو جب اچھا رشتہ ملے تو اس سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔" دفعتاً پرنسپل صاحبہ کا لہجہ سنجیدگی سے شگفتگی کی طرف مائل ہو گیا۔

"بھئی شادی تو ایسا لڈو ہے جو کھائے تو بھی پچھتائے نہ کھائے تو بھی پچھتائے۔ لہٰذا میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ کھا کر پچھتانا زیادہ بہتر ہے...... گواہیڈ......!"

ایمہ نے پھر خاموشی پر اکتفا کیا۔

"جوانی، طاقت، شہرت...... یہ سب عارضی اور وقتی باتیں ہیں...... آخر تک آپ کا ساتھ آپ کا لائف پارٹنر دیتا ہے یا اولاد...... میری زندگی کے تجربے کا نچوڑ تو یہی ہے مس ایمہ۔"

ایمہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ کیسا گہرا گھاؤ اپنے دل پر لیے بیٹھی تھی۔ اسامہ کو وہ اب تک نہ بھلا پائی تھی۔ شاید وہ بھول گیا تھا۔ تبھی تو اتنے عرصے میں کبھی کہیں سے اس کی صدا انہیں سنائی دی تھی۔

"اپنے گھر کا ایڈریس اور امی یا ابو کا فون نمبر دیں گی آپ مجھے۔" پرنسپل صاحبہ نے اپنے سامنے دھرے قلمدان سے قلم نکالتے ہوئے کہا۔

ایمہ نے خود کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

ابا کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

"دیکھا یہ ہوتا ہے لڑکیوں کو تعلیم کا فائدہ...... کبھی سوچ سکتے تھے ہم کہ اتنے بڑے گھر سے بیٹی کا رشتہ آئے گا...... مجھے تو بہت پسند آئے ہیں وہ لوگ...... لڑکا بھی نہایت سمجھدار لگتا ہے۔ اتنی دیر بیٹھے مجال ہے کہ اس نے اپنے منہ سے کوئی ہلکی بات نکالی ہو...... ماں اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ عہدہ...... باپ ایکس گریڈ ریٹائرڈ افسر...... لڑکا خود بھی ٹھیک ٹھاک ہے......" ابا مسلسل بولتے چلے گئے، اماں سنتی رہیں۔

اس طرح کہا جیسے اماں کو چھیڑ رہے ہوں۔

"میں کیا رائے دوں......" اماں کی نگاہوں میں ایمہ کا اس وقت کا بجھا، بجھا اداس چہرہ گھوم رہا تھا جب وہ سہ پہر کو گھر آئے مہمانوں کے سامنے آئی تھی۔

"کچھ تو بولو......" ابا نے اصرار کیا۔

"کیا بولوں...... میں تو بس اتنا جانتی ہوں میاں کے ہر عورت کا نصیب تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔"

"غلط......!" ابا نے نفی کی۔ "ہر شخص اپنا نصیب آپ لکھتا ہے۔" ایمہ دوسرے کمرے میں تھی مگر دونوں کمروں کی مشترکہ کھڑکی سے ابا اور اماں کی آوازیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کھڑکی پر پڑا پردہ ہٹا کر آہنی جنگلے کی جیل کی سی سلاخوں سے دوسرے کمرے میں جھانکتے ہوئے ابا سے احتجاج کرے کہ اگر ہر شخص اپنا نصیب آپ لکھتا ہے تو میرا نصیب آپ نے مجھے کیوں نہیں لکھنے دیا...... خود میرا نصیب لکھنے کی کوشش کیوں کی......! وہ ایسا نہ کر سکی...... کالج میں جواں عمر طالبات کو پڑھانے والی لیکچرار اور اپنے وقت کی ایک نامور اور عوامی پسندیدگی کی سند رکھنے والی ایک لکھاری ہونے کے باوجود اپنی نجی زندگی میں وہ ایک عام لڑکی کی طرح مطیع، تابعدار، فروتن اور لاچار ہونے پر مجبور تھی۔

لڑکے کی والدہ نے جو اپنے شوہر کے مقابلے میں حاوی لگتی تھیں رخصت ہوتے وقت نہایت گرمجوشی سے ابا سے کہا تھا۔

"اب آپ لوگ بھی ہمارے گھر تشریف لائیں۔ چھٹی والے دن میں عموماً گھر میں ہی ہوتی ہوں لیکن اگر کسی ورکنگ ڈے بھی آپ کا پروگرام ہو آنے کا تو کوئی مضائقہ نہیں، بس ایک دن پہلے اطلاع کر دیجیے گا۔"

"بہتر......" ابا نے کہا۔

"ان شاء اللہ آپ کی صاحبزادی ہمارے گھر میں ہماری بیٹی بن کر رہیں گی۔"

دعوت ملنے کو ابا رشتہ پکا ہونے سے تعبیر کر رہے تھے۔

ابا، اماں، امینہ اور اس کا شوہر اسی ہفتے لڑکے والوں کے ہاں ہو آئے۔ امینہ نے بہت خوش ہو کر اسے اپنے دورے کا تفصیلی احوال سنایا۔

''بہت بڑا گھر ہے، دو بلکہ شاید تین منزلہ..... ہم لوگ تو خیر نچلی منزل پر ہی ڈرائنگ روم میں بیٹھے..... اتنا خوب صورت سجا ہوا تھا ان کا ڈرائنگ روم کہ کیا بتاؤں۔ ابا بہت سنبھلے، سنبھلے بیٹھے رہے۔ اماں کا تو تمہیں پتا ہے ناں کتنی سادہ اور بھولی ہیں، لڑکے کی والدہ سے بولیں۔ ہماری بچی کو گھر داری زیادہ نہیں آتی۔ پہلے اسے تعلیم سے فرصت نہیں تھی پھر نوکری اور لکھنے لکھانے میں لگ گئی۔ وہ بولیں کوئی بات نہیں سیکھ جائیں گی..... ویسے امینہ لڑکا کافی ہینڈسم ہے۔''

امینہ کو بے ساختہ اسامہ یاد آ گیا۔ وہ بھی کچھ کم تو نہ تھا۔ چھ فٹ اونچا، وجیہہ، باوقار اور متین، ذہانت اس کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ نشست و برخاست کا سلیقہ تھا اسے اور گفتگو..... وہ بولتا تو سنتے ہی رہنے کو جی چاہتا۔

''اب باقاعدہ رشتہ لے کر بات پکی کرنے آئیں گے وہ لوگ..... شادی جلد کرنا چاہتے ہیں۔''

امینہ کے منہ سے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس نکلی، امینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''اتنا اچھا رشتہ مل گیا ہے..... خوش قسمت ہو۔'' امینہ بولی۔

''پتا نہیں.....''

''پتا نہیں.....!'' امینہ نے اس کے الفاظ تعجب سے دہرائے پھر کہا۔

''پتا کیوں نہیں..... کالونی سے ڈینس کے بنگلے میں چلی جاؤ گی..... ایسی قسمت تو کسی، کسی کی ہوتی ہے۔''

وہ چپ رہی۔

''مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو۔''

''کیا سوچ رہی ہوں.....؟'' امینہ نے چونک کر امینہ کو دیکھا۔

''وہاں تمہیں کیا ملتا امینہ..... اتنے بڑے کنبے

پڑھیے اور یاد رکھیے

1۔ غذا کو دوا بنائیں اور صحت پائیں.....

یہ نصیحت یونان کے مشہور حکیم بقراط (460 ق م۔ 370 ق م) کی ہے جسے مغربی طب کا بانی سمجھا جاتا ہے اور اس کی سچائی میں کوئی کلام نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ روز مرہ زندگی میں چٹنے والی بہت سی چھوٹی بڑی طبی خرابیاں محض درست غذا کھانے سے دور ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً موسم کی سبزی پھل استعمال کیے جائیں تو وہ نہ صرف ضروری معدنیات و حیاتین فراہم کرتے بلکہ صحت مند بھی بناتے ہیں۔ چنانچہ عاقل و فہیم وہ ہے جو دوا کے بجائے صحت بخش غذا سے خود کو تندرست رکھے اور بیماریاں نزدیک نہ پھٹکنے دے۔

2۔ بیماری سے بچنے کے لیے کم کھائیں اور زندگی بڑھانے کی خاطر پریشانی سے بچیں۔ یہ قول مشہور چینی راہب، چوہوئی ونگ کا ہے۔ اس کا شمار کنفیوشس ازم کے اہم راہبوں میں ہوتا ہے۔ قول کا پہلا ٹکڑا سولہ آنے سچ ہے۔ انسان زیادہ کھانے ہی سے سیکڑوں امراض کا نشانہ بنتا ہے۔ از حد کھانا نہ صرف فربہ کرتا ہے بلکہ نظام ہضم پر بے پناہ دباؤ ڈالتا ہے۔ یہ دباؤ مسلسل رہے تو نظام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ انسان زندہ رہنے کے لیے کھانا کھائے نہ کہ اپنی قبر کھودنے کی خاطر.....

دوسرا حصہ بھی ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جدید طب دریافت کر چکی ہے کہ عمر گھٹانے والی کئی بیماریاں پریشانی اور ذہنی و جسمانی دباؤ سے جنم لیتی ہیں۔ بدقسمتی سے دورِ جدید میں تیز رفتار زندگی کے باعث دباؤ میں اضافہ ہی ہوا ہے اور اسی سے نجات پانے کا ایک آسان طریقہ نماز پڑھنا و عبادتِ الٰہی کرنا ہے۔

3۔ تندرستی معالج سے نہیں فطرت کی طرف سے ملتی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر علاج شروع کرتے وقت ہمیشہ پہلے فطرت سے رجوع کرے۔

مرسلہ: اقبال چکوال

میں تو تم روٹیاں پکاتے، پکاتے ہی بیزار ہو جاتیں۔"

"محبت آپا....." وہ فقط اتنا ہی بولی۔

"محبت سے زندگی نہیں گزرتی انیسہ..... زندگی گزارنے کے لیے اور بھی بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً اچھا گھر، نئی گاڑی، سر کی جیب میں پیسہ اور....."

"اور.....؟"

"کام کاج کے لیے نوکر چاکر....."

"تمہارے گھر میں کتنے نوکر ہیں؟"

"صفائی کے لیے ماسی آتی ہے بس....."

"میں بھی گزارہ کر لیتی۔"

"بھول جاؤ اسے..... میں سمجھتی ہوں ابا کا فیصلہ بہت درست تھا..... انہوں نے تمہیں بہتر مستقبل دینے کے لیے مشقت کی زندگی سے بچا لیا، وہاں تو تمہیں کھولو کا بیل بن جانا پڑتا..... اس نے کبھی ایک مرتبہ بھی پلٹ کر دیکھا؟"

"خوددار تھا آپا۔"

"اسے خودداری نہیں خودغرضی کہتے ہیں۔"

"ابا نے اس کے گھر والوں کو گھر آنے کی اجازت تک تو دی نہیں تھی۔ اتنی توہین کون برداشت کرتا ہے۔"

"خیر..... جو ہوا اچھا ہوا..... تمہاری بہتری کے لیے ہوا..... اب میں بھی اپنے سسرال میں سر اونچا کر کے شومار سکوں گی کہ میری بہن ڈیفنس میں رہتی ہے۔"

"بیٹی کس کی ہو....." انیسہ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے اپنے ابا کی....." امینہ مسکرا کر بولی۔

"کاش تم نے....."

"ہاں، ہاں کہہ دو..... رک کیوں گئیں..... کہہ دو..... کاش تم نے کسی سے محبت کی ہوتی۔"

"اچھا ہوا..... نہیں کی۔" انیسہ دل گرفتگی سے بولی۔

☆☆☆

دوسروں کو سمجھانا کتنا سہل اور خود کو سمجھانا کتنا

ہوا۔ وہ جتنا خود کو سمجھانے کی کوشش کرتی اتنا ہی ذہن گنجلک ہوا جاتا۔

"اتنی بزدلی سے سپر کیوں ڈال دی؟" دل کہتا۔ "ابا کو سرخروئی کے لیے اتنی سہولت کاری کیوں کی، کچھ تو مشکل ڈالنی تھی ان پر نہ کرتی اتنی آسانی سے ہاں۔"

پرنسپل صاحبہ کا فلسفہ اور سمجھانا بجھانا الگ مگر کتنے ہیں جو شادی کیے بغیر بھی نہ صرف زندہ بلکہ شاد بھی رہتے ہیں۔

شادی کی تاریخ مقرر کی جا چکی تھی۔ تیاریاں جاری تھیں اور وہ جلدی، جلدی اپنا نامکمل اسکرپٹ مکمل کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اماں نے امینہ کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا تھا۔ اکثر اس کا شوہر بھی آ جاتا۔ انیسہ کی ہونے والی ساس مسز عفت جمیل بری کی تیاری میں انیسہ کی پسند، ناپسند جاننے کے لیے اپنی کسی بیٹی یا بہو کے ہمراہ گاہے، گاہے آ جاتیں۔ ایک روز اماں سے بولیں۔

"میں تو اس حق میں تھی کہ انیسہ کو ساتھ لے جا کر شاپنگ کرائی جاتی مگر بچوں اور ان کے پاپا نے کہا انہیں اپنا اسکرپٹ اطمینان سے مکمل کرنے دیں۔"

ابا خوش تھے بیٹی اس گھر جا رہی تھی جہاں اس کے ہونے والے شوہر سمیت سارے مرد کلغی بردار تھے۔ ابا دن میں کئی بار بہانے، بہانے فخر سے اپنے دفتر والوں کو بتاتے کہ ان کے ہونے والے سمدھی ایکس گریڈ ریٹائرڈ افسر، سمدھن اعلیٰ سرکاری عہدے دار، ہونے والا داماد ایم بی اے، اس کا بڑا بھائی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور منجھلا بھائی سرجن ڈاکٹر تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ فخر سے ابا بار، بار بہانے، بہانے لوگوں کو یہ بھی بتاتے کہ شادی سر پر ہونے کے باوجود بیٹی دن رات اپنا اسکرپٹ مکمل کرنے میں مصروف تھی۔

اور انیسہ کے دل میں بار، بار یہ خیال سر اٹھاتا کہ اگر ابا نے اس کی سر بریدہ پہلی محبت کو اتنے چاؤ سے گلے لگا لیا ہوتا تو کیا عجب کہ اس کی دوسری محبت کو بھی کبھی اسی طرح چوم چاٹ لیتے۔ وہ اپنے مقام پر ٹھہرتا تو سہی..... خدا جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کے

پرانے دوستوں کو بھی خبر نہ تھی۔

☆☆☆

اسکرپٹ مکمل ہو گیا۔ شادی بھی ہو گئی اور شادی کی تصویریں سوشل میڈیا پر وائرل بھی!

"مبارک!" بیرونِ ملک نمبر سے آنے والی کال ریسیو کرنے پر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ آواز...... یہ لہجہ تو وہ لاکھوں، کروڑوں، اربوں، کھربوں آوازوں کے بیچ بھی پہچان سکتی تھی۔

"سوری......" اس نے اپنے قرب میں نیم دراز ضیغم کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت بزی ہوں......" اور نہ صرف کال منقطع کر دی بلکہ فون ہی بند کر دیا۔

"کس کی کال تھی؟" ضیغم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے خمار آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دوست کی......"

"اپنی دوستوں کو بتا دو کہ شام میرے جیون ساتھی کے نام...... کیوں ٹھیک ہے ناں......؟"

"آں...... ہاں......" وہ کسی اور ہی جہان میں پہنچی ہوئی تھی۔

"ہاں......" وہ اٹھ بیٹھا اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بہت چاہت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "سوچا بھی نہیں تھا کہ ممی میرے لیے ایسی لڑکی کا انتخاب کریں گی جو اپنی دلکشی اور معصومیت سے مجھے چاروں خانے چت کر دے گی۔ اتنی مسحور کن کیوں ہو تم...... کسی نایاب خوشبو کی طرح......؟"

"اتنا عرصہ کہاں تھے تم...... اور آج کیوں آ گئے؟" انیسہ کا دل دہائی دے رہا تھا۔

"آئی لو یو انیسہ......" ضیغم اس کی گھنی سیاہ زلفوں میں اپنا چہرہ چھپائے کہہ رہا تھا۔

انیسہ کو سانس لینی دوبھر ہو رہی تھی۔

"چپ کیوں ہو...... بولو ناں......؟"

"لو یو ٹو......" انیسہ کو خود اپنی آواز اجنبی لگی۔

شاید اسی منافقت کے ساتھ زندگی بسر کرنی تھی اب اسے......

رات کو جب وہ ضیغم کے ہمراہ اماں ابا سے ملنے کے لیے گئی تو ابا سے ضیغم کی گپ شپ شروع ہوتے ہی اس نے دوسرے کمرے میں جا کر وہی نمبر ملایا۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ لائن پر تھا۔

"آئی ایم ریئلی سوری...... میری کال سے کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا تمہیں......؟"

"میں نے تو اپنا نمبر تبدیل کر لیا ہے...... نیا نمبر کہاں سے ملا؟"

"بس ڈھونڈ ہی لیا...... میں سمجھ گیا تھا بزی ہو اسی لیے دوبارہ کال نہیں کی...... کیسی ہو؟"

"زندہ ہوں......"

"خوش بھی؟"

وہ چپ رہی۔

"شادی مبارک...... نیٹ پر تصویریں دیکھیں تو پتا چلا کہ بلے رائٹ انیسہ احتشام جس کی سنا ہے آج کل دھوم مچی ہوئی ہے وطن میں وہ تم ہو......"

"اس سے پہلے بھی پتا ہوگا کہ وہ انیسہ احتشام میں ہی ہوں...... کئی شوز میں رونمائی ہو چکی ہے اس انیسہ احتشام کی۔"

"بخدا مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"پاتال میں اترے ہوئے ہو یا عرش نشین؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہ پاتال میں اترا ہوا ہوں نہ عرش نشینی مقدر بن سکی...... پردیس میں بھٹک رہا ہوں۔"

"وہ تو نمبر سے ظاہر ہے۔"

"سی ایس ایس کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ انہی دنوں ابو کے کسی جاننے والے کے توسط سے نوکری مل رہی تھی۔ ابو نے کہا کب تک تعیناتی کا انتظار کرو گے اور ایمانداری سے افسری میں تمہیں ملے گا کیا...... بہنوں کو کیسے نمٹاؤ گے، آج کے مسائل دیکھو، کل کی راہ مت تکو......

والد صاحب کا مشورہ شاید درست ہی تھا۔ الحمدللہ گھر بھی بنالیا، تم سناؤ....."

"کیا سناؤں..... تم نے تو کبھی پلٹ کر ہی نہیں دیکھا۔" اس نے شکوہ کیا۔

"تم نے کوئی امید تو باقی نہیں رہنے دی تھی۔ پھر بھی میں اسی امید میں رہا کہ پلٹ کر دیکھنے اور پتھر بن جانے سے بہتر ہے چلتا رہوں..... انتظار کروں..... مگر پتا چلا کہ انتظار ہمیشہ ہی بارآور نہیں ہوتا..... پلٹے بغیر بھی زمین پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ کھڑے کا کھڑا رہ گیا ہوں..... بہرحال تمہاری خوشیوں کے لیے بہت سی دعائیں..... اب کسی اور کی ہوس لیے یہ کہنا کہ..... تمہارا خیال میرے ساتھ رہا غیر اخلاقی بات ہوگی..... ایک بار پھر شادی مبارک..... کامیابی بنک کامیابیاں مبارک..... اللہ حافظ....."

"خدا حافظ....." انیسہ کو لگ رہا تھا کہ شدتِ رنج سے اس کے حلق کی پرتیں چیخ جائیں گی۔

کتنی ہی دیر وہ اکیلی گم صم کمرے میں بیٹھی رہی۔

"حسینم جانے کو کہہ رہے ہیں۔" اماں آئیں تو انہوں نے کہا۔ اس نے جلدی سے اپنے موبائل سے اس کے نمبر سے آنے اور جانے والی کالز حذف کیں اور خود کو نارمل ظاہر کرتی ابا اور حسینم کی طرف چل دی۔

اب نہ وہ میں نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو شخص تمنا کے سرابوں میں ملیں

☆☆☆

شادی کے بعد سسرال میں تو انیسہ کا ہنی مون پیریڈ جلد ہی اختتام پزیر ہوگیا۔ میکے میں البتہ بدستور آؤ بھگت رہی۔ سسرال میں وہی دیرینہ سماجی روایت کہ شادی کے بعد گھر آنے والی بہو کی شروع، شروع تو اتنی پزیرائی کہ وہ خود کو خوابِ شیریں میں محو پاتے۔ لگتی ہے مگر جب کھیر میں ہاتھ ڈلوانے کے بعد ساس چولھا چکی سنبھالنے کا حکم جاری کرتی ہے تو بیچاری بہو کی آنکھ کھل جاتی ہے اور اکثر زندگی کی سنگلاخ حقیقتیں دانت نکوسے اس پر ہنس رہی ہوتی ہیں۔

انیسہ کی ساس مسز عفت جمیل دبنگ اور منتظم شخصیت تھیں۔ شوہر بھی عمر، تجربہ، لیاقت اور گریڈ میں ان سے بڑے اور سینئر ہونے کے باوجود ہر شریف آدمی کی طرح اپنی نصف بہتر سے کان دبائے رہتے۔ گھر دو منزلہ تھا، زیریں منزل پر ساس، سسر رہتے تھے اور ان کے ساتھ چھوٹا بیٹا حسینم۔ شادی شدہ دونوں بیٹے اور ان کے بال بچے بالائی منزل پر دو علیحدہ، علیحدہ حصوں میں رہتے تھے ڈرائنگ ڈائننگ اور عمومی بیٹھک کا بڑا سا لاؤنج نیچے ہی تھا۔ کچن نیچے بھی تھا اور بالائی منزل پر مقیم دونوں بیٹوں کے لیے ہر حصے میں ایک، ایک چھوٹا کچن علیحدہ بھی مگر کھانا پینا سب کا مشترکہ تھا سو نیچے والا کچن ہی زیادہ استعمال میں رہتا۔ ناشتا، کھانا سب گھر والے اکٹھے ایک ہی میز پر کھاتے۔ افرادِ خانہ کی تعداد بڑھنے کے ساتھ کھانے کی میز کی گنجائش بھی بڑھالی گئی تھی۔ انیسہ کی آمد کے بعد افرادِ خانہ کی تعداد تیرہ ہوگئی تھی۔ ساس، سسر، تین بیٹے، تین بہوئیں، بڑے بیٹے کے تین اور منجھلے کے دو بچے، مہمان آجاتے تو کھانے کی میز کے گرد کرسیوں کی تعداد میں اضافہ کرلیا جاتا۔

گھر میں چار گاڑیاں تھیں دو ڈرائیور، گھر کی صفائی کے لیے ایک ملازمہ، کپڑوں کی دھلائی کے لیے اس کی نوجوان بیٹی، لان اور پودوں کی دیکھ بھال کے لیے بوڑھا مالی اور اوپر کے کام کے لیے ایک نوکر جو گھر کے مین گیٹ پر آئے گئے لوگوں کی خیر خبر بھی رکھتا اور گھر آئے مہمانوں کو بہ ضرورت چائے پانی بھی پیش کرتا۔

کچن کے تمام امور گھر کی بہوؤں کے سپرد تھے۔ عفت جمیل کو بقول خود کچن کے امور ملازموں کے سپرد کردینا ناپسند تھا۔ حتیٰ کہ برتن بھی نوکروں سے دھلوانا پسند نہ کرتیں۔ خدا جانے اس میں ان کے کس واہمے کا دخل تھا یا گھر کی بہوؤں کو سدھائے رکھنے کی حکمتِ عملی..... آخر انہیں بھی تو کچھ کرنا چاہیے، ساس اگر صبح سے شام تک منصبی امور میں سر کھپاتی تھیں تو بہوؤں کو امورِ خانہ داری سنبھالنے میں کیا قباحت تھی جبکہ گھر میں امورِ خانہ داری کو سہل اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں

کردینے والی جدید آسائشیں بھی موجود تھیں۔

ملازمت پیشہ ماں کی شبانہ روز مصروف زندگی کے پیشِ نظر عفت جمیل کے دو بیٹوں نے ایسی لڑکیوں سے شادی کرنے کو ترجیح دی تھی جو تعلیم یافتہ تو ہوں لیکن ملازمت نہ کرتی ہوں..... مگر قسمت کی بات کہ ضیغم کی باری پر ایسا نہ ہوسکا۔ اس کا مقدر رانیہ جیسی لڑکی سے ملا جو نہ صرف ملازمت کرتی تھی بلکہ مصروفیت کے ساتھ شہرت میں اس کی ماں سے کہیں آگے تھی۔ چھوٹے بیٹے کے لیے انیسہ کے انتخاب پر عفت جمیل کے گھر والوں نے کہا بھی تھا۔

''سیلمر ٹیز کے دماغ بہت خراب ہوتے ہیں، دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتیں۔''

''معمولی گھر کی لڑکی ہے، اچانک شہرت کے آسمان پر پہنچی ہے، ابھی دماغ اتنے خراب نہیں ہوئے ہوں گے، دب کر رہے گی اپنی شہرت پر اترائے گی نہیں۔'' عفت جمیل نے کہا تھا۔

''دماغ خراب ہو تو سکتا ہے۔'' ضیغم بولا۔

''یہ شوہر پر ہوتا ہے کہ وہ بیوی کا دماغ کتنا خراب ہونے دیتا ہے۔ لڑکی خوب صورت ہے اور حسنِ کلام رکھتی ہے..... ورنہ آج کل کی لڑکیوں کو تو بات کرنے کا سلیقہ ہی نہیں..... کالج کے فنکشن کو اس کی کمپیئرنگ نے چار چاند لگا دیے تھے۔ مجھ سے ملی تو نہایت ادب اور قرینے کے ساتھ۔''

''دیکھ لیں ممی.....'' ضیغم نے کہا۔

''دیکھ تو لیا ہے..... ان شاء اللہ ہمارے فیصلے سے خوش رہو گے۔''

ضیغم شادی کے بعد انیسہ کی خوب صورتی سے زیادہ اس کی خوش کلامی پر لٹو ہوگیا تھا اس کی دونوں بھابیوں کی طرح اونچی، اونچی آواز میں باتیں کرنے، زور سے ہنسنے اور قہقہے لگانے کے بجائے وہ دھیمی آواز میں دھیرے، دھیرے بات کرتی۔ منہ کھول کر ہنسنے اور قہقہے لگانے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کرتی..... یہ اماں کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ اماں سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں۔ پرانی اقدار و روایات کی پروردہ اور امین، اپنے بڑوں سے جو سیکھا تھا وہی دونوں بیٹیوں کو بھی منتقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی لیے امینہ اور انیسہ دونوں ہی اپنے عہد کی عام لڑکیوں کی طرح نہ..... بے حجاب تھیں نہ منہ پھٹ امینہ کم اور انیسہ اس سے کچھ زیادہ نئے فیشن کی دلدادہ ضرور تھی مگر حد اور حجاب میں رہتے ہوئے۔ اسامہ کو انیسہ کی دوسری خوبیوں کے ساتھ یہی خوبی تو نہایت متاثر کرتی تھی کہ وہ یونیورسٹی ہمیشہ نہایت وقار سے آتی تھی۔ کبھی کوئی ایسا لباس نہ پہنتی جس سے شرقیت مجروح ہوتی ہو..... بعض پھوہڑ لڑکیوں کی طرح سر جھاڑ منہ پھاڑ بھی نہ آتی تھی مگر اس کی آراستگی حدود و قیود میں ہوتی۔ نہ چہرہ بے پناہ لیپا پوتی کا آئینہ دار ہوتا نہ کوئی اور بات ایسی کہ راہ چلتے بھی خواہ مخواہ متوجہ ہو جائیں۔ گھر میں ہوتی تو بالکل سادہ اور چہرے کی لیپا پوتی سے مبرا رہتی۔

سسرال کا ماحول اس کے میکے سے بالکل مختلف تھا، میکے میں تو گنتی کے چند افراد تھے اور بالکل سادہ سی زندگی..... رشتے دار زیادہ تر وسط شہر کی آبادیوں میں رہتے تھے۔ ابا کے محکمے کی کالونی آنا جانا انہیں دور پڑتا تھا لہٰذا کم ہی آنا جانا ہوتا..... رشتے داروں سے زیادہ قربت تو محلے داروں سے تھی، دکھ سکھ میں پہلے وہی کام آتے۔ یوں سوشل لائف واجبی سی تھی، مہمانداری برائے نام تھی۔ کبھی کوئی آگیا تو خیر ورنہ خاموشی، البتہ امینہ کی شادی کے بعد چھٹی کے دنوں میں امینہ اور اس کے شوہر کا آنا جانا رہتا تھا۔ گھر میں جلدی سونے اور تڑکے بیدار ہونے کا معمول تھا۔ امینہ کی شادی سے پہلے تو گھر میں دونوں بہنوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اس کی شادی کے بعد تو گویا سناٹا ہوگیا تھا۔ اماں امورِ خانہ داری اور کبھی وضو، کبھی نماز، کبھی قرآن مجید کی تلاوت میں لگی رہتیں۔ انیسہ پڑھائی لکھائی میں دونوں بات بھی کس حد تک کرسکتی تھیں بھلا..... ابا شام کو آتے، نماز پڑھتے، چہل قدمی کرتے، کچھ بات چیت اماں سے کچھ انیسہ سے اور اگر امینہ، میکے آئی ہوتی تو اس سے

بھی پھر سو جاتے۔

میکے کی سادہ اور کسی حد تک خاموش زندگی سے ایک بھرے پرے اور ہمہ وقت بولتے چالتے گھرانے کی فرد بن جانا انیسہ کے لیے ایک نیا اور قدرے مشکل تجربۂ حیات تھا جس کی وہ ذرا عادی نہ تھی۔ کہاں میکے کی وہ پرسکون زندگی اور کہاں ہمہ وقت ہلچل...... اونچی آوازیں گونجتی رہتیں، کبھی بڑی بھابی رابعہ اپنے کسی بچے کو پکار رہی ہوتیں، کبھی منجھلی نورین کسی نوکر کو ہدایات دے رہی ہوتیں۔ کبھی کسی بچے کی سالگرہ کا دن، کبھی کسی شادی شدہ جوڑے کی اینورسری، آج سربراہ کنبہ جمیل صاحب کا برتھ ڈے تو کل مہمانوں کی ڈنر پر آمد......

انیسہ کی دونوں نندیں تو عموماً رات ہی کو آتیں یا پھر چھٹی والے دن کیونکہ ماں دفتر سے دیر ہی سے آتی تھیں یا پھر چھٹی والے دن ملتیں۔ صبح کا ناشتا نورین بھابی کی ذمے داری تھی۔ دوپہر کا کھانا رابعہ بھابی کے سپرد، انیسہ ذرا پرانی ہوئی تو رات کا کھانا اس کے ذمے لگ گیا۔ صبح اسے کالج جانا ہوتا لہٰذا ناشتے کی ذمے داری اسے نہیں سونپی جا سکتی تھی۔ دوپہر کو اسے کالج سے واپس آتے، آتے تین ساڑھے تین بج جاتے لہٰذا دوپہر کا کھانا بھی اس کے ذمے نہیں ہو سکتا تھا۔ سو رات کا کھانا اس کے ذمے ہوا۔ کھانے کے بعد دونوں بڑی بہویں اپنے، اپنے حجروں میں چلی جاتیں، انیسہ کو کچن سے فراغت پاتے، پاتے گیارہ بارہ بج جاتے، کمرے میں جاتی تو حسیم کہتا بتی بند کرو جبکہ اسے لکھنا ہوتا، گو لکھنے کا خاصا کام وہ کالج میں اپنے فری پیریڈز کے دوران لائبریری کے کسی الگ، تھلگ گوشے میں بیٹھ کر لیتی تھی مگر وقت پر کسی جریدے کو افسانہ، ناول کی قسط یا کسی ڈرامے کا اسکرپٹ دینے کے لیے گھر پر بھی لکھنے کے لیے وقت نکالنا ہوتا...... کبھی، کبھی اسے پوری، پوری رات بھی بیٹھنا پڑتا۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ وہ لکھنے بیٹھی ہی ہوتی کہ نندوں میں سے کسی ایک یا دونوں کے آنے کی خبر ملتی اور اسے ان کی خاطر برداری کو اٹھنا پڑتا۔

''کیا مصیبت ہے یار...... سوتی ہو نہ سونے دیتی ہے۔'' حسیم کسمساتا، جھلاتا، بڑبڑاتا۔

''سوری حسیم...... کام کرنا ہے مجھے۔''

''مجھے تمہارے کام سے کوئی دلچسپی نہیں...... میں آرام کرنا چاہتا ہوں اینڈ...... او بویسلی......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ دیتا۔ انیسہ اس سے یہ نہ کہہ پاتی کہ لکھنا اس کے لیے زندگی تھی۔ جس روز وہ کسی وجہ سے لکھ نہ پاتی اسے لگتا دن اکارت گیا۔ روح بے چین رہتی...... جملے مرغانِ بسمل کے مانند اس کی جھولی میں گرتے رہتے۔ لکھنے بیٹھتی تو ذہن پر زور دینے کے باوجود اکثر گرفت میں نہ آتے۔ وہ تاسف میں پڑ جاتی، کتنا اچھا، جملہ سوچا تھا اس وقت...... اب یاد نہیں آ رہا۔ تخلیق کا کرب! اکثر اسے سوتے سے اٹھا کر بٹھا دیتا۔ حسیم کی نیند میں خلل پڑنے کے اندیشے سے وہ ننگے پاؤں رائٹنگ ٹیبل تک جاتی، شادی کے ابتدائی دنوں میں حسیم نے وہ رائٹنگ ٹیبل مع ایک نفیس ٹیبل لیمپ بڑے پیار سے تحفے میں دی تھی اور کہا تھا۔

''اس پر تم کمفرٹیبل ہو کر لکھ سکو گی......'' واقعی بہت آرام دہ میز تھی جس پر لکھنے میں مزہ آتا۔ وہ آہستگی سے ٹیبل لیمپ کا سوئچ دباتی۔ ایک نظر سوئے حسیم پر ڈالتی اور تخلیق کا کرب نشہ بن کر اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگتا۔ صبح گھر میں بیداری ہونے تک وہ کئی صفحے سیاہ کر چکی ہوتی۔ لکھنے میں اسے سکون ملتا۔ بے چین دل کو قرار آ جاتا۔ دیر تک لکھ کر بھی تکان نہ ہوتی۔ اس کا بس چلتا تو ساری زندگی بیٹھی بس لکھتی ہی رہتی۔ عجیب تھا یہ نشہ......! اور اس کی زندگی کی پہلی محبت...... پہلا عشق...... میکے جاتی تو ابا بڑے چاؤ سے پوچھتے۔

''ہاں بیٹا آج کل کیا لکھ رہی ہو......؟'' یا پھر۔ ''تمہارا اسکرپٹ کہاں تک پہنچا؟'' اسے ابا کے قدموں میں بکھرے ریزہ، ریزہ ٹکڑے یاد آتے لگتے۔

سسرال والوں کو اس کے تخلیقی کرب اور مشقت سے چنداں غرض نہ تھی۔ وہ تو اس کی ناموری کا تمغہ مفت اپنے سینوں پر سجانا پسند کرتے اور اس سے ملنے کے لیے آنے والے پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز اور ایکٹرز

سے بلاکٹ ملنے میں فخر پاتے۔

"انیسہ احتشام میری بہو ہے......" عفت جمیل اپنے دفتر میں بیٹھ کر لوگوں کو فخریہ بتاتیں۔

دونوں بھابیوں سے ان کے گھر والے نہایت اشتیاق سے انیسہ کے روز و شب کا احوال سنتے۔

"ہائے اللہ! برتن بھی دھوتی ہیں وہ۔"

"تو اور کیا۔۔۔؟"

"کھانا کیسا پکاتی ہیں؟"

"کبھی خود سے، کبھی نیٹ سے ترکیب دیکھ کر۔۔۔"

حالانکہ پوچھنے والے نے یہ نہ پوچھا ہوتا کہ کھانا کیسے پکاتی ہیں بلکہ سوال یہ کیا ہوتا کہ کھانا کیسا پکاتی ہیں یعنی لذیذ، ذائقے دار یا گزارے لائق۔۔۔

دونوں نندوں کی سسرالوں میں نندوں کی ٹوپیوں پر انیسہ کی شہرت کی کلغی لگ گئی تھی۔

"ارے وہ جو انیسہ احتشام ہیں جن کی آج کل سیریل چل رہی ہے۔ ہماری بھابی کی بھابی ہیں۔" انیسہ کی نندوں کی نندیں اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتیں۔

شبنم کے بھائیوں کے بچوں کی اپنے، اپنے اسکول میں گڈیاں اوپر چڑھ گئی تھیں۔

"انیسہ احتشام کا بھتیجا میری کلاس میں پڑھتا ہے۔" ان بچوں میں سے کسی کی ٹیچر فخریہ اپنی ساتھیوں کو بتاتی۔

"میڈم سے کہو اینول فنکشن میں انیسہ احتشام کو چیف گیسٹ بنائیں۔"

انیسہ کا کہاں، کہاں اور کس، کس طرح سے ذکر ہوتا تھا۔ فائدہ اٹھایا جاتا تھا خود انیسہ کو بھی علم نہیں تھا۔ بھارت میں عفت جمیل کے ایک خالہ زاد بھائی کا بھارتی نژاد بیٹا رشتے داروں سے ملنے کے لیے پاکستان آیا تو اس نے خود بتایا امیگریشن والوں نے پوچھا پاکستان کس لیے آئے ہو، اس نے کہا رشتے داروں سے ملنے، پوچھا گیا کون، کون رشتے دار ہوتے ہیں یہاں؟ اس نے نام اور پتے بتانا شروع کیے۔ امیگریشن والے بقول اس کے خاطر میں نہ لاسکے۔۔۔ پھر اس نے عفت جمیل

بچوں سے اپنی عزیز داری ظاہر کی۔ امیگریشن والے سنتے رہے لیکن جونہی اس نے کہا مشہور ڈراما نگار انیسہ احتشام اسی گھرانے کی بہو ہیں امیگریشن والے چونکے اور ایک اہلکار نے دوسروں سے کہا "جانے دو یار انیسہ احتشام کو تو ساری اردو داں دنیا جانتی ہے۔"

مگر وہی انیسہ احتشام بھارت سے آئے اور اپنے نام پر امیگریشن سے خلاصی پائے مہمان ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کرتے اہلِ خانہ کے لیے کافی بنا کر ٹرے دونوں ہاتھوں سے پکڑے پہلی بار مہمان کے سامنے آئی اور عفت جمیل نے اپنے کزن کے بیٹے کو فخریہ بتایا کہ وہ انیسہ احتشام تھی۔ "لگتیں تو نہیں۔۔۔" وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولا۔

"کیوں بھئی؟" عفت جمیل نے پوچھا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ کوئی بہت ونبگ اور مغرور سی فیشن ایبل خاتون ہوں گی۔"

"یہ ایسی ہی ہیں۔۔۔" ہمہ وقت نوک پلک سنوارے رہنے والی انیسہ کی جیٹھانی اور گھر کی سب سے بڑی بہو نے مزید فرمایا۔ "انھیں نہ اچھا کھانے پینے کا شوق ہے نہ پہننے اوڑھنے کا۔۔۔ بس لکھتی ہیں۔"

"میں تو خیر زیادہ شوقین نہیں ہوں ڈرامے دیکھنے کا مگر میں نے اپنے دیش میں اوروں سے سنا ہے کہ خوب لکھتی ہیں۔" مہمان نے کہا۔

☆☆☆

صبح سے دوپہر بلکہ سردیوں میں تو تقریباً سہ پہر تک کالج، گھر واپسی پر کھانا، کچھ دیر ستانا، لکھنا اور ساتھ ہی رات کے کھانے کی ابتدائی تیاری بھی پھر گیارہ، بارہ بجے تک امورِ خانہ داری میں مصروفیت، لکھنا اور بہ مشکل دو تین گھنٹے بلکہ کبھی، کبھی تو اور بھی کم وقت سونا۔۔۔ انیسہ بری طرح تھک رہی تھی۔ اس نے شبنم سے بات کی۔

"بہت تھک جاتی ہوں شبنم۔۔۔ لکھنے کے لیے بہ مشکل وقت ملتا ہے۔۔۔ رات کے کام کے لیے کوئی نوکر رکھ لیں۔۔۔

''ممی سے پوچھو.....'' اس گھر میں ممی کے حکم کا سکہ ہی سکہ رائج الوقت تھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے آپ پوچھیں۔''

''پوچھ لوں گا۔''

''پہلے ہی کچھ کم اخراجات ہیں ملازموں کے..... ذرا حساب تو لگاؤ مجموعاً کتنی تنخواہ جاتی ہے ہمارے گھر کے نوکروں کو.....'' عفت جمیل تیوری چڑھا کر بولیں۔

''پے منٹ ایسہ خود کرے گی اسے.....''

''کل تمہارے بڑے بھائیوں کی بیویاں کہیں گی ہماری جگہ بھی نوکر رکھ لیں۔''

''ایسہ تو خود پے منٹ کرے گی۔''

''بھائیوں کو قلاش سمجھتے ہو تم..... وہ تو ایک کے بجائے دو، دو نوکر رکھ کر دے سکتے ہیں بیویوں کو۔''

''ایسہ کا مسئلہ ان سے مختلف ہے۔''

''کیا مختلف ہے؟''

''وہ جاب کرتی ہے ممی.....''

''کمال نہیں کرتی..... ہم بھی جاب کرتے تھے اب تک کر رہے ہیں..... پانچ بچے بھی پال لیے..... ساس، سسر کی خدمت بھی کی۔ تمہارے پاپا کو بھی کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ تمہاری پھوپوں اور چچاؤں کو بیاہا— گھر کی بڑی بہو ہونا آسان نہیں تھا اور برسوں تک گھر میں کوئی نوکر بھی نہیں تھا۔''

''ممی وہ لکھتی بھی ہے۔''

''اپنے شوق سے..... تمہیں یا گھر میں کسی اور کو کوئی فائدہ ہے لکھنے سے۔''

''مگر آپ نے اس کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ وہ ایک مشہور رائٹر ہے۔''

''لیکن اب تمہاری بیوی اور اس گھر کی بہو پہلے..... اسے اس گھر کے طور طریقوں کا پابند رہنا چاہیے۔ اس کے حصے کا کام کسی ملازم کے ذمے لگا کر میں اپنی باقی دو بہوؤں کو اپنے جانبدار ہونے کا گلہ نہیں دوں گی۔''

حشیم چپ ہو رہا۔ ماں کے سامنے اس کے کوئی حیل و حجت اثر پزیری نہ دکھا سکی۔

'' ساری عورتوں کا نصیب ایک جیسا ہوتا ہے..... خدا بخشے تمہاری دادی تم دونوں بہنوں کی دفعہ خود پلنگ پر بیٹھی مجھے آخری دن تک کام کرتے دیکھتی رہیں۔ کہتی تھیں یہ وقت ہم پر بھی گزرا ہے، نخرے کسے دکھانا۔''

اماں نے یہ قصہ سنا تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

''اماں بعض عورتیں تو صرف نخرے ہی دکھانے کو ہوتی ہیں، عیش کرتی ہیں، ہماری پرنسپل کے میاں گاڑی سے اتر کر ان کے لیے دروازہ کھولتے ہیں۔''

''اپنے، اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔'' اماں اپنے سابقہ بیان سے انحراف کر گئیں۔

''اپنے، اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے تو پھر آپ یہ کیوں کہتی ہیں کہ ساری عورتوں کا نصیب ایک جیسا ہوتا ہے۔'' ایسہ معترض ہوئی۔

''دن ایک جیسے نہیں رہتے۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں..... تھوڑا سا صبر کر لو..... تمہاری ساس کو سمجھ آ جائے گی۔'' اماں نے اسے دلاسا دیا۔

''وہ گھر میں بھی افسروں والا رویہ رکھتی ہیں اماں.....''

''بیٹا افسروں والا رویہ رکھیں یا نوکروں والا گزارہ تو تمہیں اب اسی گھر میں کرنا ہے ناں میری چندا۔'' اماں نے ایک سمجھدار ماں ہونے کا ثبوت دیا۔

''میں تھک جاتی ہوں اماں..... بہت زیادہ.....'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''لکھنا کم کر دو.....'' اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے چمکارا اور بولیں۔

''نہیں کر سکتی.....''

''کیوں نہیں کر سکتیں؟''

''جس کھڑکی سے مجھے تازہ ہوا ملتی ہو اسے کیسے بند کر سکتی ہوں اماں.....''

''تو پھر حوصلہ پکڑو.....''

اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حوصلہ پکڑے بنا کوئی اور چارہ ہی نہیں تھا۔

دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ